دروسِ قرآن

(سورة العصر تا سورة الناس)

(۲)

خرم مرادؒ

ترتیب

قرآن مجید کے آخر میں جو سورتیں ترتیب کے ساتھ جمع کردی گئیں ہیں، وہ مختصر اور جامع ہیں۔ انھیں آسانی سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ اور عام طور پر نمازوں میں ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر مختصر ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں بیان کے گئے مضامین بھی مختصر ہیں۔ سورہ خواہ مختصر ہو یا طویل، اپنے اندر انتہائی جامع مضامین سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ جس طرح لمبی بات کو یاد رکھنا، پڑھنا، بار بار دہرانا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح دین کی بنیادی تعلیمات کو یاد رکھنے، بار بار پڑھنے اور ذہن نشین کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مختصر ہوں۔ چناں چہ دین کی بنیادی تعلیمات کو بغیر کسی تفصیل کے ان سورتوں میں اختصار سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ سورتیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

دل کی زندگی ہو یا اُمت کی زندگی، قرآن مجید سے وابستہ ہے۔ صرف وہی صحیح راستہ بتاتا ہے، نور بخشتا ہے، شفا عطا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی ہمارے لیے دنیا میں ترقی و سربلندی کا کوئی نسخۂ کیمیا ہے تو قرآن ہے، آخرت میں نجات کی کوئی سبیل ہے تو قرآن میں ہے۔ آج بھی مسلمان پر قرآن کا وہی حق ہے، جو چودہ سو سال پہلے تھا۔ اسے سنیں اور سنائیں، سمجھیں اور سمجھائیں، عمل کریں اور عمل کی طرف بلائیں، اس کو غالب کرنے کے لیے جہاد کریں۔ آج بھی قرآن ان کو وہی کچھ عطا کرے گا، جو چودہ سو سال پیش تر کیا تھا: دلوں کی نرمی اور گداز، آنکھوں میں نمی اور بصیرت، علم و حکمت کے گوہر تاب دار، زندگی بسر کرنے کا سیدھا، آسان اور روشن راستہ، زمین میں علو و خلافت اور آخرت میں مغفرت اور جنت۔

مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ میرے پاس نہ وہ علم ہے نہ تقویٰ اور نہ عمل بالقرآن، کہ میں درس قرآن کا منصب سنبھالنے کی جسارت کروں، نہ یہ کہ جو کچھ کبھی کہا ہے، اسے کتابی صورت میں شائع بھی کروں۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ میرے اوپر فرض ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی نعمت جتنی بھی عطا کی ہے، میں اسے سناؤں، بیان کروں اور اس کی طرف بلاؤں۔ اس لیے کہ جس نے کتاب دی ہے، اس نے یہ عہد بھی لیا ہے کہ تم اسے بیان بھی کرو گے اور جو اس عہد کو وفا نہ کریں اور اس کتاب کو چھپا کر بیٹھ جائیں، انھیں اس نے اپنی، فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت کی وعید سنائی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا کہ بَلِّغُوْا

عَنِّیْ وَلَوْ کَانَ آیۃً۔ اللہ کے عہد کی وفا، اور اسی ارشادِ نبوی ﷺ کی تعمیل ہی میں یہ جرأت کرتا رہا ہوں کہ اپنے علم و دانست کی حد تک قرآن کا پیغام سناؤں۔ اسی کوشش کا نتیجہ یہ دروس ہیں جو پیش خدمت ہے۔

ان دروس میں آپ صرف و نحو کی گتھیاں نہیں پائیں گے، نہ شانِ نزول کی روایات، نہ فقہ و کلام کے مسائل و مباحث، نہ منطقی استدلال۔ ان کا مقصد صرف ابلاغِ پیغام اور تذکیر ہے، دلوں کی زندگی کا سامان اور دعوتِ عمل ہے۔ کم علمی اور کم مائیگی کے باوجود وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ پر یقین اس کی بنیاد ہے۔ دل کی صدا یہی ہے: فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِر۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے، میری کسی بات کو میرے خلاف حجت نہ بنائے۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ کے زمرے میں شامل ہونے سے مجھے بچائے۔ میرے لیے اصل حاصل قارئین کی داد و تحسین نہیں، بلکہ عنداللہ قبولیت ہے، جس کا ایک ذریعہ آپ کا عمل اور میرے لیے آپ کی دعا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ اگر آپ اس تحریر کو اپنے لیے نافع پائیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ میرا خاتمہ ایمان پر کرے اور مجھے اپنی مغفرت سے ڈھانپ لے۔

خرم مراد

سورۃ العصر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪﴿۳﴾

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے، جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

تشریح: تین آیات کی یہ سورہ اس لحاظ سے بڑی جامع اور اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں انسان کی فلاح اور نجات کا راستہ مختصراً مگر جامع انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ سورہ جامع اور مختصر بیان کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اس کے اندر جچے تلے الفاظ میں معنی کی ایک دنیا پنہاں ہے۔

والعصر کے لفظ سے ابتدا ہی میں زمانے کی قسم کھائی گئی ہے۔ زمانے کے لیے عربی زبان میں ایک سے زیادہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ عصر کا لفظ زمانے کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ لفظ نماز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ نماز شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے ادا کی جاتی ہے، جب کہ دن کا ایک بڑا حصہ گزر چکا ہو۔ اگر پورے دن کو زمانہ سمجھ لیا جائے تو پھر ''عصر'' کا لفظ گزرے ہوئے زمانے کی طرف اشارہ کرے گا اور انھی معنوں میں یہ عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔

عصر کے معنیٰ نچوڑنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے عرب ممالک میں بکنے والے

پھلوں کے رس کو ''عصر'' کہا جاتا ہے۔اس کے معانی ہوتے ہیں کہ یہ رس پھل کو نچوڑ کر حاصل کیا گیا ہے۔قرآن مجید میں بھی انگور سے شراب بنانے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت یوسفؑ سے جیل میں جب غلام سوال کرتا ہے تو وہ اپنے بارے میں بتاتا ہے:

اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ (یوسف:۳۶)

''میں نچوڑ نچوڑ کر شراب بناتا ہوں۔''

زمانہ تیزی کے ساتھ گزرتا ہے، اس لیے تیز آندھی کے لیے قرآن مجید میں اعصار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا عصر کے معانی اس زمانے کے ہیں جو گزر چکا ہو، اوراس کے ساتھ ہی تیزی سے گزرنے کا مفہوم بھی ظاہر ہوتا ہے۔

عصر کا لفظ انسانی تاریخ اور انسانی عمر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر ہم بحیثیت مجموعی انسان کے بارے میں سوچیں تو اس سے مراد انسان کی ابتدا سے لے کر تا حال گزرتا ہوا زمانہ ہوگا اور یہی انسانی تاریخ ہے۔ اگر کسی ایک فرد کو سامنے رکھ کر سوچیں تو اس کی تاریخ پیدائش سے لے کر جو گزر چکی ہے، موت تک، جو اختتام زندگی ہے، اس زمانے کو انسان کی عمر کہا جائے گا۔ گویا اجتماعی طور پر ''عصر'' کے معنی انسانی تاریخ کے ہوں گے اور انفرادی طور پر اس کے معنی ایک آدمی کے لیے مقررہ مدّت زندگی، یعنی اس کی عمر ہوگی۔

یہ قسم کیوں کھائی گئی ہے؟ جیسا کہ اس سے پہلے کئی بار یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ قسم اس لیے نہیں کھائی جاتی کہ اللہ تعالیٰ کسی کی عظمت کا اظہار کرنا چاہتا ہے، وہ تو خود عظیم ہے۔ اس سے بڑھ کر عظیم کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ قسم کسی چیز کو صحیح اور سچ ثابت کرنے کے لیے ثبوت اور دلیل کے طور پر کھائی جاتی ہے۔ ہر گواہ قسم کھا کر کسی واقعے یا کسی بات پر گواہی دیتا ہے کہ وہ صحیح ہے اور اس کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ قرآن مجید میں قسم دراصل کسی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ بعض جگہ جس بات کو ثابت کرنا ہوتا ہے، وہ قسم کے فوراً بعد ہی بیان ہو جاتی ہے۔ کہیں وہ بات کئی آیات کے بعد آتی ہے اور کہیں آگے بیان ہونے والا پورا مضمون اُس بات پر دلالت کرتا ہے، جس پر قسم اُٹھائی جاتی ہے اور کہیں اس کو حذف کر دیا جاتا ہے کہ سننے اور پڑھنے والا خود سے اس چیز کو سمجھ سکتا ہے کہ کس چیز کے بارے میں قسم کھائی جا رہی ہے۔ جہاں قسم کی وجہ کا

ذکر نہ کیا گیا ہو، وہاں ہر سمجھنے والے کو خود سمجھنا پڑتا ہے کہ یہاں کس بات پر قسم کھائی گئی ہے۔ یہاں پر اس سے اگلی ہی آیت میں یہ بات بیان کردی گئی ہے کہ زمانے کو کس چیز کے ثبوت یا گواہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ (العصر:۲)

''انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے۔''

فی الواقع یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان بڑے نقصان میں ہے۔ اس کے بعد اس سورۃ کا اگلا حصہ اس سے متعلق ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں میں چار صفات پائی جاتی ہوں اور ایک لحاظ سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تین صفات پائی جاتی ہوں اور تیسری صفت کے دو حصے ہیں، یعنی ایمان اور عمل صالح اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، دراصل وہی خسارے اور نقصان سے بچنے والے ہیں۔

تواصی کے معنیٰ ہیں، وصیت کرنا۔ یہ لفظ وصیت سے نکلا ہے اور وصیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی کسی چیز کے بارے میں ہدایت یا تاکید کرے، جیسا کہ آدمی مرتے وقت وصیت کرتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں وصیت کا حکم دینے، نصیحت کرنے، ہدایت دینے اور تاکید کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تواصی کے ایک معنیٰ ایک دوسرے کو باہم تاکید و تلقین کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ گویا جو لوگ ایمان لائیں، عمل صالح کریں اور ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی تواصی اور تلقین کریں، دراصل یہی وہ لوگ ہیں، جو خسارے، گھاٹے اور نقصان سے بچنے والے ہیں۔

خسر کا لفظ عربی زبان کے لحاظ سے اسم نکرہ ہے۔ یہ عام لفظ ہے۔ عام لفظ جہاں آتا ہے وہاں اس سے مراد کسی کی بڑائی' عظمت یا وصیت کا بیان ہوتا ہے۔ گویا زمانہ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان ایک بہت بڑے خسارے کا شکار ہے اور یہ خسارہ اور نقصان جتنا بڑا ہے، کوئی اس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ درحقیقت انسان ہر طرف سے اور ہر پہلو سے خسارے میں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح ثابت ہو اور اس کا زمانے سے کیا تعلق ہے کہ انسان ایک بڑے خسارے سے دوچار ہے، خواہ یہ زمانہ گزرا ہوا زمانہ ماضی ہو، یا تیزی سے گزرتا ہوا زمانہ حال ہو، یا آئندہ پیش آنے والا زمانہ مستقبل۔

خسارے یا نقصان کا لفظ اگر تجارت کے معنوں میں استعمال کیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ جو نفع پیش نظر ہے، وہ نہ ہو۔ اسی طرح اگر نفع نہ ہو بلکہ الٹا جیب سے دینا پڑ جائے، تو یہ بھی نقصان ہے۔ اگر جس اثاثے (Capital) یا سرمایے سے تجارت شروع کی گئی ہو، وہی ضائع ہو جائے تو یہ بہت بڑا خسارہ ہے اور اگر تجارت میں سارے کا سارا سرمایہ ہی ضائع ہو جائے، جو لگایا گیا ہو تو اس سے بڑا نقصان کوئی نہیں ہوسکتا۔ خسارے کا لفظ دراصل خسران کا ہم معنیٰ ہے، جسے قرآن مجید نے جگہ جگہ نقصان اور گھاٹے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں کامیابی، فلاح وفوز اور بہت سے الفاظ ہیں، جو قرآن مجید نے نقصان، خسران اور گھاٹے کے مقابلے میں استعمال کیے ہیں۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اصل سرمایہ کیا ہے؟ روپیہ پیسہ، مال ومتاع یا وقت؟ اگر غور کیا جائے تو انسان کا اصل سرمایہ وقت ہے۔ انسان دنیا میں جو کچھ بھی کمانا چاہے اس کے لیے وقت درکار ہے۔ وہ جو کچھ کماتا ہے، وقت سے کماتا ہے اور دنیا سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی وقت چاہیے۔ اگر وقت کی مہلت ختم ہو جائے تو پھر دنیا سے وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ لہٰذا دنیا سے فائدہ اٹھانے اور دنیا کمانے دونوں کے لیے اس کا اصل سرمایہ اس کا وقت ہی ہے۔ اگر اس کے پاس وقت نہ ہو، وہ مفلوج ہو جائے تو وہ کچھ نہیں کما سکتا اور اگر موت واقع ہو جائے تو مال و دولت کے خواہ کتنے ہی ڈھیر لگے ہوں، کتنا ہی سرمایہ جمع ہو، کتنے ہی وسائل میسر ہوں، چونکہ مہلت عمل ختم ہو چکی ہے، اس لیے یہ سب کچھ اس کے لیے بے کار ہے۔ یہ کوئی محض دینی یا مذہبی تصور ہی نہیں ہے، بلکہ جدید Management اور Business کی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے کہ اصل چیز روپیہ پیسہ نہیں، جس سے تجارت ہوتی ہے، بلکہ اصل سرمایہ وقت ہے۔ لکھنے والے تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ وہ سرمایہ ہے، جو ہر سرمایے سے مختلف ہے۔ روپیہ پیسہ آپ کہیں بھی اور کسی بھی لمحہ جمع کر سکتے ہیں، لیکن وقت کو کہیں جمع یا Deposit نہیں کیا جا سکتا۔ اگر روپیہ پیسہ نہ ہو تو قرض لیا جا سکتا ہے۔ لیکن وقت نہیں ہے تو اُسے کہیں سے بھی قرض نہیں لیا جا سکتا۔ اگر کسی کے پاس دولت ہے تو موجود رہے گی۔ جب کہ وقت ہر لمحہ تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکلا چلا جاتا ہے۔ صرف وہی لمحہ ضائع ہونے سے بچ سکتا ہے، جو بروقت اور صحیح طریقے پر استعمال میں آجائے۔

وقت جیسے قیمتی سرمایے کی قدر و قیمت کا احساس جدید کاروبار کرنے والوں کو بھی ہے اور دین و مذہب بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وقت، جو انسان کا اصل سرمایہ ہے، وہ اتنی تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے کہ آدمی ذرا سوچے تو حیرت ہوتی ہے۔ تاریخ ایک لمحہ پہلے کی ہو یا ہزار سال پہلے کی، وہ تاریخ ہے، قصہ ماضی ہے۔ اس لمحے کو دوبارہ استعمال نہیں کیا جا سکتا، جو گزر جائے۔ جو لمحات گزر جائیں وہ لوٹ کر نہیں آسکتے۔ وقت ایک ایسی دولت ہے، جو تیزی کے ساتھ ضائع ہو رہی ہے۔ چنانچہ زمانے کا اتنی تیزی کے ساتھ گزرنا خود اس بات کی علامت ہے کہ جب تک انسان اس سرمایے کو صحیح طرح استعمال نہ کرلے، اس وقت تک یہ نقصان میں جا رہا ہے۔ اس لیے کہ اگر سرمایہ ہی ضائع ہو رہا ہو، ہاتھ سے نکلا جا رہا ہو تو پھر وہ سودا یقیناً نقصان کا سودا ہے۔

اگر انسان اپنی زندگی کے قیمتی لمحات محض دنیا کمانے اور دنیا کی سہولتیں جمع کرنے میں صرف کردے، جن سے فائدہ اٹھانا اس کی زندگی تک محدود ہے تو محض دنیا کمانا بھی کوئی نفع کا سودا نہیں ہے۔ بلکہ یہ نقصان کا سودا ہے۔ اس لیے کہ زمانہ خود بڑا بے وفا ہے۔ ہر لمحہ جو آتا ہے پلک جھپکنے میں گزر جاتا ہے اور جیسے ہی آنکھ بند ہوتی ہے وہ سب کچھ چھن جاتا ہے، جس کے لیے انسان عمر بھر تگ و دو کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ جو باقی رہنے والی ہے۔ اس لیے بار بار اللہ تعالیٰ توجہ دلاتا ہے کہ دنیا کی زندگی تو متاعِ قلیل ہے:

مَاعِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَاللّٰهِ بَاقٍ ط (النحل:۹۶)

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے۔"

اگر ہم وقت کی اہمیت کو نہ جانیں اور صرف وقت کی کمائی کو لیں، جو روپے پیسے، بنک بیلنس، جایداد اور کارخانوں کی صورت میں موجود ہو تو یہ بھی کوئی نفع کا سودا نہیں ہے۔ اس لیے کہ جیسے ہی وقت ختم ہوگا، یہ زندگی ختم ہوگی اور یہ سب چیزیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ کم سے کم دنیا چھوڑ کر جانے والے اس شخص کے اختیار اور تصرف سے تو ضرور نکل جائیں گی۔ اب وہ شخص چیک بک پر دستخط نہیں کرسکتا، بہترین میز پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا، بیش قیمت لباس نہیں پہن سکتا اور اگر یہ

سب اسی وقت میں جمع کیا گیا ہے، زندگی کے قیمتی لمحات صرف اسی کام کی نذر ہوئے ہیں، اگر عمر بھر کی یہی کمائی ہے تو یہ کمائی خود وقت کے ساتھ ختم ہو رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے، گھٹ رہی ہے، لہٰذا یہ گھاٹے اور خسارے کا سودا ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ (الرحمٰن:۲۶)

"ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے۔"

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ (القصص:۸۸)

"ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔"

اس لحاظ سے بھی زمانہ اس بات پر گواہ ہے کہ آدمی التکاثر (زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی ہوس) میں وہ چیزیں جمع کرتا رہتا ہے، جو فنا ہونی والی ہیں۔ اس میں اپنی ساری قوتیں لگا دیتا ہے، اپنی عمر اور زمانے کا بڑا حصہ اسی کام میں کھپا دیتا ہے مگر جیسے ہی قبر کا گڑھا سامنے آتا ہے:

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○ (التکاثر:۲)

"یہاں تک کہ تم قبروں کے نزدیک پہنچ جاتے ہو۔"

تب یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کمائی ایسی نہیں ہے، جو بعد میں کام آنے والی ہو۔

اگر قوموں کا معاملہ لیا جائے تو تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بڑی بڑی تہذیبیں اور بڑے بڑے عالی شان محلات تعمیر کرنے والے لوگ بھی بالآخر ہلاکت وتباہی کا شکار ہوگئے، جن کے کھنڈر آثارِ قدیمہ کی صورت میں آج بھی موجود ہیں یا زمین کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور اللہ کی طرف سے کھلی نشانیاں اور مقامِ عبرت ہیں۔ عظیم الشان تہذیب وتمدن کی حامل، جن قوموں نے بڑی جدوجہد کی، جن کا اپنے زمانے میں ڈنکا بجتا تھا، جنھوں نے بڑی بڑی عالی شان عمارتیں تعمیر کیں، بڑے بڑے شہر بسائے، جنھوں نے انسانی عقل کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، بالآخر دنیا کے لیے وہ چیزیں اعجوبہ بن کر رہ گئیں۔ موہنجوڈورو، ہڑپا، وادی فرات، قاہرہ کہیں بھی آدمی جا کر دیکھ لے، یہ ٹھوس حقیقت سامنے آئے گی کہ جو کچھ بھی انہوں نے بنایا وہ بالآخر ختم ہو گیا اور وہ قومیں خود بھی مٹ کر رہ گئیں۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ○

قرآن مجید جو گزرے ہوئے زمانے اور تاریخ کے بارے میں مختلف حوالوں سے بار بار توجہ دلاتا ہے، غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس پر بار بار غور کرے اور اس سے سبق سیکھے۔

انسانی اعمال کا بدلہ اس زندگی میں نہیں مل سکتا، نیک آدمی بھی پریشانیوں میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ایک فرد مصائب کا شکار ہوسکتا ہے، موت کے گھاٹ اتر سکتا ہے، شہید ہوسکتا ہے، بیماریوں میں مبتلا ہوسکتا ہے، لیکن ایک قوم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ قومیں اپنے اعمال کی بدولت عروج وزوال کا شکار ہوتی ہیں۔ اگرچہ انہیں جسمانی امراض تو لاحق نہیں ہوتے لیکن اخلاقی خرابیوں اور بداعمالیوں کے باعث وہ اس طرح موت کا شکار ہوجاتی ہیں، فنا ہوجاتی ہیں، صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں اور نیست ونابود ہوکر رہ جاتی ہیں، جس طرح ایک انسان موت کا شکار ہوجاتا ہے۔ انسانی عمر کی طرح قوموں کی بھی عمر مقرر ہوتی ہے اور وہ بھی وقتِ مقررہ پر ہلاک ہوجاتی ہیں۔ ان کی بلند وبالا عمارات، قوت ودبدبہ، رعب داب، شان وشوکت، دولت وثروت اور وسائل کچھ کام نہیں آتے، اور یہ اپنے ظلم وستم اور اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے نتیجے میں بالآخر تباہ وبرباد ہوکر رہ جاتی ہیں اور خدا کی پکڑ اور گرفت میں آجاتی ہیں:

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ (العنکبوت:۴۰)

''آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔''

قوموں کو موت محض اس لیے نہیں آتی کہ وہ گناہ کرتی ہیں، بلکہ وہ کچھ اوصاف اور شرائط پر پورا نہیں اترتی ہیں۔ ایمان وعملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، جو قومیں ان اوصاف سے آراستہ نہ ہوں، وہ دنیا کے اندر تباہی وبربادی اور ہلاکت کا شکار ہوکر رہتی ہیں۔ اس کے بعد آگے چل کر اس سورۃ میں کچھ اور اسباب ہیں، جو بتائے گئے ہیں۔ ان میں ایک بات تو یہ ہے کہ اس سورۃ میں اہل ایمان کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ نقصان میں نہیں ہیں اور گھاٹے کا شکار نہیں ہیں۔ اس کے معانی یہ ہیں کہ ایمان لانے والوں پر، جو بھی لمحہ گزر رہا ہے، اگر موت بھی قریب آرہی ہے، تو وہ اس سے پریشان نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہر لمحہ وہ اپنے لیے وہ چیزیں کما رہے ہیں اور جمع کر رہے ہیں، جو ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ یہی لمحات، جو پلک جھپکتے میں گزر جاتے ہیں اور حال،

جو ماضی بن جاتا ہے انھیں وہ ایک ایسی زندگی میں بدل رہے ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہوگی:

خَالِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ط (النساء:۵۷)

''جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

وہ اپنے وقت کو بھی Cash کر رہے ہیں اور اپنی زندگی کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رہے ہیں۔ گویا ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا فریضہ ادا کرتے ہوئے، جو لمحہ بھی گزر رہا ہے، وہ ایک ایسی زندگی میں بدل رہا ہے، جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے، جو کمائی کی وہ اعمال بھی ایسی نعمتوں میں بدل جائیں گے، جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔ اس لیے اہل ایمان کے لیے اس میں بڑی تسلی ہے۔ ان کے لیے تشویش کا کوئی پہلو نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے لیے اطمینان، سکینت اور بشارت کا باعث ہے۔ اس کا ایک پہلو صبر کا بھی ہے۔ جس طرح وقت تیزی سے گزر رہا ہے، اسی طرح کسی پر اگر کوئی مصیبت بھی پڑے اور وہ اسے برداشت کرے اور اس پر صبر کرے تو وہ بھی بالآخر گزر ہی جائے گی۔ انسان پر مصیبت کے خواہ پہاڑ ٹوٹ جائیں لیکن وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہیں۔ مصیبت اور پریشانی کو بہرحال ختم ہونا ہے اور ایک روز گزر ہی جانا ہے۔

فرعون نے جب جادوگروں کو دھمکی دی تھی کہ تم موسیٰؑ کے رب پر ایمان لے آئے، تو اس کا نتیجہ ابھی تمھیں معلوم ہو جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں میں کٹوا دوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ اس پر جادوگروں نے جواب دیا تھا کہ بہرحال ہمیں پلٹنا تو اپنے رب ہی کی طرف ہے، تم جو فیصلہ چاہو کر دو۔ تمھارے فیصلے کی حد بس یہ دنیا کی زندگی تک ہی محدود ہے۔ (الاعراف: ۱۲۳-۱۲۵)

کوئی پھانسی پر چڑھا دے، جان سے مار دے، بہرحال موت کے بعد کسی کا حکم نہیں چلے گا۔ کسی بادشاہ یا کسی ظالم و جابر کا کوئی حکم موت کے بعد نہیں چل سکتا۔ کوئی مصیبت اللہ کی طرف سے آئے خواہ انسانوں کی طرف سے، جس طرح زمانہ تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے یہ بھی گزر جائے گی۔ مصیبت پر صبر سے بھی آدمی کو سہارا ملتا ہے۔ صبر دراصل قوت کا ایک ذریعہ ہے۔

والعصر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ایمان اور عمل صالح سے تواصی بالحق اور

تو اصی بالصبر کے راستے کی طرف ہدایت کی جارہی ہے۔ زمانہ تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے۔ لہٰذا اس راستے کو بڑی تیزی اور مستعدی کے ساتھ اختیار کرو۔ اس لیے کہ وقت جیسا قیمتی سرمایہ ہاتھ سے نکلا جارہا ہے اور جو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا، یہ سرمایہ اور اثاثہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس لیے وہ راستا، جس سے نقصان سے بچ سکو، جس سے یہ اثاثہ وسرمایہ کبھی فنا نہ ہو اور زوال کا شکار نہ ہو وہ جلد سے جلد اپناؤ۔ وقت کو اگر خرچ کرو تو اس سے وہ نفع کماؤ، جو ہمیشہ باقی رہنے والا اور سب سے بہتر ہو۔ اس کے لیے دیر نہ کرو۔ جس طرح زمانہ تمھارا انتظار نہیں کرتا، تم بھی زمانے کے ہر لمحے کو بہتر طریقے سے استعمال کرو۔

والعصر کی قسم اور گواہی میں، یہ وہ پہلو ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو تعلیم فرمائے ہیں اور جن کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کے بعد چار صفات کا بیان ہوا ہے: ایمان، عملِ صالح، حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین۔ فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ یا افراد، گروہ یا قومیں یا جماعتیں ان صفات کی حامل ہوں گی، صرف وہی نقصان، خسارے اور ناکامی سے بچ سکیں گی۔ یہاں اس بات کی نشان دہی نہیں کی گئی کہ وہ کس انعام کے مستحق ہوں گے۔ یہاں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ وہ کون سا انسان ہے، جو نقصان میں ہوگا۔ لیکن اس کا ذکر بھی اس سے پہلے آچکا ہے کہ جو تکاثر (زیادہ مال جمع کرنے کی ہوس) کی بیماری کے اندر مبتلا ہے، جس نے قبر تک کی زندگی کو ہی حاصل اور مقصود سمجھ لیا ہے اور اسی کی محبت میں وہ گرفتار ہے۔ اس کی ساری بھاگ دوڑ اسی لیے ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا جمع کر لے۔ حالانکہ وہ نہ ساتھ رہنے والی ہے، نہ ساتھ دینے والی اور نہ کسی کام آنے والی۔ یہی وہ لوگ ہیں، جن کے اعمال نامے ہلکے ہوں گے اور جن کا نیکیوں کا پلڑا تول میں ہلکا ہوگا:

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر: ۳)

''سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔''

یہ سب الفاظ ہمارے جانے پہچانے ہیں۔ ایمان کا لفظ بھی ہم بولتے اور جانتے ہیں اور عملِ صالح کا لفظ بھی۔ تو اصی ایک نیا لفظ ضرور ہے۔ اسی طرح حق اور صبر کے الفاظ سے

بھی ہم آشنا ہیں۔ البتہ اس کے کچھ پہلو ایسے ہیں جب تک ہم انھیں اچھی طرح دوبارہ نہ سمجھ لیں، اس سورۃ میں، جو عظیم الشان حقیقت بیان کی جارہی ہے، وہ پوری طرح ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔

ایمان کے معانی تو ہم جانتے ہیں کہ کسی چیز پر یقین کرنا۔ یہ بات کہ اللہ موجود ہے، اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہو؟ اس کے لیے اللہ نے ہدایت دی اور رسول بھیجا ہے۔ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ اس کی سچائی پر یقین اور اس بات کا یقین کہ موت کے بعد اللہ کے پاس جاکر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، اس کا نام ایمان ہے۔ ایمان محض زبانی اقرار کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایمان کے معنی تصدیق کرنے، کسی بات کو سچ ماننے یا کسی شخص کو سچا مان کر اس پر اعتماد اور بھروسا کرنے کے ہیں۔ یہ اچھی طرح جاننے کی ضرورت ہے کہ ایمان کی اصل بنیاد ایک شخص کی تصدیق اور اس پر اعتماد ہے۔ ہزار عقلی دلائل ہوں، ان سب کا توڑ بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر ایمان کے حق میں دلائل ہیں تو اس کی نفی میں بھی اتنے ہی دلائل ہیں۔

ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ مغرب کی نماز کے وضو کے لیے بیٹھے تھے، اذان ہورہی تھی، اذان ہوگئی اور نماز کا وقت گزرنے لگا مگر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے پانی کا ایک چھینٹا مارا اور کہا کہ کہہ دو میں نے ہر چیز کو محمد رسول اللہؐ پر اعتماد کر کے مان لیا۔ لوگوں نے بعد میں پوچھا کہ حضرت کیا واقعہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ امام رازیؒ کا آخری وقت تھا اور شیطان ان سے بحث کر رہا تھا۔ وہ جو دلیل بھی توحید کی اور آخرت کی دے رہے تھے، شیطان اس کا جواب دے رہا تھا۔ ان کا ایمان سخت خطرے میں تھا، تو میں نے ان سے کہا کہ تم یہ کہہ دو کہ میں محمد رسول اللہؐ پر ہر چیز کا اعتماد کر کے اور ان کی تصدیق کر کے ایمان لایا ہوں۔

غیب کا یقینی ثبوت تو خود غیب کی تعریف اور ایمان کی تعریف ہے۔ اگر میں کہوں کہ اس پر ایمان لائیں کہ سورج نکلا ہوا ہے، تو یہ بات بے معنی ہے۔ اس لیے کہ سورج تو نکلا ہوا ہے، آنکھوں سے نظر آرہا ہے اور اس میں انکار کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس لیے اس میں کوئی امتحان نہیں ہے۔ آپ مجبور ہیں اور مجبوری کا ماننا ایمان نہیں ہے۔ ایمان تو اپنی عقل اور ارادے سے

پہچان کر ماننا ہے۔ اس میں شک کی گنجایش ہمیشہ رہے گی، کوئی یقینی ثبوت نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ایمان میں تصدیق اور اعتماد اور حضورؐ کی ذات پر ایمان اور اعتماد لازمی ہے۔ اس کے بغیر ایمان مضبوط اور محکم نہیں ہوسکتا۔ ایمان کے مفہوم میں یہ سب معنی شامل ہیں۔

ایمان امن کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جب آدمی ایمان لے آتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو ایک طرح سے محفوظ کر لیتا ہے۔ ایمان کے معانی دراصل یہ ہیں کہ آدمی پورا کا پورا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور ہر چیز کو اس کے حوالے کر دیتا ہے، اس اعتماد اور بھروسے پر کہ وہ میرا رب ہے۔ یہ زندگی اور سب کچھ اسی کا عطا کیا ہوا ہے اور اسی سے اجر ملنے والا ہے۔ گویا ایمان کے معنیٰ اپنے آپ کو کلیتاً اپنے رب کے سپرد کر دینے کے ہیں۔

ایمان کے معنوں میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اہل ایمان سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ کو محبوب رکھتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرۃ:۱۶۵)

''جو لوگ ایمان لانے والے ہیں، وہ سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔''

چنانچہ ایمان محبت کا بھی تقاضا کرتا ہے اور اس بات کا بھی کہ جو کچھ بھی اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا ہے، وہ اللہ کے ہاتھ بیچ دے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (التوبہ:۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔''

گویا جو لوگ ایمان لانے والے ہیں وہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ یہاں ایمان مکمل معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان صرف عقیدے کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔ مقصود وہی ہو، رخ اسی کی طرف ہو، ہر چیز اسی کی ملکیت ہو اور ہر وقت اس کی پکار پر لبیک کے لیے تیار ہو۔

سب سے اہم چیز زندگی میں سوچ اور ساری تگ و دو کا قبلہ اور رخ ہے۔ اس بات کو

حضرت ابراہیمؑ نے یوں فرمایا:

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَ جۡهِیَ لِلَّـذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝ (الأنعام:۸۰)

’’میں نے تو یکسو ہوکر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کرلیا، جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔‘‘

گویا میں نے اپنے چہرے، اپنی شخصیت، اپنی زندگی اور اپنی ساری توجہات کا رخ اسی کی طرف کرلیا ہے، جو زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ حنیف کا مطلب یہ ہے کہ میں نے ہر طرف سے رخ پھیر کر صرف اسی کی طرف رخ کرلیا ہے، ہر مقصود اور قبلے کو چھوڑ کر صرف اسی کو مقصود اور قبلہ بنالیا ہے، جو زمین اور آسمان کو پیدا کرنے والا ہے۔ یہاں اس بات کی صراحت بھی کردی گئی ہے کہ میں یکسو ہونے میں کسی کو شریک نہیں کرتا یا یہ کہ کسی اور کی طرف رخ کروں، میری نگاہ بہک جائے یا قبلہ بدل جائے۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ زندگی کی ایک ہی جہت ہے، ایک ہی سمت (Direction) اور ایک ہی رخ ہے اور وہ یہ ہے کہ جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا، میں نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردیا:

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ۙ (الانعام:۱۶۲)

’’کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔‘‘

یہ ایمان کا مفہوم ہے۔ یہاں یہ انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایمان دراصل دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ نفس کی ایک حالت ہے۔ زبان سے اقرار اور عمل سے اس کی تصدیق کا نام ایمان ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دے، اسی پر بھروسا کرے، اس کے رسولوں کی تصدیق کرے اور ان کو سچ مان لے اور ایسا سچ مان لے کہ گویا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔

یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اہل ایمان اور مطلوبہ کیفیت ایمان برابر ہوجائیں، لیکن جتنا اس کے قریب پہنچ سکیں، اس کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ جس طرح آدمی دنیا کے اندر آگ میں ہاتھ

نہیں ڈال سکتا کہ جل جائے گا اس لیے کہ یہ اس کا مشاہدہ ہے، اسی طرح وہ تمام چیزیں، جن کے بارے میں اللہ کے رسولؐ اور قرآن نے یہ خبر دی ہے کہ ان کے ارتکاب سے آدمی دوزخ کی آگ میں جلے گا، ان سے وہ دور بھاگے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب ایمان کی مٹھاس، شیرینی اور حلاوت دل میں اتر جائے تو پھر اللہ اور اس کا رسولؐ سب سے بڑھ کر محبوب ہو جاتے ہیں اور اسلام قبول کرنے کے بعد کفر کی طرف جانا، اللہ کی نافرمانی کرنا، اس کے لیے ایسا ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس کا ہر قدم آگ کی طرف جا رہا ہو۔ ایمان کی یہ کیفیت، ایمان کی یہ حلاوت اور مٹھاس بیان نہیں کی جا سکتی، جس طرح مٹھاس آدمی کی زبان محسوس کرتی ہے لیکن کوئی اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ شیرینی یا مٹھاس کی کیفیت کسی فلسفے، منطق یا کیمسٹری کی زبان میں منتقل نہیں کی جا سکتی، لیکن مٹھاس، لذت اور ذائقے کو انسان محسوس کرتا ہے، محظوظ ہوتا ہے، لطف لیتا ہے اور بسا اوقات اس کے لیے دیوانہ ہو جاتا ہے۔

ایمان کی مٹھاس، لذت اور حلاوت یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ سب سے بڑھ کر محبوب ہو جائیں۔ انسانوں سے محبت ہو تو اللہ کے لیے اور اسلام کے بعد کفر کی طرف جانا اتنا ہی ناگوار اور ناپسندیدہ ہو، جیسے کہ آگ میں ڈال دیا گیا ہو۔ گویا کفر اور اللہ کی نافرمانی کا ہر قدم یوں محسوس ہو، جیسے آگ کی طرف لے جا رہا ہو۔ ان معنوں میں، جو افراد ایمان کے حامل ہیں وہ اللہ کو مطلوب ہیں۔ جس طرح ایک فرد کا اللہ پر ایمان ہوتا ہے، اسی طرح قوموں کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے جہاں بھی قوموں سے عظمت و سربلندی اور زمین و آسمان کی برکتوں کے وعدے کیے ہیں وہاں ایمان کی شرط لگائی ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف:۹۶)

''اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔''

گویا اگر بستی والے، قومیں، تہذیبیں، ایمان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں ایسی قومیں بھی موجود ہیں، جو ایمان نہیں رکھتی ہیں مگر ان کے اوپر بظاہر برکتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس کا جواب بھی آگے آئے گا۔ یہاں ایمان کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لایا جائے، آخرت پر ایمان لایا جائے، رسول پر ایمان لایا جائے اور پھر اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینا اور اسی کو اپنا مقصود و قبلہ بنانا اور ہر طرف سے کٹ کر، یکسو ہو کر اسی کی طرف رخ کر لینا ہے یہ ایمان کی پہلی شرط ہے۔ اس میں ہر شخص ایک ہی مقام پر نہیں ہو سکتا اور ایک ہی درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ بھی سمجھنا چاہیے یہ کوئی ایسا کمال کا مقام نہیں ہے، جو انسان کے بس میں نہیں ہے۔ ایمان کے تو بہت سارے مدارج ہیں اور ایمان کی کوئی ایک کیفیت نہیں ہوتی، بلکہ ایمان تو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ بعض اوقات ایمان بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جب آدمی ہدایت کا راستا پکڑتا ہے تو ہدایت میں بھی ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ دراصل یہ سمجھنا درست نہیں کہ ایمان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہے، یا انسان کے بس میں نہیں، اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ یہ کیفیت سب کو کمال درجے میں حاصل ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ آدمی کی جتنی بھی استطاعت ہو اور جتنا اس کے بس میں ہو، عملاً اس کو ایمان کے اس مقام پر ہونا چاہیے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر: ۳)

”اور نیک عمل کرتے رہے۔“

اس کا لفظی ترجمہ ہوگا: اور عمل کیے صالح۔ عمل کا لفظ دراصل ایسے کام کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو توجہ، ارادے اور محنت سے کرنا پڑتا ہے۔ ”فعل“ کا لفظ ان اعمال اور افعال کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو آدمی اپنے ارادے سے کرے، ان کے اندر محنت اور مشقت بھی لگے اور کچھ اپنی خواہشوں پر قابو بھی پانا پڑے اور قربانی بھی دینی پڑے۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے تو مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

اس لیے مزدوروں کے لیے عربی زبان میں عمال کا لفظ آتا ہے، جس کے معنی عمل کرنے والے کے ہیں۔ وزارتِ محنت کے لیے بھی وزارت العمل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس

لیے کہ محنت کے عمل میں اجر، مشقت اور ارادہ، سب چیزیں شامل ہیں۔ اس کے لیے مسئول (اجر، مزدوری) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

صالح کا لفظ بھی کوئی اجنبی لفظ نہیں ہے، بلکہ ہم صلح کا لفظ بولتے ہیں، صالحیت بولتے ہیں۔ صالح لفظ کے اندر ترقی اور نشوونما کی گنجایش ہے، جو آدمی کی فطرت سے مطابقت رکھتی ہو۔ وہ غذا صالح ہے، جس سے آدمی کی صحت برقرار رہے، اس کے جسم کو صحت اور توانائی نصیب ہو اور جس غذا سے صحت اور توانائی فراہم نہ ہو وہ فاسد غذا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح کا لفظ بڑا عام ہے۔ لہٰذا اس کے معنیٰ ہیں وہ اعمال، جن سے آدمی کو ظاہری یا باطنی طور پر، مادی یا اخلاقی ترقی اور نشوونما نصیب ہو اور جس سے اس کو زندگی ملے اور وہ ترقی کے انتہائی مدارج پر پہنچانے کا ذریعہ ہوں۔

ایمان اور عمل صالح کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ ان دونوں پر الگ الگ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے کی کیا حیثیت ہے؟ اس سلسلے میں ہمارے ہاں اہل علم کے درمیان ایک بحث پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ کیا عمل، ایمان کا حصہ ہے یا نہیں؟ گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن رہتا۔ ہے یا نہیں؟ یہ دراصل کلامی مسائل ہیں، جن پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ بات صاف اور واضح ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عمل ایمان کا حصہ نہیں ہے اور ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں ہے، بلکہ ایک ہی جگہ پر قائم رہتا ہے، ان کا مطلب وہ ایمان ہے، جس کی بنیاد پر ایک آدمی امت مسلمہ کے دائرے میں شامل ہوتا ہے گویا کہ یہ قانونی ایمان ہے۔ ظاہر ہے کہ قانونی ایمان نہ گھٹ سکتا ہے اور نہ بڑھ سکتا ہے۔ اگر کوئی ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو عدالت نہ یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ اب اس کا ایمان زیادہ ہو گیا ہے یا اب اس کا ایمان کم ہو گیا ہے اور نہ وہ کسی کا ایمان مسترد ہی کر سکتی ہے۔ الّا یہ کہ ظاہر میں کفر کا ارتکاب کرے۔ قانونی ایمان تو دراصل قول و قرار ہے۔ اللہ تعالیٰ محض قول و قرار کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو دلوں کے حال سے بھی واقف ہے:

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝ (العٰدیٰت:۱۰)

"اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اسے برآمد کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔"

اس لیے وہ، جس ایمان کا ذکر کرتا ہے یہ وہ ایمان ہے، جو اس کی نظر میں قابل قبول ہو۔ اس

صورت میں اس کا عمل اس کے ایمان کا لازمی ثبوت ہوتا ہے۔ ان دونوں کی مثال ایسی ہے، جیسے بیج اور درخت کی شاخیں ہوں اور پھر اس پر پھل پھول ہوں۔ احادیث میں بھی اس طرح کی مثالیں دی گئیں ہیں اور فرمایا گیا ہے کہ ایمان کے ۷۰ درجے ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت پھل پھول کی ہے، جنہوں نے جنت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ اس میں جن مختلف چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ کن اعمال کا نتیجہ ہیں؟ اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ چیزیں غیر ضروری ہیں۔ نہیں، بلکہ اس کی غرض یہ جاننا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں، جن کے بدلے میں یہ نعمتیں ملیں گی۔ دراصل ایمان کے نتیجے میں وہ نہریں ہیں، جو جنت کے اندر بہتی ہیں اور عمل صالح کے نتیجے میں وہ درخت، پھل اور میوے ہیں، جو کہ انسان کو نصیب ہوتے ہیں۔ دونوں کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ایمان کے ساتھ چونکہ عمل صالح کا مطالبہ ہے یہ دراصل ایمان ہی کی تفصیل و توضیح ہے اور ایمان کے دعوے کو سچا ثابت کرنا ہے۔ اس لیے کہ آدمی کے ایمان کا دعویٰ جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور سچا بھی۔ لوگ جھوٹے دعوے بھی کرتے رہے ہیں۔ قرآن نے خود بھی منافقین کے بارے میں اس کا ذکر فرمایا ہے کہ منافقین آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور سچی بات کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ جھوٹی بات نہیں کہتے تھے کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہاں، ہم بھی جانتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن منافقین جھوٹے ہیں۔ سچی بات زبان سے کہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو جھوٹا قرار دیتا ہے، اس لیے کہ ان کا عمل ان کے ایمان کے خلاف ہے۔

ایمان کی تعریف میں ارکان کا لفظ بھی آتا ہے۔ ارکان کے معنی اسلام کے ارکان بھی ہو سکتے ہیں اور جسم کے اعضا بھی۔ اس لیے کہ جسم کے اعضا سے، ہاتھ پاؤں اور کان سے اور اپنے اعمال سے، جس دعوے اور ایمان کی تصدیق ہو وہی دراصل عمل صالح ہے۔ اسی سے ایمان کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ اگر ایمان کے معنیٰ یقین کے اور اللہ کا ہو جانا، اللہ ہی کو اپنا مقصود بنانا، اللہ سے محبت کرنا اور اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر دینا اور اسی کے سپرد کر دینا ہے تو عمل صالح میں وہ ساری نیکیاں آجاتی ہیں، جو معروف معنوں میں نیکی شمار کی جاتی ہیں۔

عمل صالح بڑا جامع لفظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں نشوونما اور ترقی کے بہت سے امکانات رکھے ہیں۔ یہ امکانات سیاست میں، معیشت میں، خاندان میں، گھر میں،

مادی زندگی میں اور مختلف حوالوں سے پائے جاتے ہیں۔ صرف نماز، روزہ اور زکوٰۃ ہی عملِ صالح نہیں ہیں۔ ہر وہ کام، جس سے انسان کی زندگی میں بہتری ہو اور جو صلاحیتیں اللہ نے اس کو بخشی ہیں ان کے اندر نشوونما اور ترقی ہو اور اس کے امکانات پائے جاتے ہوں وہ عمل صالح کہلاتا ہے۔

عمل صالح ایک لحاظ سے ایمان کی تفسیر ہے۔ اس لیے کہ صرف زبان سے ایمان کا اقرار اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ یہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ایمان اگر سچا ہے تو پھر اس کے ساتھ ایمان کے مطابق عمل بھی ہوگا۔ لہٰذا عمل صالح ایمان کی ہی تفسیر ہے۔ دونوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بیج اور درخت۔ جب بیج زمین میں ڈالا جائے گا، تو کونپل پھوٹے گی اور شاخیں نکلیں گی اور ان کے اندر پھل پھول پیدا ہوں گے۔

عمل صالح کی مثال قرآن اور حدیث میں درخت سے دی گئی ہے۔ کلمہ طیبہ کی مثال اللہ تعالیٰ نے شجر طیبہ سے دی ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِىٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ

(ابراہیم: ۲۴،۲۵)

"اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں، ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔"

اس کے بعد مزید دو صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے:

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر: ۳)

"اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

اب تک تو انسان کا بحیثیت فرد ذکر آ رہا تھا، وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے۔ اس لیے کہ ایمان لانا ہر ایک آدمی کا اپنا ذاتی فعل ہے۔ اسی طرح عمل صالح بھی ہر آدمی کا ذاتی فعل ہے۔ اب اس کے بعد سارے انسانوں کا آپس میں جو تعلق ہے، اس حوالے سے دو چیزوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ حق اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت کریں۔

وصیت تو ہم ان معنوں میں جانتے ہیں کہ مرتے ہوئے انسان کرتا ہے اور وصیت کے اندر تاکید بھی ہوتی ہے اور شدت بھی اور اہتمام بھی۔ لہٰذا وصیت کے معنی تاکید کے ساتھ ایک دوسرے کو نصیحت کرنا ہے۔ تَوَاصِیٗ کا لفظ عربی زبان میں باہم ایک دوسرے کو وصیت کرنے کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اس سے مراد محض ایک دوسرے کو نصیحت کرنا نہیں ہے بلکہ سب کو اس میں شریک کرنا ہے۔

وصیت کے لیے یہاں پر دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک حق کی وصیت اور دوسرے صبر کی تلقین۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق کے کیا معنی ہیں؟ اردو زبان میں حق کا لفظ ہم کئی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، وہ ایسی حقیقت ہے، جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اسے عقل بھی مانتی ہے اور فطرت بھی اور کائنات بھی اس کے اوپر گواہ ہے، لہٰذا وہی حق ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب کفر ہے۔ اسی طرح کسی بات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سچی بات ہے، یا حق بات ہے، یا ہم کہتے ہیں کہ اس پر ہمارا حق ہے یا اس کا ہمارے اوپر حق ہے۔ حق دراصل اس بات کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو سچی ہو اور واقعی ہو۔ اس سے انکار کی کوئی گنجایش نہ ہو، جو ثابت اور مسلمہ ہو اور اسے عقل بھی تسلیم کرتی ہو اور دل بھی۔ قرآن مجید میں بھی بہت کثرت کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ خاندانی زندگی میں، باہمی تعلقات میں، غرباء اور مساکین کا بھی حق ہے۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (ذٰریٰت:۱۹)

''اور ان کے مال میں حق ہے، ان کا جو مانگنے والے ہیں اور جو کہ محروم ہیں۔''

صبر کے اصل معنیٰ کسی چیز کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لینے، کسی چیز کے اوپر اپنے آپ کو روک لینے اور کسی چیز کے اوپر اپنے آپ کو جما دینے اور جمے رہنے کے ہیں۔

صبر کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ اگر آدمی پر کوئی مصیبت آن پڑے تو وہ برداشت کرے اور آنسو نہ بہائے۔ یہ تو اس کا ایک پہلو ہے۔ اصل میں صبر کے لیے بڑے عزم، بڑے حوصلے اور بڑی استقامت اور شجاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس چیز کو بھی آدمی صحیح سمجھتا ہو اس کے اوپر وہ جم جائے اور پھر جو بھی رکاوٹیں اور مشکلات پیش آئیں، جو بھی مصائب ہوں، اندر سے نفس کی ترغیب و تحریص یا لالچ ہو، اس کے مقابلے میں وہ جما رہے اور باہر سے بھی اگر لوگ

بہکائیں، طرح طرح کی باتیں کریں، وہ اس پر عزم مصمم کے ساتھ استقامت دکھائے۔ قرآن مجید میں صبر کے اس مفہوم کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ (طٰہٰ: ۱۳۰)

"جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو۔"

اگر لوگ وسوسے پیدا کریں اور کہیں کہ تم نے نیکی کی راہ اپنائی تو نقصان اٹھاؤ گے، یہ سودا چھوڑ دیا تو پھر عمر بھر پچھتاؤ گے، اس قسم کی باتوں پر بھی آدمی صبر کرے اور حق پر قائم رہنے میں، جو بھی مصیبتیں آئیں، ان کو برداشت کرے، یہ بھی صبر ہے۔ اس لحاظ سے جب حق کا لفظ یہاں استعمال ہوا تو یہ اُن ساری چیزوں پر حاوی ہے، جو حق کی تعریف میں آتی ہیں۔ اگر اس پر غور کیا جائے، تو حق اور صبر، حق کے اوپر ثابت قدم رہنا، یہ بھی عمل صالح کے اندر شامل ہے۔ اس لیے کہ عمل صالح کی تعریف کی رُو سے اس میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے اور اس کے اندر ساری بھلائیاں اور ساری نیکیاں موجود ہیں۔ پھر جو الگ سے ذکر کیا کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے ہیں، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ میں سے صرف دو نیکیوں کو منتخب کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے جن کی باہمی تعلقات میں بہتری اور ان کی حفاظت کے لیے تاکید کے ساتھ نصیحت اور وصیت کی ضرورت ہے۔

جس طرح عمل صالح ایمان کی شاخ ہے، اسی طرح دوسروں کو حق اور صبر کی نصیحت اور وصیت کرنا یہ بھی عمل صالح کا ایک حصہ ہے۔ ایک دوسرے کو وصیت کرنے میں یہ بات بھی صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرے اور انسانوں سے الگ تھلگ رہ کر ایمان اور عمل صالح اور نجات کا کوئی راستا نہیں ہے۔ نجات کا راستا دوسروں کے ساتھ مل کر دوسروں کو نیکی کی راہ پر چلانے میں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی بس اپنے کام سے غرض رکھے، خود ہی ایمان کے راستے پر چلے اور نیک عمل کرلے اور یہ اس کی نجات کے لیے کافی ہے تو یہ سورہ اس کی بہت کھول کر اور واضح طور پر تردید کرتی ہے۔ لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہر انسان نقصان میں ہے، سوائے اس کے جس کے اندر یہ چا صفات پائی جائیں، یا یوں کہہ لیں کہ یہ تین صفات پائی جائیں۔ تیسری صفت کے دو حصے ہیں، ایک یہ کہ آدمی خود ایمان اور عمل صالح پر قائم رہے اور دوسرا حصہ یہ ہے کہ دوسروں کو حق اور صبر کی، دونوں کی تاکید اور وصیت کرے۔ گویا الگ تھلگ

رہنے کی ایمان اور عمل صالح میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر غور کریں تو اسی چیز سے پھر معاشرہ اور سیاست اور معیشت اور خاندانی زندگی، سب کے احکام اس کے اندر شامل کر دیے گئے ہیں۔ ایک اسلامی ریاست کا سب سے بڑا فرض بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (الحج:۴۱)

”اگر ہم زمین میں ان کو قوت اور اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ کی ادائی کا اہتمام کرتے ہیں (ریاست اور حکومت کے ذریعے) معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

یہ ایک اسلامی حکومت کے بنیادی فرائض ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بنو امیہ کے خلیفہ تھے اور خلیفہ راشد شمار ہوتے ہیں۔ جب انھوں نے خلافت کی مسند سنبھالی تو وہ پوری طرح حق پر قائم نہیں تھی۔ اس زمانے میں ایک رواج یہ ہو گیا تھا کہ ذمیوں میں سے، جو مسلمان نہیں ہوتے تھے، ان کو اس ڈر کے مارے وہ مسلمان نہیں کرتے تھے کہ ان کا ٹیکس، جو کہ جزیے کی صورت میں ملتا تھا بند ہو جائے گا اور بیت المال میں کمی آجائے گی۔ اس پر اُنھوں نے گورنر کو لکھا کہ تم یہ طریقہ ترک کر دو۔ گورنر نے کہا کہ میں نے یہ طریقہ ترک کر دیا تو خزانہ خالی ہو جائے گا۔ اس پر اُنھوں نے فرمایا کہ محمد رسول اللہؐ ٹیکس کلکٹر بنا کر نہیں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے اور اگر بیت المال خالی ہو جائے تو اس میں جھاڑو دے کر تالا لگا دو۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ ان کے دور میں بیت المال میں حق اور انصاف کے ساتھ جتنی آمدنی ہوئی وہ ظلم و جبر کے دور میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ اسلام کا حکومت کے بارے میں نقطۂ نظر ہے۔ خاندانی زندگی کے بارے میں بھی یہی تعلیمات ہیں:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:۶)

”اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ“

یعنی ان کو نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ اولاد کی تربیت ہو یا نیکی اور تقوے کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ باہم تعاون، وہ اصول ہے، جس پر پورا معاشرہ قائم ہے۔ اس طرح ایک ایسی امت وجود میں آتی ہے، جو دراصل اسی لیے بنائی گئی ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو حق اور صبر کی

وصیت اور تاکید کریں، یہی اس کا تشخص ہے۔ اسی پیرائے کا دوسرا نام ہے امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ اسی لیے فرمایا گیا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران:۱۱۰)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اس آیت میں ایمان کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرے، جس طرح اس سورۃ میں ہے۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرنے کے لیے بھی ایمان ضروری اور لازمی ہے۔ قرآن مجید میں ایمان کا ذکر کہیں پہلے آتا ہے اور کہیں بعد میں لیکن ایمان کے ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ تم بہترین امت ہو، جس کو اللہ نے انسانوں کے لیے برپا کیا ہے۔ تاکہ معروف قائم ہو اور منکر مٹے۔ معروف اور منکر کے لفظ بھی حق سے نکلتے ہیں۔ دراصل امت کا تشخص ہی یہ ہے کہ دنیا میں معروف پھیلے اور منکرات مٹیں۔ یہ اتنی اہم بات ہے کہ اگر پوری امت یہ فریضہ انجام دے سکے تو فرمایا کہ پوری امت میں ایک گروہ تو ہمیشہ ہی ایسا ضرور ہونا چاہیے، جو یہ فریضہ انجام دے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران:۱۰۴)

''تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہیں، جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔''

جہاں لوگ نیکی کے معاملے میں خود غرض ہوں کہ بس ہم نے نیکی کر لی ہے اور یہ کافی ہے، زمانہ اس پر گواہ ہے کہ یہ نجات کے لیے کافی نہیں ہے اور ایسا آدمی نقصان میں رہے گا۔ اس لیے کہ معاشرے کی کشتی جب ڈوبے گی، تو اس میں سب ڈوبیں گے۔ حضورؐ نے ایک دو منزلہ کشتی کی مثال دی ہے، جس میں کچھ آدمی اوپر سوار ہوتے ہیں اور کچھ نیچے۔ جب اوپر والے نیچے والوں کو پانی لینے کے لیے اوپر آنے سے منع کرتے ہیں تو پھر وہ نیچے سے ہی پانی لینے کے لیے کشتی کے اندر سے چھید کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اوپر والوں نے نیچے

والوں کا ہاتھ نہ روکا تو پھر وہ کشتی ہی ڈوب جائے گی۔ اوپر والوں سمیت سب ڈوب جائیں گے۔

یہاں یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جانی چاہیے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خود نیک بن کر معاشرے کو بچالیں گے وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس طرح نہ تو کوئی معاشرہ بچ سکتا ہے اور نہ کوئی قوم۔

یہ مختصر سورۃ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ امت مسلمہ کی زندگی، اس کا تشخص اور مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ نیکی کی علم بردار ہو، لوگ ایک دوسرے کو نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں اور نیکی کی راہ پر چلنے میں، جو مشکلات پیش آئیں، ان کے مقابلے میں صبر واستقامت دکھانے کی نصیحت اور تلقین کریں۔

یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ آدمی دوسروں کو ایمان اور عمل صالح کی تلقین کرے اور حق کی وصیت کرے لیکن خود اس پر عمل نہ کرے، خود حق پر نہ جمے اور نہ صبر کا طریقہ اختیار کرے۔ دوسروں کو وصیت کرنے کے یہ معنیٰ نہیں ہیں۔ یہ بات نا قابل تصور ہے کہ انسان دوسروں کو تو نصیحت کرتا پھرے اور خود کو بھول جائے۔ چنانچہ اس کے اندر یہ بات بھی خود بخود شامل ہوگئی کہ وہ لوگ جو حق کی تلقین اور صبر کی نصیحت کرنے والے ہیں، خود بھی حق کے اوپر جمے رہیں اور دوسروں کو بھی حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ اگر حق وہ چیز ہے، جو عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور دل بھی تسلیم کرتا ہے تو لازماً اس سے آدمی کو محبت بھی ہونی چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ (البقرۃ:۱۶۵)

"جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں، وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔"

جس سے آدمی کو محبت ہوتی ہے، آدمی چاہتا ہے کہ سب اس سے محبت کریں۔ اس لیے پھر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ جو حق کے ساتھ محبت کرے، حق کے اوپر خود قائم ہو، دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ حق کا یہ تقاضا ہے کہ آدمی کی عقل اس کے آگے جھک جائے، دل اس سے محبت کرے اور آدمی اس کے اوپر ایمان لے کر آئے اور اپنا عمل اس کے مطابق کرلے۔

حق اور صبر کا باہم گہرا تعلق ہے۔ حق پر قائم رہنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی کے اندر صبر کی صفت نہ ہو۔ صبر کے معنیٰ دراصل یہ ہیں کہ آدمی اپنے مقام پر جم جائے۔ اسی بات کو تھوڑے سے الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ سورۂ بلد کے اندر اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (البلد:۱۷)

"جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی۔"

اس سے پہلے یتیم اور مسکین کا بھی ذکر ہے اور کھانا کھلانے کا بھی ذکر ہے۔

حق کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ لوگ جو غریب، مسکین اور یتیم ہیں، ان کا حق ہر انسان کے اوپر عائد ہوتا ہے۔ لہٰذا آدمی ان کے ساتھ رحمت، نرمی اور شفقت کا برتاؤ خود بھی کرے اور حق کی وصیت کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کو انسانوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی جائے۔ شفقت اور رحمت اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ صبر کی صفت موجود نہ ہو۔ رحمت، نرمی اور شفقت کا برتاؤ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ اسی صورت میں کر سکتا ہے کہ جب اس کے اندر اتنا حوصلہ ہو کہ لوگوں سے تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کر سکے اور ان کو معاف کر سکے اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ کر سکے۔

وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (شوریٰ:۴۳)

"جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے یہاں معاف کرنے اور صبر کرنے، دونوں کا، ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے اور جہاں بھی انسانوں کو ایک دوسرے کو معاف کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں صبر کا ذکر ضرور کیا ہے۔ اس لیے کہ اگر آدمی صبر نہ کرے، غصے پر قابو نہ پائے، ضبطِ نفس نہ ہو، طبیعت میں اشتعال پیدا ہو، غصہ پیدا ہو اور آدمی اس پر قابو نہ پا سکے، تو اس وقت تک رحمت کی صفت پیدا نہیں ہو سکتی۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ محبت سے پیش آنا، ان کا حق ادا کرنا، کوئی غریب یا یتیم ہو، اس کو کھلانا پلانا، اس کو امداد پہنچانا، یہ سب کام بغیر صبر کے نہیں ہو سکتے۔

اگر حق کے محدود معنی لیے جائیں، جس میں انسانوں کا حق ہے تو اس کے لیے بھی صبر لازمی ہے اور اگر حق کو وسیع معنوں میں لیا جائے، جس میں اللہ تعالیٰ پر ایمان تک شامل ہے، تو اس کے لیے بھی صبر لازم ہے۔ اللہ کا حق انسان کے اوپر یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ حدیث میں آتا ہے رسول اللہؐ نے صحابہؓ کا جو طریقہ تھا کہ سوال کا جواب خود نہیں دیا کرتے تھے بلکہ حضورؐ سے پوچھتے تھے کہ آپؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ وہ کسی کو بھی اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔ اللہ کی رضا پر راضی

رہنے اور جمے رہنے کے لیے بھی صبر کی ضرورت ہے۔

حق کے ساتھ، جو صفت جوڑ کھاتی ہے وہ عدل ہے۔ قرآن مجید کا خود سب سے بڑا حق یہ ہے کہ عدل کو قائم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کائنات کو عدل و انصاف پر چلا رہا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ ؕ (آل عمران:۱۸)

''وہ انصاف پر قائم ہے۔''

اس نے آسمان اور زمین کا ایک نظام قائم فرمایا ہے۔ آسمان کو اس نے بلند کیا اور کائنات کا پورا نظام بنایا اور اس میں ایک میزان آویزاں کر دی، ترازو لگا دی:

وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ (الرحمٰن:۷)

''آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔''

اس ترازو کا نتیجہ یہ ہے کہ چاند، سورج، ستارے، درخت، چرند پرند، غرض کوئی بھی مخلوق بال برابر اپنے راستے سے ہٹ نہیں سکتی۔ اپنے راستے سے ہٹنا اور دوسرے کے راستے پر جانا، یہی دراصل ظلم ہے اور انصاف کی خلاف ورزی ہے۔ دراصل حق، عدل و انصاف پر مبنی ہے اور شرک اسی لیے سب سے بڑا ظلم ہے کہ وہ حق کی خلاف ورزی ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان:۱۳)

''حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

اللہ کے حقوق کی ادائی، بندوں کے حقوق کی ادائی، اللہ پر ایمان اور وہ بھلائیاں، جو اللہ کو محبوب ہیں ان پر خود بھی عمل کرنا، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ تواصی، یعنی ایک دوسرے کو وصیت کرنا، تاکید کرنا اور اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ قائم کرنا اور پھر اس حق کے اوپر جم جانا، دراصل یہ وہ راستا ہے، جو انسان کو اس خسارے سے نکال سکتا ہے کہ جس کے اوپر زمانہ گواہ ہے۔

انسان کی عمر گزرتی چلی جا رہی ہے، تیزی کے ساتھ گزر رہی ہے اور یہ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کا اصل سرمایہ وقت، برابر پگھل رہا ہے، ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، ضائع جا رہا ہے۔ ایک لمحے کو بھی تھام کر رکھا نہیں جا سکتا، جس طرح روپے پیسے کو جمع کیا جا سکتا ہے اور وہ ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ ایک ایک لمحہ، جو انسان کے ہاتھ سے نکلا چلا جا رہا ہے، وہی اس کا حقیقی سرمایہ ہے۔ اس

وقت کو اگر کوئی چیز مستقل، ابدی اور دائمی بنا سکتی ہے تو وہ ایمان اور عمل صالح اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کے اوپر قائم رہنے کی تاکید کرنا اور وصیت کرنا ہے۔

اسی طرح قوموں، تہذیبوں اور معاشروں کے لیے اگر کوئی راستا دنیا کے اندر ترقی اور عروج کا ہے، تو وہ راستا بھی ایمان اور عمل صالح اور تواصی بالحق کا ہی ہے۔ جس درجے میں تھوڑا سا ایمان بھی کسی معاشرے کو حاصل ہوگا، وہ معاشرہ ترقی کرے گا۔ جہاں پر اچھے اعمال کو اچھا سمجھا جائے گا اور برے اعمال کو برا سمجھا جائے گا، وہاں یہ احساس خواہ کتنی ہی تھوڑی مقدار میں ہو، وہ معاشرہ ترقی کرے گا۔ جہاں برائی ہوگی اور برائی کو برائی سمجھا جائے گا اور اس سے روکا جائے گا، حکمراں برائی کریں گے تو ان کو بھی روکا جائے گا، ماتحت برائی کریں گے تو ان کو بھی روکا جائے گا، ان کے منصب سے ہٹا دیا جائے گا خواہ وہ حکمران وقت ہو یا کوئی ماتحت، تو وہاں پر ترقی اور عروج ہوگا۔ اس کے لیے مسلم اور غیر مسلم معاشرے کی کوئی قید نہیں ہے مغرب کے غلبے کی ایک وجہ یہ پہلو بھی ہے۔

ایمان کے ایک معنیٰ تو ایمان باللہ کے ہیں اور ایک معنیٰ یہ ہیں کہ جس بات کو صحیح سمجھا جائے، اس کے اوپر جم جایا جائے۔ جب آدمی کسی بات کو صحیح سمجھتا ہو، پھر بھی وہ نہ کرے اور جس بات کو غلط کہتا ہو وہی کرتا رہے، تو یہ تباہی اور خسارے کا راستا ہے۔ اگر معاشرے کے اندر لوگ رشوت کھائیں، بد دیانتی کریں، لوگوں کا حق ماریں، یتیموں کے ساتھ ظلم کریں، عورتوں کو ننگا نچائیں اور جو چاہیں کریں لیکن کسی کو توفیق نہ ہو کہ ان کو نصیحت کرے اور اس کو روکنے کا اہتمام کرے، حکومت بھی غافل ہو، عوام بھی غافل ہوں، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ معاشرہ ترقی اور فلاح کی راہ نہیں پڑ سکتا اور نہ دنیاوی فلاح ہی اس کے حصے میں آئے گی۔ دنیا اور قوموں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہ قومیں، جن کے اندر بھلائیاں پروان چڑھیں وہ دنیا کے اندر آگے آگئیں اور وہ قومیں، جن کے اندر برائیاں پروان چڑھیں، وہ پیچھے رہ گئیں اور بالآخر نیست و نابود ہوگئیں۔

زمانہ ایک فرد کے لیے انفرادی طور پر اور قوموں کے لیے تاریخی و اجتماعی طور پر بھی اس بات پر گواہ ہے کہ نجات اور ترقی کا اگر کوئی راستا ہے تو وہ ایمان اور عمل صالح اور پھر مل جل کر ایک دوسرے کو بھی، اسی راہ پر چلانے اور حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنے میں مضمر و پوشیدہ ہے۔

یہ تین آیات کی سورۃ اپنے اندر اتنے مضامین رکھتی ہے کہ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہی ایک سورۃ آدمی جانتا ہو اور اسی پر وہ غور و فکر اور عمل کرلے تو یہ اس کے لیے کافی ہے۔ دراصل قرآن مجید کی ساری تعلیمات بہت مختصر انداز میں اس سورۃ کے اندر جمع کردی گئی ہیں۔ یہ تین آیات، جو ہم سب کو یاد ہیں اور ہم اس سورۃ کو بار بار پڑھتے ہیں، لیکن اس کے مطالب و معانی پر غور نہیں کرتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب بھی ہم اسے پڑھیں تو اپنی زندگی، جو گزرتی جارہی ہے اور قوم کی زندگی، جو ہمارے سامنے ہے، اس کے بارے میں اسی نسخے کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے اور ایمان اور عملِ صالح کی روش کو اپناتے ہوئے حق کی نصیحت اور صبر کے ساتھ راہِ خدا میں جم جایا جائے۔ درحقیقت یہی فلاح اور کامیابی کا واحد راستا ہے۔

سورۃ الہمزہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝١ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝٣ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝٤ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝٧ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝٨ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔

تشریح: سورۂ ہمزہ نو آیات پر مشتمل ایک مختصر سورۃ ہے۔ اس میں ایک اہم معاشرتی رویے اور اخلاقی مرض کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو مال و دولت کی حرص اور حبِ مال کی وجہ سے سر اٹھاتا ہے اور اس کے نتیجے میں تکبر، دوسروں کو حقیر جاننا، طعن و تشنیع جیسے رویے جڑ پکڑتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اس کے معاشرتی اثرات اور بالآخر انسان کس ہولناک انجام سے دوچار ہوگا اور

اس سے بچاؤ کی راہ کون سی ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ مختصر اور چھوٹے چھوٹے بول ہیں، لیکن ان کے اندر دین کی بنیادی تعلیمات اور اہم نکات کو بڑے دل نشیں انداز میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝ (الھمزۃ ۱:۱)

''تباہی ہے، ہر اس شخص کے لیے جو (موبہ مو) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔''

وَیل کے معنیٰ ہلاکت اور تباہی کے بھی ہیں اور مذمت اور برائی کے بھی۔ گویا وَیل کے لفظ سے ہلاکت اور تباہی کی خبر دی جارہی ہے اور اس کی مذمت بھی کی جارہی ہے۔ یہاں اس کی دو صفات بیان کی گئی ہیں: هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ یہ دو الفاظ ایک دوسرے سے معانی کے اندر بہت قریب ہیں۔ اتنے قریب کہ ایک ترجمہ کرنے والا ایک لفظ کے جو معنیٰ بیان کرتا ہے، دوسرا ترجمہ کرنے والا دوسرے لفظ کے وہی معنی بیان کرتا ہے۔ اس لیے ایک رائے یہ بھی ہے کہ دونوں دراصل تاکید کے لیے آئے ہیں اور دونوں کے معنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اصل لفظ ھمز اور لمز ہے۔ اس کے آگے جو چھوٹی ''ۃ'' لگی ہے، یہ مبالغے کے لیے ہے، جس طرح علام کے کے معنی بہت جاننے والے کے ہیں۔ جب اس سے لفظ علامہ بنایا جاتا ہے تو جاننے والے میں بھی مبالغہ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی برائی کرنا، ان کو طعنے دینا، اُن کا مذاق اڑانا اور ان کے منہ پر یا اُن کی غیر حاضری میں اُن کے عیب بیان کرنا، یہ ساری چیزیں ان دونوں لفظوں کے اندر شامل ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ہمزہ تو وہ ہے، جو سامنے برائی کو بیان کرے، طعنے دے، برا بھلا کہے، اور لمزہ وہ ہے، جو غیبت کی شکل میں ہو، جب انسان سامنے نہ ہو، اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرے۔ ھمزۃ کے معنی بعض علماء نے اشارہ بازی کرنے کے بھی لیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشاروں، کنایوں یا ادا سے، کسی کا مذاق اڑایا جائے یا کسی کی برائی کی جائے۔ لمزۃ وہ ہے، جو زبان کے بول سے کسی کا عیب یا برائی بیان کرے۔ اس میں اصل چیز کسی کی عیب چینی اور طعنہ زنی ہے اور اس کا اظہار خواہ، جس طریقے سے بھی ہو، الفاظ کے ذریعے ہو یا تحریر کے ذریعے، اداؤں کے ذریعے ہو یا اشاروں کے ذریعے یا صاف بات نہ کہی جائے بلکہ اشارہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر کسی کو کہا جائے بڑا سخی بنا پھرتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی الزام نہیں لگایا گیا ہے، لیکن اس میں طعنہ بھی ہے اور طنز بھی۔

قرآن مجید نے لمز کا لفظ انھی معنوں کے اندر استعمال کیا ہے۔ نبی کریمؐ، جو صدقات تقسیم کرتے تھے، منافقین اس کے بارے میں طعنے دیا کرتے تھے کہ آپؐ انصاف کے ساتھ تقسیم نہیں کرتے، اپنوں کو دیتے ہیں اور دوسروں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس پر فرمایا:

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ‌ۚ (التوبة:۵۸)

"اے نبیؐ، ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں۔"

اسی طرح جو لوگ صدقات لا کر دیتے تھے ان میں غریب مخلص مسلمان جو متقی تھے، اُن کے بارے بھی وہ لوگ طعنے دیا کرتے تھے۔ اس کے لیے بھی قرآن مجید نے لمز کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ وہ خرابی ہے، جس کی وجہ سے اپنے بارے میں استکبار اور بڑا زعم پایا جاتا ہے اور دوسروں کے لیے حقارت، جو کہ کبر کا لازمی حصہ ہے۔ دوسروں کو حقیر خیال کرنا اور اپنے کو بڑا سمجھنا، یہ کبر کی تعریف بھی ہے۔ یہاں ان دو اخلاقی امراض کی نشان دہی کی گئی ہے۔ لوگوں کو برا کہنے، ان کو طعنے دینے اور اُن کی غیبت کرنے کا مال و دولت سے بھی بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے آگے فرمایا:

الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ۙ‏ (الھمزة:۲)

"جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔"

جب دولت کسی کے پاس آتی ہے تو وہ دولت ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ وہ لوگ جن کے پاس دولت نہیں ہوتی، جو اس کے ہم رتبہ اور ہم حیثیت نہیں ہوتے، وہ ان کو اپنے سے کم تر اور حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ وہ دولت ہی کو زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے۔ پھر وہ دوسروں کی عزت نفس پر بھی ہاتھ ڈالنا شروع کرتا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

مال کے بارے میں تو قرآن مجید نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ مال فی نفسہٖ کوئی بری شے نہیں ہے۔ مال کا جمع کرنا، مال کا کمانا اور مال کو اپنے پاس رکھنا، یہ خود کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن مال ہی کو مطلوب و محبوب بنانا اور مال ہی کے پیچھے پوری زندگی لگا دینا، یہ خسارے کا سودا ہے، جو مال کو اس طرح جمع کرتا ہے وہ دراصل مال کا بندہ بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ ہلاک ہو جائیں اور برباد ہو جائیں۔ درحقیقت مال جمع کرنا کوئی خرابی نہیں ہے۔ مال تو بذاتِ خود ایک نعمت ہے۔ مال کے ذریعے ہی زندگی برقرار رہتی ہے اور مال خرچ کر کے ہی آدمی اللہ تعالیٰ کی رَضا حاصل کر سکتا ہے اور سات سو

گنا اجر بھی حاصل کرسکتا ہے۔کوئی شخص اللہ کی رضا اور اللہ کی مرضی کے مطابق اپنے نفس، اپنے اہل وعیال، غریبوں اور یتیموں کے حقوق ادا کرے اور دین اور جہاد کے مصارف میں ٹھیک ٹھیک خرچ کرے تو وہ اللہ کی جنت کا مستحق ٹھیر سکتا ہے۔

مال کا مطلب صرف روپے پیسے نہیں ہے بلکہ مال سے مراد دنیا کا سارا مال واسباب ہے بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ مال کا مطلب تو پوری دنیا ہے۔ کیوں کہ دنیا میں جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے وہ مال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مال کے حوالے سے ایک منفی سوچ اور غلط رویے کی نشان دہی کی ہے کہ جس نے اسے سمیٹ سمیٹ کر اور گن گن کر رکھا اور دولت کو سمجھا کہ یہی سب سے قیمتی چیز ہے، جو دولت کا مالک ہوگا وہی دنیا کے اندر کامیاب ہوگا اور دولت سے ہی سب کچھ حاصل ہوسکتا ہے تو پھر وہ انسانوں کی عزت پر بھی ہاتھ ڈالتا ہے۔

گن گن کر رکھنے کے بھی کئی مفہوم ہیں۔ایک تو یہ کہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں دولت جمع کروں تاکہ یہ میرے کام آئے۔ دوسرے یہ کہ کثرت کی طرف اشارہ ہے، کہ اس نے بہت زیادہ مال جمع کر رکھا ہے۔تیسرے یہ کہ مال سے محبت اور شغف کہ صبح وشام یہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ آج کیا کمانا ہے؟ اور جو کچھ کمانا تھا، کمایا یا نہیں۔ اسے افسوس اسی نقصان کا ہوتا ہے، جو دنیا کے مال کے اندر ہوجائے اور اگر خوشی ہوتی ہے تو اسی کی ہوتی ہے، جو دنیا کے مال کے اندر نفع سے حاصل ہو۔ یہ مال کی حیثیت ہے۔اسی لیے فرمایا کہ جو دنیا کے مال کو جمع کرے اور گن گن کر رکھے اور شمار کرے اور اُسی پر اُس کی توجہ مرکوز رہے یہ وہ آدمی ہے، جو ھمز اور لمز بن جاتا ہے، یعنی لمزۃ اور لمزۃ، طعنہ دینے والا اور عیب چینی کرنے والا۔

جس وقت یہ سورۃ نازل ہو رہی تھی اس وقت بھی دراصل یہی کیفیت تھی۔ اس سورۃ میں مکے کے دعوت کے اس دور کی طرف اشارہ ہے کہ جب حضور نبی کریمؐ دعوت حق کا کام کر رہے تھے تو آپؐ کی مخالفت میں بھی یہی ہتھیار سب سے بڑھ کر استعمال کیے جا رہے تھے۔اس کی طرف قرآن نے جگہ جگہ مختلف اشارے کیے ہیں۔ آپؐ کو طعنے بھی دیے جاتے تھے کہ آپؐ کے ساتھی غریب، غلام، برے حال لوگ اور ذلیل وحقیر لوگ ہیں اور طرح طرح سے مذاق بھی اُڑایا جاتا تھا اور جگہ جگہ آپؐ کے خلاف بدگوئی بھی کی جاتی تھی۔اسی لیے قرآن نے بار بار اجر کی تلقین کی:

وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ (المزمل:۱۰)

''اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو۔''

ایک صبر تو وہ ہے، جو اس چیز کے مقابلے میں تھا کہ آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو جسمانی تشدد اور تکالیف پہنچائی جا رہی تھیں۔ صبر کا ایک پہلو وہ بھی تھا کہ مخالفین آپؐ کے خلاف طعن و تشنیع اور طنز اور جو جھوٹا پروپیگنڈہ کرتا تھا، اس کے مقابلے میں صبر کی تلقین کی گئی اور یہ کہا گیا کہ ان کے لیے بھی تباہی اور ہلاکت ہے اور ان کی مذمت کی گئی۔

اگر پچھلی سورۃ پر غور کریں کہ جو لوگ دنیا کے مال کو کثرت کے ساتھ حاصل کرنا چاہیں اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لینا چاہیں، جو اُن کو ایمان، عمل صالح اور موت کے بعد آنے والی آخرت کی زندگی کی فکر سے غافل کر دے، ان کے لیے فرمایا: اَلۡهٰکُمُ التَّکَاثُرُ کہ موت کے بعد جا کر ہی ان پر یہ حقیقت کھلے گی کہ یہ سب مال پیچھے رہ گیا اور ضائع ہو گیا۔ سورۂ عصر میں یہ بات فرمائی گئی تھی کہ اگر انسان کو ایمان اور حق اور صبر کی نصیحت اور تاکید نہ کی جائے تو خسارے کا سودا ہے۔ یہاں اس سورۃ میں یہ فرمایا کہ آدمی عمر بھر، جو کچھ کمانے میں لگا رہتا ہے، دنیا کی دولت کو جمع کرتا رہتا ہے اور اس کو سینت سینت کر رکھتا ہے، یہ خرابی اور تباہی کا سودا ہے۔ ایسا کرنے والا قابلِ مذمت ہے۔

یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۝ (الھمزة:۳)

''وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔''

یہ مال جمع کرنے کا بنیادی سبب ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مال اُس کو ہمیشہ کی زندگی دے دے گا، یہ اس کے لفظی معنی ہیں۔ اگر ہم اس کو کھول کر بیان کریں تو اس کے اندر دنیا پرستی اور مال کی محبت، جو اس مرض کی اصل جڑ ہے وہ بیان کر دی گئی ہے۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مال ہمیشہ آدمی کے ساتھ رہے گا اور ہر آدمی یہ بھی جانتا ہے کہ موت کے بعد مال چھن جائے گا، لیکن پھر بھی وہ مال جمع کرتا رہتا ہے اور اس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اس کو اپنا معبود اور خدا بنا لیتا ہے۔ اُس کے ذہن میں وہی بات ہوتی ہے کہ سارے کام مال کے ذریعے ہوں گے۔ جو بھی مسائل پیش آئیں گے، خواہ وہ بیماری ہو یا دیگر مسائل، ان سب میں جو کام آنے والا ہے، جس سے یہ مسائل حل ہوں گے، وہ مال ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں عطا کر دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عمر ہر لمحے گھٹ رہی ہے، لحہ بہ لحہ موت قریب آ رہی ہے۔ وہ مال جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے پاس رہے گا، اسے حیات جاوداں دے گا، اس کے مرتے ہی ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گا۔

یہ ایک کردار ہے، جو قرآن مجید نے سامنے رکھ دیا ہے۔ قریش کے اندر ایسے بہت سارے لوگ پائے جاتے تھے، جو سردار تھے اور اُن کی جائیدادیں بھی تھیں، جو اسی کردار کے مظہر تھے۔ زر پرستی اور انسانوں کی بے عزتی کرنا ان کی روش تھی۔ آج بھی ایسے کردار پائے جاتے ہیں۔ ہر زمانے میں ایسے کردار پائے جاتے ہیں۔ یہ عام مشغلہ ہے کہ لوگوں کی عزت کے درپے ہونا، ان کا مذاق اڑانا، طعنے دینا اور حقارت کی نظر سے دیکھنا۔ دولت مند لوگ، جو صاحب حیثیت بھی ہوں وہ اس مرض کے اندر کچھ زیادہ ہی مبتلا ہوتے ہیں۔

كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ (الھمزۃ:۴)

”ہرگز نہیں، وہ پھینک دیا جائے گا حطمہ میں۔“

اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو اس روش کا حامل ہے، اس کے لیے ہلاکت، تباہی اور بربادی ہے۔ کَلَّا کہہ کر اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر اُس کا یہ خیال ہے کہ اس کا یہ مال اُس کے کام آئے گا، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کا یہ خیال کہ یہ مال ہی دنیا کی اصل قیمت اور دولت ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ اٹھا کر حطمۃ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔ حطمۃ اس چیز کو کہتے ہیں، جو کسی چیز کو روند ڈالے، کچل دے اور کوٹ کر ریزہ ریزہ اور چورا چورا کر دے۔ یہ سارے معنی حطمۃ کے اندر شامل ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ کھائے جانے والے کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی جسے آگ کھا جائے گی۔ وہ جو اپنے آپ کو اپنی دولت کی وجہ سے، اپنے رتبے اور حیثیت کی وجہ سے بڑا سمجھتا تھا اور دوسروں کی عیب چینی کر کے، طعنہ زنی کر کے مو در مو بھی اور پیٹھ پیچھے بھی اُن کی برائیاں بیان کر کے تذلیل کرتا تھا اور مال جمع کر کے اپنے آپ کو بڑا معزز سمجھتا تھا۔ اب یہاں اُس کے حصے میں ذلت و حقارت آئے گی اور ذلت و حقارت کے ساتھ اس کو ایسی آگ میں ڈال دیا جائے گا، جو اس کو چورا چورا کر ڈالے گی۔ حطمۃ کے، جو اصل معنی ہیں اس کے لحاظ سے بھی مال کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جس مال کو وہ، جو جمع کرے گا اور سنبھال کر رکھے گا وہ بھی وہاں کام نہیں آئے گا۔ بلکہ جس گڑھے کے اندر اس کو ڈالا

اور جھونکا جائے گا وہاں پر وہ محض ذلیل و خوار ہی نہیں ہوگا بلکہ اُس کو چورا چورا کر کے انتہائی ذلت کی موت مار دیا جائے گا۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْحُطَمَةُ○ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ○ (الهمزة: ۵،۶)

''اور تم کیا جانو کہ کیا ہے چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی۔''

حطمة کس قدر ہولناک اور ہیبت ناک ہے، اس کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے۔ ہم دنیا میں جو آگ دیکھتے ہیں یہ اس طرح کی آگ نہیں ہے بلکہ یہ تو اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے اور اُسی کی سلگائی ہوئی ہے۔ یہ آگ دراصل اعمال کا بدلہ ہے، جو آدمی دنیا کے اندر کرتا رہتا ہے۔

مال کے بارے میں قرآن مجید نے جگہ جگہ یہ فرمایا ہے کہ وہ مال جو آدمی دوسروں کا حق مار کے یا ناجائز طور پر جمع کرتا ہے، یا جس مال کا وہ حق ادا نہیں کرتا، یہ سارا مال آگ میں تبدیل ہو جائے گا۔ ایک جگہ فرمایا کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ دراصل اپنے پیٹ میں آگ کے انگارے بھرتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرمایا کہ وہ لوگ، جو لوگوں کے مال جمع کرتے ہیں اور وہ حقوق ادا نہیں کرتے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر عائد کیے ہیں۔ یہی مال انگاروں میں بدل جائے گا اور اس سے اُن کی پیشانیاں اور چہرے داغے جائیں گے۔ اللہ کی آگ کا لفظ اسی لیے قرآن مجید نے استعمال کیا ہے اور یہ بھی اُس کی ہیبت اور خوف ناکی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ وہ آگ، جو اللہ نے خود سلگائی ہے کتنی ہیبت ناک ہوگی اور کس طرح وہ آدمی کو چاٹ لے گی اور ختم کر ڈالے گی۔ اُسی کا بچھونا ہوگا، وہی کھانے اور پینے کو ملے گی۔ یہ آگ اللہ کی طرف سے اُس کا بھیانک انجام ہوگی۔

اَلَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ○ (الهمزة: ۷)

''یہ وہ آگ ہے، جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔''

یہ اس آگ کی دوسری صفت ہے۔ طلع کے معنی جھانکنے کے بھی ہیں اور چڑھنے کے بھی۔ ہم کہتے ہیں کہ سورج طلوع ہو گیا۔ وہ بلند ہو کر آسمان پر چڑھ گیا، نظروں کے سامنے آ گیا، اور اب آدمی اس کو دیکھ سکتا ہے۔ اَلَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ سے مراد وہ آگ ہے، جو جسم کو کھاتی ہوئی دل تک پہنچ جائے گی۔ دل کا ذکر اس لیے فرمایا کہ دل ہی ان سارے امراض کا مرکز ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ (البقرۃ:۱۰) ان کے دل میں مرض ہوتا ہے۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۝ (الحج:۴۶) حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ اس پہلو کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اصل مرض کی جڑ دل ہے۔ نیتیں دل میں ہوتی ہیں، غلط عقیدے بھی دل میں ہوتے ہیں۔ محرکات بھی دل میں ہوتے ہیں، غصے کی آگ بھی دل سے بھڑکتی ہے، خواہش کی آگ بھی دل کے اندر ہی سلگتی ہے، پھر وہاں سے اعمال کے اندر ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا اصل مرکز دل ہے۔

دل کے معنیٰ کے اندر تھوڑا سا فرق ضرور ہے، لیکن یہاں قرآن مجید میں اس کو دل کے معروف معنوں میں ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن جو "قلب سلیم" لے کر آئے گا، ایک صالح اور متقی دل، وہی نجات پائے گا۔ جیسا کہ سورۂ العادیات میں بھی فرمایا گیا ہے کہ جب اعمال پیش ہوں گے تو چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی پیش ہوگا، چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی دکھائی دے گی، اور چھوٹی سے چھوٹی برائی بھی نگاہوں کے سامنے آجائے گی اور جو کچھ دلوں کے اندر ہے، سینوں کے اندر ہے وہ بھی کھول کر سامنے رکھ دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ نیتیں بھی سامنے آجائیں گی۔ البتہ جن برائیوں کا ذکر یہاں پر ہو رہا ہے۔ اپنے مال، اپنی حیثیت اور رُتبے کے بل بوتے پر دوسروں کے لیے حقارت اور اپنے لیے بڑائی کا اظہار اور مال کی محبت اور اس کے ساتھ شغف، کنجوسی اور بخل یہ سب دل ہی کے امراض ہیں۔ اس لیے کہ جب بخل ہوتا ہے اور مال آدمی جمع کر کے رکھتا ہے تو پھر اس کے بعد انسانوں کے ساتھ، جو شفقت اور محبت ہونی چاہیے، جو حسنِ سلوک ہونا چاہیے، ان کی جو عزت اور احترام ہونا چاہیے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے، جس کے شعلے لپک رہے ہوں گے، وہ اس کا شور سن سکیں گے، جو چیخے اور دھاڑے گی۔ یہ ساری باتیں اس آگ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمائی ہیں، گویا یہ زندہ شے ہے، جو لپک رہی ہے اور لوگوں کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس کے دل تک پہنچ جائے گی۔

دل آدمی کے رنج و غم کا مرکز ہے۔ دل میں آگ لگ جانا محاورہ بھی ہے۔ دل میں آگ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا مزہ خراب ہو گیا اور کوئی بڑی سخت مصیبت آدمی کے اوپر طاری ہوگئی ہو۔ ظاہری معنوں میں بھی اور حقیقی معنوں میں بھی۔ یہ وہ آگ ہے، جو دل کے مرض کا نتیجہ

ہے۔ جب کسی کے دل میں آگ لگ جاتی ہے تو پھر اس کی زندگی میں آرام، چین اور سکون کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دل میں مال کی محبت کی وجہ سے ہی آدمی کنجوسی اور بخل کرتا ہے اور مال کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا اور وہ عمر جو تیزی سے گزر رہی ہے، اسے اسی مال کے کمانے میں کھپاتا ہے، جو موت کے ساتھ اپنے پیچھے چھوڑ جائے گا۔ ان سب چیزوں کی جڑ دل کے اندر ہے اور اسی لیے دل آگ کا شکار ہوگا اور یہ آگ دلوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن مجید میں اس آگ کی بہت زیادہ تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، لیکن اس کی پوری ہیبت ناکی عیاں کردی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آگ سے ہم سب کو بچائے۔

اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۝ (الھمزۃ:۸)

''وہ ان پر ڈھانک کر بند کردی جائے گی۔''

موصدة کے معنی کسی چیز کو ڈھانک کر بند کر دینے کے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے، جس طرح بھٹے سلگاتے ہیں اور اُن کے اندر اینٹیں پکاتے ہیں اور ان کو اوپر سے بند کر دیتے ہیں کہ آگ ضائع نہ ہونے پائے اور ساری آگ اینٹوں کو پکانے کے اندر استعمال ہو۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ ہانڈی پکاتے ہوئے، جب ہم چاہتے ہیں کہ آگ پوری طرح استعمال ہو تو ہانڈی کے اوپر ڈھکن رکھ دیتے ہیں، تاکہ ہانڈی اچھی طرح پکے اور اس کی آگ ضائع نہ ہو۔ یہاں بھی یہی تصویر پیش کی گئی ہے کہ اس آگ کو اوپر سے بند کر کے پوری طرح جلانے کے لیے کھول دیا جائے گا۔

فِيۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝ (الھمزۃ:۹)

''اس حالت میں کہ وہ اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔''

یہاں بندھے ہوئے کے لیے الفاظ تو موجود نہیں ہیں مگر قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ اس کی وضاحت فرمادی گئی ہے کہ زنجیروں کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا تاکہ اگر کہیں بھاگنا چاہے تو بھاگ نہ سکے اور نکلنا چاہے تو نکل نہ سکے۔ قرآن مجید میں اس آگ کی ہولناکی کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ آدمی بار بار چاہے گا کہ کسی طرح اس سے نکل کر بھاگ سکے، خواہ چند لمحے کے لیے ہی سہی: اِنَّهٗ مَنۡ يَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوۡتُ فِيۡهَا وَلَا يَحۡيٰى ۝ (طٰہٰ:۷۴)

''حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اس کے لیے جہنم ہے، جس میں وہ نہ جیے گا نہ مرے گا۔''

وہ آگ جسم کو بھی چاٹ جائے گی، جس میں آدمی کو اوپر سے باندھ کر ڈال دیا جائے گا اور وہ بالکل ہی لاچار اور بے بس ہو کر رہ جائے گا۔ اس آگ سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

یہ سورۃ، جس کے اندر ایک پوری تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، یہ دراصل اسی سلسلۂ کلام کا حصہ ہے، جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ اصل چیز، جو انسان کے پاس ہے وہ مہلت عمل اور وقت ہے۔ یہ وقت اللہ تعالیٰ نے اس لیے دیا ہے کہ ہم اس کو اس امتحان کے لیے استعمال کریں، جس میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو ڈالا ہے۔ یہ امتحان دراصل اس چیز کا ہے کہ ہم اپنے ارادے سے نیکی کا راستا اختیار کریں اور برائی کے راستے کو ترک کر دیں۔ ہماری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کی پہچان بھی دی ہے۔ نیکی اور بدی کی طرف رجحان اور میلان بھی دیا ہے اور نیکی کی محبت بھی رکھ دی ہے۔ کوئی آدمی برائی کو محبوب نہیں رکھتا۔ برا آدمی بھی نیکی کو محبوب رکھتا ہے، لیکن یہ ہمارے اپنے اوپر ہے کہ ہم کون سی راہ اختیار کرتے ہیں۔

اب اس راستے کے اندر اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ دنیا ہی ہے۔ دوسری طرف اگر دنیا میں رہتے ہوئے آدمی شادی بیاہ یا کاروبار نہ کرے، اس کو نہ برتے، سیاست، معیشت، جنگ، سب سے گریز کرے، تو پھر اس کے لیے اللہ کی شریعت پر عمل کرنا، اس کی رضا کو حاصل کرنا اور اس کی جنت میں داخل ہونے کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے۔ درحقیقت دنیا انسان کے لیے ناگزیر ہے اور مال بھی کوئی برائی نہیں بلکہ خیر ہے۔ لیکن اگر آدمی اس مال کو محبوب بنالے، اسی کو اپنا معبود بنالے اور اسی کی پرستش کرے اور اسی کو بخل اور کنجوسی کے ساتھ سمیٹ سمیٹ کر رکھے اور اس راستے میں خرچ نہ کرے، جس پر اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کی دعوت دی ہے تو پھر یہ مال ہی خدا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

آدمی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا جمع کرلے اور یہی چیز اس کو زندگی کے مقصد سے اور اس کے امتحان سے غافل کر دیتی ہے۔ پھر آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ آدمی کو، جو عمر ملی ہے اگر وہ اُس کو مکان و جائیداد بنانے میں، مال بنانے میں اور دنیا میں عیش کرنے میں خرچ کر رہا ہے، تو گویا یہی اس کا مقصدِ زندگی ہے، لیکن یہ خسارے کا سودا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک طرف دنیا خسارے کا سودا ہے اور دوسری طرف اسی دنیا کے ساتھ انسان کا تعلق بھی ہے اور یہی دنیا جنت کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی انسان کا امتحان ہے کہ وہ کس چیز کو اپناتا ہے۔

اس سورۃ میں، جو بات کہی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں، جو پہلا خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر مال ہی سب کچھ ہے۔ مال ہی ہر چیز کی کنجی ہے۔ مال ہی سے دنیا کی ساری نعمتیں مل سکتی ہیں۔ اس لیے وہ مال جمع کرنے کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ وہ بخل بھی برتتا ہے، اپنی دولت کے زعم میں لوگوں کی تحقیر بھی کرتا اور ان کا مذاق بھی اڑاتا ہے۔ یہ اس خیال کا نتیجہ ہے کہ مال ہی اصل چیز ہے۔ اس مال کا انجام کیا ہوگا؟ یہاں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اگر کوئی مال و دولت کی بنیاد پر دنیا میں انسانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا اور ان کی تحقیر اور تذلیل کرے گا اور اُن کی اہانت کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ذلیل کرکے دوزخ میں پھینکے گا۔ اگر وہ اس طرح مال جمع کرکے یہاں دنیا میں راحت کا سامان کرے گا، تو وہاں پر اللہ تعالیٰ اس کے لیے، جو آگ سلگائے گا، وہ سب کو چورا چورا کرڈالے گی اور اگر آگے دل کے اندر مال کی محبت اور شغف ہوگا تو دل کو بھی وہ آگ کھالے گی۔ اگر یہاں پر وہ بڑے اعوان و انصار رکھے گا، دوست احباب ہوں گے تو وہاں وہ اکیلا ہی اس آگ کے اندر دھکیل دیا جائے گا۔

قرآن نے اس بھیانک اور عبرت ناک انجام کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے کے لیے اور ہر عیب جوئی کرنے والے کے لیے، جس نے مال کو سمیٹا اور گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ کام آئے گا اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا، بلکہ وہ حطمہ کے اندر چورا چورا کردینے والی اور روند دینے والی آگ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔ تمہیں کیا پتا کہ حطمہ کیا ہے؟ یہ تو اللہ کی آگ ہے، اس کی سلگائی ہوئی ہے اور یہ تو اس کے دل تک پہنچ جائے گی۔ اس کے اندر اسے ڈالا جائے گا اور پھر اسے ڈھانپ کر اوپر سے بند کردیا جائے گا اور لمبے لمبے ستونوں کے ساتھ اس کو باندھ دیا جائے گا۔ اس کا مال اس کے لیے آگ بن جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کے لیے پھر کوئی امان کی جگہ نہ ہوگی۔ یہ انجام ہوگا ہر اس شخص کا اور اس کے مال کا، جس نے مال ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا اور آخرت کو بھول گیا تھا۔
اللہ تعالیٰ ہمیں اس آگ سے بچائے۔ آمین

☆☆

سورۃ الفیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝
اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ؕ﴿۱﴾ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ
كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ ۙ﴿۲﴾ وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ طَيۡرًا اَبَابِيۡلَ ۙ﴿۳﴾
تَرۡمِيۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ ﴿۵﴾ ع

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا، کیا اُس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے، جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، پھر ان کا یہ حال کر دیا کہ جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا۔

تشریح: سورۂ فیل میں سات آیات ہیں۔ یہ اُس واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو واقعۂ فیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تفصیل عرب کی تاریخ میں بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ اس واقعے کی ساری تفصیل جانے بغیر اس کی تعلیمات جاننا مشکل ہے، لیکن اگر واقعہ نہ بھی معلوم ہو تو سورۃ میں خود اشارے موجود ہیں، جن سے اس میں بیان کردہ تعلیمات کو جانا جا سکتا ہے۔ سورۂ ہمزہ کے بعد اور سورۂ قریش سے پہلے اس سورۃ کا جو اصل پیغام ہے، اُسے واقعے کی تفصیلات جانے بغیر بھی بنیادی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یمن میں ایک عیسائی حکمراں تھا، جس وقت نبی کریمؐ کی پیدائش ہوئی،

اُس سے تقریباً ۴۵ سال پہلے وہاں وہ واقعہ پیش آیا، جس کا سورۂ بروج میں ذکر آیا ہے کہ خندقیں کھودی گئیں اور لوگوں کو اس میں زندہ جلا دیا گیا۔ یہ سب اس جرم میں ہوا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے ہیں، جن کے خلاف یہ کارروائی کی گئی تھی۔ یہ دراصل عیسائی تھے، جو اُس زمانے کے مسلمان تھے۔ ایک یہودی حکمراں نے تقریباً ۲۰ ہزار عیسائیوں کو اس طریقے سے آگ کی خندقوں میں جلا ڈالا تھا۔ اُن خندقوں کے نشانات بہت بعد تک وہاں باقی رہے۔ یہ نجران اور یمن کا علاقہ تھا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ حضورؐ کا سالِ پیدائش ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء ہے، اور یہ غالباً ۵۲۳ء یا ۵۲۴ء کا واقعہ ہے۔ چوں کہ عیسائی حکومت عملاً قائم تھی، قسطنطنیہ اور استنبول ان کا مرکز تھا اور شام میں جہاں اُن کی حکومت قائم تھی وہیں سے پورے مشرقِ وسطیٰ کو وہ کنٹرول کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک فوج بھیجی اور اس فوج کا سپہ سالار ابرہہ تھا، جس نے حبشہ پر قبضہ کرلیا، جو کہ سعودی عرب کے بالکل مقابل میں واقع ہے اور عیسائیت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

ایک روایت یہ ہے کہ ابرہہ نے ایک گرجا بنایا، جو اپنی عمارت کے لحاظ سے بھی شان دار تھا اور سجاوٹ کے لحاظ سے بھی خانہ کعبہ سے بہتر تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ خانہ کعبہ کی مرکزی حیثیت برقرار نہ رہے، بلکہ یمن میں بنایا ہوا یہ گرجا اور کلیسا لوگوں کا مرکز بن جائے۔ روایات کے مطابق کسی عرب نے اُس میں جا کر گندگی کردی اور بعض عرب نوجوانوں نے جا کر آگ لگادی اور اس بنیاد پر پھر اس نے یہ اعلان کیا کہ میں اب قریش کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے اور خانہ کعبہ کا نام و نشان تک مٹا دوں گا۔

روایات کے مطابق اس نے ۶۰ ہزار کا لشکر لے کر، جس میں سات یا آٹھ ہاتھی بھی تھے، مکہ پر حملے کی نیت سے کوچ کیا۔ یہ لشکر بھی بہت بڑی تعداد میں تھا اور ہاتھی آج تو کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اس لیے کہ آج ہاتھی سے کہیں زیادہ طاقت ور نقل و حمل اور حملے کی چیزیں انسان نے ایجاد کرلی ہیں، مثلاً ٹینک، ہوائی جہاز اور میزائل وغیرہ لیکن یہ تب کی بات ہے جب ہاتھی اسلحے کے لیے اور جنگ کے لیے، بار برداری اور حملہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ تھا۔ اس لیے ہاتھیوں کا اس لشکر میں ہونا اس بات کی علامت تھی کہ یہ بہت مسلح اور زیادہ طاقت ور لشکر ہے کہ جو حملہ آور ہو رہا ہے۔ اسی واقعے کی طرف قرآن نے اصحابِ فیل کا واقعہ کہہ کر اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو تدبیر اور عزائم لے کر وہ لشکر آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اُس کو اکارت کردیا

اور اس کا داؤ چل نہ سکا۔ اس نے اُن پر اڑتے ہوئے پرندے جوق در جوق بھیجے، جنھوں نے اُن پر پتھر کی کنکریاں ماریں، جس سے پورا لشکر کا یا اس کا ایک بڑا حصہ ایسے ہوگیا، جیسا کہ قرآن نے مثال دی ہے کہ دانوں کا بھوسہ جو ہوا میں اڑا دیا جاتا ہے، جس کو جانوروں نے کھا کر اُگل دیا ہو۔ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ جیسے کھایا ہوا بھوسا۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ○ (الفیل:۱)

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟''

خطاب شروع ہوتا ہے: اَلَمْ تَرَ کَیْفَ کیا تم نے نہیں دیکھا۔ یہ کس سے خطاب ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا خطاب تو سب سے پہلے نبی اکرمؐ سے ہوسکتا ہے، لیکن نبیؐ کے دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ جس سال یہ واقعہ پیش آیا تھا، اسی سال آپ کی ولادت ہوئی تھی، جس کو عرب عام الفیل کے نام سے جانتے تھے، یعنی ہاتھی والوں کا سال بلکہ اُس وقت سے اُن کے کیلنڈر کا استعمال اور واقعات کا شمار بھی اسی واقعے سے ہونے لگا تھا کہ یہ واقعہ ہاتھی والوں کے سال دو سال بعد، یا پانچ سال بعد یا پہلے پیش آیا تھا۔ گویا کہ قریش کی تاریخ میں یہ اتنا اہم واقعہ بن گیا تھا کہ وہ اپنے ہاں وقوع پذیر ہونے والے کسی بھی واقعے کا شمار ہاتھی والوں کے واقعے سے کرنے لگے تھے۔

عربی میں رُؤیَۃ کے معنی دیکھنے کے ہیں۔ آنکھوں سے دیکھنے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور دل اور عقل اور بصیرت کی روشنی سے دیکھنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اردو زبان میں بھی دیکھنے کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یعنی آنکھ سے دیکھنا اور عقل اور علم کی روشنی میں دیکھنا، مثلاً کیا تم نے یہ دلائل نہیں دیکھے۔ یہ دلائل دیکھنا دراصل دلائل پر غور کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے حضورؐ بھی اس کے مخاطب ہوسکتے ہیں، لیکن یہاں پر دراصل حضورؐ کے واسطے سے پورے قریش مخاطب ہیں اور قریش کا ہر وہ فرد مخاطب ہے، جو اس واقعے کو جانتا تھا۔ چوں کہ اُن کے اشعار میں، اُن کی شاعری میں، تقریروں اور محاوروں میں، سب میں اس کا ذکر موجود تھا، نصف صدی قبل کا ایک تازہ ترین واقعہ تھا، اس لیے سب اس سے واقف تھے اور اس کو اچھی طرح جانتے تھے۔ دراصل اس کے مخاطب قریش ہیں، اور اُن سے کہا جارہا ہے کہ تم نے اس واقعے پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ (تمھارے رب) نے اصحابِ فیل کے ساتھ کیا معاملہ

کیا؟ سوالیہ انداز یہ بتانے کے لیے ہے کہ کتنا عظیم الشان واقعہ ہے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی کتنی نشانیاں ہیں، جو اس میں پوشیدہ ہیں۔

اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَھُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ (الفیل:۲)

''کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا۔''

یہ بھی ایک سوالیہ جملہ ہے کہ کیا اُس نے اُن کی تدبیر کو ناکام نہیں کر دیا؟ کسی تدبیر کو گمراہ کر دینا ایسا ہی ہے، جیسا کسی نے تیر مارا اور وہ صحیح راستے پر جانے کی بجائے کہیں اور چلا گیا، تو وہ تیر گمراہ ہو گیا۔ اسی سے محاورہ بن گیا کہ جس نے تدبیر کو گم راہ کر دیا۔ گویا کہ تدبیر بے کار کر دی۔ کَیۡد کا لفظ عربی زبان میں ایسی تدبیر کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ جو خفیہ یا چھپی ہوئی ہو یا کم سے کم ایسی تدبیر کے پیچھے جو عزائم ہوں وہ چھپے ہوئے ہوں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر تو یہ تدبیر کھلی ہوئی تھی، ۶۰ ہزار کا لشکر تھا، اس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے اور جس مقصد کے لیے ابرہہ نے لشکر کشی کی تھی اس کا بھی اس نے اعلان کر دیا تھا کہ میں خانہ کعبہ کو بالکل مسمار کر کے اور اس کا نام و نشان مٹا کے واپس جاؤں گا۔ گویا تدبیر میں کوئی چیز خفیہ نہیں تھی بلکہ سارا کام علانیہ ہو رہا تھا۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ تدبیر کے پیچھے جو خفیہ بات تھی وہ کچھ اور تھی اور اس کے اصل عزائم کچھ اور تھے۔ اس کا ایک پہلو بہت واضح اور صاف تھا اور وہ یہ تھا کہ مشرق سے مغرب کی طرف ساری تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ تمام قافلے عرب سے گزر کر شام جاتے تھے اور شام سے گزر کر مصر جاتے تھے، اور اسی طرح پورے مشرقِ وسطیٰ میں یہ سلسلہ چلتا تھا اور ہندستان کا مال بھی زمینی راستے سے عربوں کے ہاں سے جاتا تھا۔ زمینی راستوں کے ساتھ ساتھ بحری راستوں پر بھی انھی کا عمل دخل تھا۔ اُن کی کشتیاں دبئی سے عمان یورپ کا سامانِ تجارت لے کر آتی جاتی تھیں۔ گویا زمینی اور بحری قافلوں کے اوپر عربوں کی حکمرانی تھی۔

رومن امپائر بہت عرصے سے اس کوشش میں تھی کہ عربوں کو تجارت سے بے دخل کر دیا جائے۔ اس غرض سے انھوں نے اپنے بحری بیڑے بھی بھیجے اور فوجیں بھی بھیجیں تاکہ کسی طریقے سے عربوں کو تجارت سے بے دخل کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ بہت سے تاریخی واقعات بھی بطور نظیر موجود ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس طرح ہوا کرتا ہے کہ اگر ایک ملک دوسرے ملک کے اوپر فوج کشی کرتا ہے تو بظاہر اخلاقی اور مذہبی مقاصد ہوتے ہیں، لیکن پسِ پشت سامراجی اور

تجارتی اغراض کارفرما ہوتی ہیں۔ ان کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ خانہ کعبہ کی جو مرکزی حیثیت ہے، جس کی وجہ سے قریش کو پورے عرب میں سرداری حاصل ہے، جس کی وجہ سے وہ سارے تجارتی قافلوں کے نگراں ہیں، ان کو ادھر سے ادھر پہنچاتے ہیں، ان کا عمل دخل ختم کر دیا جائے۔ اس کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ فی الواقع جو اس نے گرجا بنایا تھا، اس کو جا کر قریش کے آدمی نے نجس کیا تھا، یا نہیں، یا کسی نے اس کو آگ لگائی تھی یا نہیں؟ لیکن اس کا پروپیگنڈا یہی تھا کہ میں اس لیے مکہ جا رہا ہوں کہ ہماری عبادت گاہ کو عربوں نے ناپاک کیا ہے اور اس کو آگ لگائی ہے۔ درحقیقت یہ ایک پروپیگنڈا تھا جو عموماً مذموم مقاصد کے پیش نظر ہمیشہ کیا جاتا ہے۔ حملے کی وجہ کچھ اور ہوتی ہے اور بہانہ کچھ اور بنایا جاتا ہے۔ ان دو معنوں میں اللہ تعالیٰ نے کید کا لفظ لشکر کشی کے لیے اور فوج کے حملے کے لیے استعمال کیا اور کہا کہ ان کی تدبیر اکارت گئی۔

وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ۙ (الفیل:۳)

"اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے۔"

ان کی یہ تدبیر اس طرح سے اکارت گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پرندے بھیجے جو جوق در جوق امنڈ کر ان کے اوپر آئے۔ یہاں پر ابابیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ہماری زبان میں ابابیل ایک خاص پرندے کا نام ہے۔ لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ جو پرندے امنڈ کر آئے تھے، وہ ابابیل تھے۔ لیکن عربی زبان میں ابابیل کسی پرندے کا نام نہیں ہے بلکہ جو چیز بھی فوج در فوج یا گروہ در گروہ آئے وہ خواہ پرندے ہوں یا گھوڑے یا لشکر، اُن کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں یہ لفظ ایک پرندے کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ یہاں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ پرندے آئے تھے لیکن قرآن مجید نے اس کی تشریح نہیں فرمائی کہ کون سے یا کس طرح کے پرندے آئے تھے؟ اتنا کہا گیا ہے کہ اُڑتی ہوئی چیزیں جن کے لیے طیر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

پرندوں کی آمد کا جو قصہ تاریخی طور پر بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ابرہہ خانہ کعبہ پر لشکر کشی کی غرض سے نکلا تو عرب کے مختلف قبائل میں یہ خبر پھیل گئی کہ خانہ کعبہ پر لشکر کشی ہو رہی ہے۔ چوں کہ عرب کے قبائل کی خانہ کعبہ سے وابستگی بہت پرانی تھی، تقریباً ڈھائی ہزار سال سے چلی آ رہی تھی اور وہ اپنے حج اور عبادت کے لیے وہیں جایا کرتے تھے، اور خانہ کعبہ کو اپنا دینی مرکز بھی سمجھتے تھے اور اُن کا علاقائی اور سیاسی مرکز بھی خانہ کعبہ ہی تھا، چناں چہ مختلف قبائل نے

راستے میں مزاحمت کی۔ کسی قبیلے کا سردار گرفتار ہو گیا، کسی قبیلے کے سردار نے ہتھیار ڈال دیے اور یوں یہ لشکر مکہ کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی آمد کی خبر پورے قریش کو دی۔ اہل قریش اچھی طرح جانتے تھے کہ ۶۰ ہزار کے لشکر کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہیں۔ چناں چہ جس روایت پر ہمارے سارے مفسرین کا اجماع ہے، وہ یہ ہے کہ حضورؐ کے دادا عبدالمطلب، جو اس وقت قریش کے سردار تھے، ابرہہ کے دربار میں گئے اور اس سے کہا کہ تم کو جو کچھ چاہیے وہ ہم سے مانگ لو لیکن تم خانہ کعبہ کو کسی قسم کی گزند یا نقصان نہ پہنچاؤ۔ یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ مگر اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عبدالمطلب کے اونٹوں کو اس نے پکڑ لیا اور وہ وہاں اپنے اونٹوں کو چھڑانے کے لیے گئے۔ عبدالمطلب بہت بلند و بالا اور وجیہ شخص تھے۔ ابرہہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا، اس نے ان سے پوچھا کہ وہ کس لیے آئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ میں اپنے اونٹ چھڑانے کے لیے آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ میری تو رائے آپ کے بارے میں اچھی تھی۔ آپ کی خانہ کعبہ کو تو فکر نہیں ہے، البتہ آپ اپنے اونٹوں کو چھڑانے کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خانہ کعبہ جس کا ہے، اس کی فکر وہ خود کرے گا، جو اس کا مالک اور رب ہے وہی اس کی فکر کرے گا، اس نے کہا کہ اس خانہ کعبہ کو اب مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا اور اس نے اونٹ واپس کر دیے۔

اس کے بعد جب اُس نے لشکر کشی کا ارادہ کیا تو اس کے ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ عرب کے بہت سارے شعرا کے کلام میں بھی یہ قصہ موجود ہے اور قرآن مجید میں بھی اس کی تفصیل بہت سارے زاویوں سے موجود ہے۔ اس لیے کہ جب یہ سورۃ نازل ہو رہی تھی اس وقت تک اس واقعے کو ۴۵ سال گزرے تھے۔ بہت سارے ایسے لوگ ابھی موجود تھے، جو اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے، جن کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ انھوں نے بھی اس واقعے کو بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق جب ہاتھی کو حملے کے لیے آگے بڑھایا گیا تو اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جب اس کا منہ خانہ کعبہ کی طرف کیا جاتا تو وہ بیٹھ جاتا اور جب اس کا منہ پیچھے کیا جاتا یا دائیں بائیں کیا جاتا تو وہ چلنا شروع کر دیتا۔ اس لشکر کے بہت سے سپاہیوں نے بہت زور لگایا، سب کچھ کیا لیکن ہاتھی نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ

آئے۔ روایت کے مطابق اُن سب کے پاس تین تین کنکریاں تھیں۔ ایک کنکری چونچ میں تھی اور دو پنجوں میں تھیں۔ جس پر بھی کنکریاں پڑیں اُس کو پہلے خارش ہوتی تھی اور اس کے بعد جب وہ کھجاتا تھا تو اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا تھا۔ خون بہنا شروع ہو جاتا تھا اور گوشت جھڑنے لگتا تھا۔ اس طرح ہاتھی بھی مارے گئے اور لشکر والے بھی مارے گئے اور ان کی تدبیر محض معمولی پرندوں کے ہاتھوں اکارت گئی۔

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ (الفیل:۴)
''جو ان کے اوپر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے۔''

سجیل دراصل دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ سنگ یا پتھر اور جیل کے معنی ہیں مٹی کے۔ مٹی جب پک جائے، بہت سخت ہو جائے تو اس مٹی کا جو پتھر بنتا ہے، وہ پتھر یہ پرندے لے کر آئے تھے اور یہ انھوں نے لشکر پر پھینکنا شروع کر دیے۔

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (الفیل:۵)
''پھر ان کا یہ حال کر دیا کہ جیسے (جانوروں کا) کھایا ہوا بھوسا۔''

گویا ان پتھروں کے برسنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا کر دیا، جیسا جانوروں کا بھوسا ہوتا ہے اور وہ بھی کھایا ہوا۔ اس میں کیا سبق پوشیدہ ہے، یہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس واقعے کی یہ تفصیل قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی تاریخ بیان ہوتی ہے، اس کے پیش نظر تاریخ کا بیان نہیں ہوتا، بلکہ اس کے پیش نظر تذکیر اور نصیحت ہوتی ہے اور اس سے جو سبق نکلتا ہے وہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اس کے بعد آنے والی سورۃ، جو سورۂ قریش کے نام سے موسوم ہے، دراصل وہ مل کر اس سورۃ کے مضمون کو مکمل کرتی ہے۔ اس کے اندر یہ دعوت ہے کہ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (القریش:۳) قریش کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی ہی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اس واقعے کو گزشتہ سورتوں کے سیاق میں سمجھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ جو آدمی دنیا جمع کرتا ہے، یہ دنیا قبر تک اس کا ساتھ دیتی

ہے۔ آدمی زیادہ سے زیادہ مال و دولت جمع کرنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اصل کامیابی دنیا کمانا ہے، یعنی دنیا کا مال بھی اور طاقت بھی، جسے ہمارے ہاں مال و جاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مال اور دولت، عزت اور حیثیت، عہدے اور منصب اور فوجیں اور سیاسی قوت، یہی چیزیں انسان کو مطلوب ہوتی ہیں۔ قرآن مجید نے پہلے اس کو سورۂ تکاثر میں بیان کیا کہ لوگ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ دنیا جمع ہو جائے، مال جمع ہو، طاقت ہو، فوج جمع ہو جائے، سیاسی طور پر اونچے اُٹھیں، لیکن یہ تو حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (التکاثر:۲) یعنی قبر تک ساتھ دینے والی چیزیں ہیں اور اس کے بعد یہ کام آنے والی نہیں ہیں۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ (التکاثر:۸) اور اس کے بعد تم سے ہر نعمت کے بارے پوچھا جائے گا۔ اس کے بعد اس نے کامیابی کا اصل معیار پیش کیا ہے اور جس کے لیے قرآن نے عصر کا لفظ استعمال کیا ہے، جو برف کی طرح پگھل رہا ہے اور اس بات کو بڑا زور دے کر کہا ہے کہ دراصل ہر آدمی خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اس کے بعد سورۂ ہمزہ آتی ہے، جس میں مال و دولت اور جاہ و منصب کی حقیقت کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو دولت جمع کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی سب کچھ ہے، اُن کو اُٹھا کر ایسے گڑھے میں پھینک دیا جائے گا، جہاں پر اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ بھڑک رہی ہوگی اور وہ ان کو چورا چورا کر دے گی، جیسے یہاں پر کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا تھا، جیسے بھوسا ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، اُن کو وہاں پر اُس آگ کے اندر ڈال دیا جائے گا، جس کو حطمہ کہتے ہیں۔ یہ ہے مال و دولت کی حقیقت۔ دوسری چیز قوت اور طاقت ہے۔ یہ سیاسی قوت اور بالادستی بھی ہے اور اسلحہ اور عددی قوت بھی ہو سکتی ہے۔ جب ابرہہ کا ہاتھیوں کے ساتھ لشکر اللہ کے گھر کو مٹانے کے لیے آیا تو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے ہتھیاروں سے نہیں بلکہ محض مٹی کے کنکروں سے اور فرشتوں کی فوج بھیج کر، جو پرندوں کو لے کر آئے، اس لشکر کو اس طریقے سے چور چور کر دیا کہ جیسے کھایا ہوا بھس ہو۔ اس طرح ان کے تکبر اور طاقت کو ملیا میٹ کر دیا۔ لہٰذا یہ بات واضح کی گئی ہے کہ دنیا کے اندر بھی اور آخرت میں بھی ان میں سے کوئی چیز انسان کے کام آنے والی نہیں ہے۔ دراصل یہ سبق تو ہر زمانے کے لیے ہے، لیکن قریش کے ساتھ جو گفتگو ہو رہی ہے، جو کہ اس کے اولین مخاطب ہیں، اس پس منظر میں اس کے اندر اور بھی بہت ساری باتیں ہیں، جو کہ اس ایک واقعے کے اندر پوشیدہ ہیں۔

وہ لوگ جو حضورؐ کی مخالفت کر رہے تھے، اُن میں سے کچھ لوگ دولت کے بل بوتے پر مخالفت کر رہے تھے۔ یہ لوگ آپؐ کا مذاق اُڑاتے تھے، آپؐ کے خلاف اشارے بازی کرتے تھے، آپؐ کی غیبت کرتے تھے اور آپؐ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے، جس کی طرف قرآن مجید نے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (مودرمو) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔(الھمزۃ ۱:) کہہ کر اشارہ فرمایا۔ گویا وہ لوگ، جن کے پاس دولت ہے اور اس کے گھمنڈ میں وہ لوگوں کی عزت پر ہاتھ بھی ڈالتے ہیں اور نبیؐ کی مخالفت کے لیے بھی کھڑے ہو گئے ہیں اور پروپیگنڈا کے زور پر چاہتے ہیں کہ اس پوری دعوت کو ناکام کر دیں، پروپیگنڈے کا زور بہت زیادہ ہوتا ہے اور جو بات آدمی کے کان میں پڑتی ہے بڑا اثر کرتی ہے۔ ان کے مقابلے کے لیے قرآن مجید نے اپنے نبیؐ کو ہدایت فرمائی کہ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (المزمل:۱۰) یعنی جو پروپیگنڈا یہ لوگ کرتے ہیں، جو برائیاں یہ بیان کرتے پھرتے ہیں، آپؐ کے خلاف جگہ جگہ نفرت پھیلاتے ہیں، اس پر آپؐ صبر کریں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے، جن کے پاس قوت اور طاقت تھی اور جو اپنی قوت کے بل پر تشدد کر رہے تھے۔ اس دور کے مسلمانوں کو جو بالکل شروع میں ایمان لے آئے تھے، اُن کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے، پتھر مارتے، اُن کو رسیوں سے باندھ کر مارا کرتے تھے۔ اُن کے سامنے بھی یہ بات رکھی گئی ہے کہ قوت و طاقت بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔

اس میں خانہ کعبہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ خانہ کعبہ دعوت کا مرکز ہے اور اللہ کا پہلا گھر ہے، جو اس کی بندگی کے لیے بنایا گیا۔ قرآن مجید نے خود اس بات کا اعلان کیا ہے:

> اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝
> فِيْهِ اٰيٰتٌ ۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران:۹۶،۹۷)
> ”بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ، جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے، جو مکّے میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم علیہ السلام کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔“

یہی حضرت ابراہیمؑ کی سکونت کا بھی مقام ہے اور یہیں کھڑے ہو کر انھوں نے خانہ کعبہ تعمیر بھی

کی۔ یہ گھر امن والی جگہ ہے، جو بھی اس میں داخل ہوگا، امن پائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان سارے انسانوں کے لیے لازم کر دیا ہے کہ جو بھی سفر کر سکتا ہو، اس کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس گھر کی زیارت کرے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًاؕ (آل عمران:۹۷)

"لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔"

خانہ کعبہ کی بھی کچھ خصوصیات ہیں، جو کہ دنیا کی کسی اور عبادت گاہ اور پرستش گاہ میں نہیں پائی جاتیں۔ چناں چہ قرآن مجید نے واضح طور پر اعلان فرمایا ہے کہ یہ بنائے ابراہیمؑ پر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، جن بنیادوں پر اسے قائم کیا، یہ آج تک انھی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس بات کو بھی ساڑھے چار ہزار سال گزر چکے ہیں اور اس وقت کے لوگ، عرب اور ساری دنیا کے لوگ مسلسل اس کی زیارت کر رہے ہیں۔ لیکن ہماری روایات کے مطابق پہلا گھر ہونے کی وجہ سے اس کی بنیادیں حضرت آدمؑ نے رکھی ہیں۔ دراصل حضرت ابراہیمؑ کے دور میں انھی بنیادوں پر دوبارہ اس گھر کو قائم کیا گیا تھا۔ خانہ کعبہ کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی تعمیر کا اہتمام فرمایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اسی مقصد کے لیے ہجرت کی، صرف اسی مقصد کے لیے انھوں نے اپنی بیوی اور بچے کو لا کر یہاں پر آباد کیا۔ یہاں نہ پانی تھا، نہ رزق اور نہ امن ہی تھا۔ انھوں نے بالکل اکیلے بے آب و گیاہ جگہ پر لا کر اپنے خاندان کو آباد کیا اور اس گھر کی تعمیر کی۔ یہیں سے انھوں نے اعلان کیا کہ سارے لوگ یہاں پر اللہ کی بندگی کے لیے آئیں، جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام، جیسے لوگ ہوئے۔ جب وہ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے: "اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب، ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب، ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک رسول اٹھا، جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔" (البقرہ: ۱۲۷-۱۲۹) گویا یہ اللہ کا گھر ہے، جو اس کی دعوت کا، آخری کتاب کا اور

آخری نبیؐ کا مرکز بننے والا تھا۔ یہیں پر اُن کی پیدائش ہوئی اور یہی سال تھا، جس سال اصحابِ فیل کا لشکر حملہ آور ہوا تھا۔

دراصل یہ پورا واقعہ نبوت محمدیؐ کی ایک نشانی ہے۔ معجزات تو نبوت کے آنے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، لیکن یہ بات اس چیز کی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو اتنے بڑے لشکر اور اتنی بڑی قوت کے مقابلے میں اس لیے محفوظ فرمایا کہ یہاں سے اُس کی آخری دعوت، آخری کتاب اور آخری رسولؐ کی بعثت اور اسلام کی تحریک اسی مقام پر برپا ہونے والی تھی اور خانہ کعبہ اس کے بعد اُن کی تحویل میں جانے والا تھا۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو مشرکین سے نجات دلا کر اُمت مسلمہ کے سپرد کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کے حوالے سے دو باتوں کی دعا فرمائی تھی۔ ایک تو یہ دعا فرمائی تھی کہ یہاں پر امن قائم ہو اور دوسرے یہ کہ یہاں آنے والوں کے لیے رزق کا سامان ہو:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط (البقرۃ۲:۱۲۶)

”اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے، جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔“

اس کا مقصد یہ بیان فرمایا تھا تاکہ یہاں لوگ نماز قائم کریں، اللہ کے پورے دین کو اللہ کی بندگی کی بنیاد پر قائم کر دیں۔ اللہ کا یہ گھر دراصل ان ساری چیزوں کا مرکز اور محور تھا۔ یہ پوری انسانیت کی ہدایت اور آیندہ آنے والی کتاب، جو ہدایت دینے والی تھی، نبیؐ جو بنی نوعِ انسان کا ہادی بننے والا تھا اور اس کی جائے پیدائش بننے والا تھا۔ اس لیے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی ظاہر فرمائی کہ اس نے اپنے ذرائع اور قوت سے اور اپنے معجزے سے، اس لشکر کو برباد کر دیا، جو لشکر خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے آیا تھا۔

روایت میں آتا ہے کہ جب ابرہہ نے ہاتھی کو خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھایا تو وہ آگے نہیں بڑھا۔ ہاتھی اگر آگے نہیں بڑھا تو یہ بھی دراصل اسی چیز کی علامت ہے کہ یہ گھر امن کا گھر ہے۔ حضورؐ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے۔ جب آپؐ صلح حدیبیہ کے لیے

آئے اور اس وقت صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ لڑائی ہو جاتی اور اگر خانہ کعبہ میں اور اس کے چاروں طرف لڑائی ہوتی تو بڑی خوں ریزی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت بھی دے دی تھی کہ تم مسجد حرام میں نہ لڑو لیکن اگر لوگ تم سے لڑیں تو پھر تمہیں لڑنے کی اجازت ہے۔ لیکن جب آپؐ کی اونٹنی نے مکہ کی طرف دوڑنا شروع کیا، تو اونٹنی بیٹھ گئی اور اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ چناں چہ لوگوں نے کہا کہ اونٹنی تھک گئی ہے اور وہ آپؐ کا کہنا نہیں مان رہی تو آپؐ نے فرمایا کہ نہیں اونٹنی کو اس نے روک دیا ہے، جس نے ابرہہ کے ہاتھی کو روک دیا تھا، جب وہ خانہ کعبہ کی طرف بڑھ رہا تھا، دراصل اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ صلح حدیبیہ ہو جائے۔ چناں چہ اس کے نتیجے میں اہل عرب اور قریش ٹوٹ ٹوٹ کر حضورؐ کے ساتھ مل گئے اور جب فی الواقع مکہ فتح ہوا تو ایک قطرہ خون کا نہیں بہایا گیا۔ مسلمانوں نے بعد میں بھی جتنے بڑے بڑے مراکز فتح کیے، اس موقعے پر بھی ایک قطرہ خون کا نہیں بہایا گیا اور لوگوں نے خود دروازے کھول کر صلح نامے پر دستخط کر دیے۔ بیت المقدس فتح ہوا، دمشق فتح ہوا تو ایک قطرہ خون کا نہیں بہایا گیا۔ لوگوں نے خود ہی دروازے کھولے اور مسلمانوں کو دعوت دی کہ شہر کے اندر داخل ہو جائیں۔ یہ دراصل اس گھر کے پرامن ہونے کی نشانی تھی کہ اس گھر کو جنگ سے محفوظ رکھا گیا۔

یہ واقعہ کس طرح پیش آیا، جیسا کہ میں نے آپ کے سامنے بیان کیا کہ سارے مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ پرندے امنڈ کر آئے اور انہوں نے چھوٹے پتھروں کے ذریعے، جو انھوں نے پھینکنے شروع کیے اور پورے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس واقعے کی اور بھی تعبیریں کی گئی ہیں۔ اصل بات جو سمجھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اس طرح غیر معمولی طور پر پیش نہیں آیا بلکہ یہ پرندے دراصل کنکر اور مٹی اس طرح کی لے کر آئے تھے، جن کے اندر جراثیم تھے اور وہ مرض کہ جس سے فوجی مرنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کی ساری نشانیاں، جو کلام عرب میں بیان کی گئی ہیں وہ جراثیموں کی علامات ہیں، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دنیا کے اندر جو واقعہ بھی پیش آتا ہے وہ اللہ کی طرف سے پیش آتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (السجدۃ:۵)

”وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔“

اس کائنات میں دن رات میں، جو چیز بھی پیش آ رہی ہے، وہ اللہ کے حکم اور اس کی

مشیت سے ہے۔ وہی اصل حکیم اور کارساز ہے۔ اگر زمین سے ایک کونپل بھی نکلتی ہے تو اللہ کی مرضی سے نکلتی ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اللہ کی تقدیر سے نکلتا ہے اور اگر ڈوبتا ہے تو اس کے حکم سے ڈوبتا ہے، ماں کے پیٹ میں ایک نجس قطرے سے انسانی بچہ جنم لیتا ہے اور اپنی لمبی عمر کو پہنچ کر مرتا ہے تو اللہ کی تقدیر سے ہی مرتا ہے۔ غرض کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اللہ کی تقدیر سے باہر ہو۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ اس کائنات میں اگر کوئی پتا بھی گرتا ہے تو وہ اس کے حکم سے گرتا ہے۔ ان کی تدبیر کو نافذ کرنے کا کام اس کے فرشتے کرتے ہیں، یہ وہ بات ہے، جسے قرآن مجید میں جگہ جگہ واضح کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ واقعہ حیرت انگیز واقعے سے پیش آیا یا عام حالات کے اندر پیش آیا، یہ بھی غور طلب ہے۔ اس لیے کہ ہمارے دور کے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ قریش نے خود بھی پتھر پھینکے تھے۔ اس کے بعد ایک آندھی آئی، جس طرح ہمارے ہاں آندھی آتی ہے اور اس آندھی نے پتھر لا کر پھینکنا شروع کر دیے اور یہ بھی ہے کہ ان پتھروں سے، جو بیماری پھیلی، وہ بھی جراثیم کا نتیجہ تھی۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو چیز بھی پیش آئی، کس طرح پیش آئی؟ یہ بات اگر بہت اہم ہوتی تو خود اللہ تعالیٰ اس کی وضاحت فرما دیتا۔ چوں کہ یہ بات اہم نہیں ہے کہ کس طرح واقعہ پیش آیا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت نے کس طرح کام کیا کہ اُس نے ایک عظیم لشکر کو، جو اس کے گھر کو مٹانے کے لیے آیا تھا اس کو تباہ و برباد کر دیا، اس لیے اس کی تفصیل اس سورۃ میں یہاں نہیں کی گئی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے اس میں تسلی کا سامان بھی ہے کہ جو دعوت آپؐ لے کر کھڑے ہوئے ہیں بالآخر وہ کامیاب ہوئی اور کوئی بڑی سے بڑی قوت اتنی بڑی قوت کہ جو خانہ کعبہ تک کو مٹانے کے لیے آئی تھی وہ بھی اللہ تعالیٰ نے برباد کر دی اور یہ دعوت کامیاب ہو کر رہی۔ لہٰذا کیسے بھی حالات ہوں، ظاہری ساز و سامان نہ ہو، دشمن کئی گنا طاقت ور ہو اور مظلومیت کا کیسا بھی دور ہو، لیکن اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان پختہ ہو اور انسان خدا کے بھروسے پر جدوجہد کرتا رہے، تو بالآخر جس خدا نے، جو پتھروں کا گھر ہے محفوظ فرمایا، تو وہ دعوت، جو قرآن مجید کی صورت میں اور اپنے نبیؐ کی صورت میں دنیا کو دے رہا ہے، اس کی حفاظت بھی اس کے ذمے ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بالآخر وہ دعوت کامیاب ہو کر رہی اور اس کے مخالفین کو بھی اللہ تعالیٰ نے چورا چورا کر دیا۔

اس سورۃ میں مشرکین مکہ کو غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ تم تجارتی قافلے چلا رہے ہو، ہر طرف سے رزق چلا آ رہا ہے۔ دشمن اُمڈ کے آیا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیسے محفوظ رکھا۔ یہ سب کچھ تم دیکھتے ہو لیکن کیا تم غور نہیں کرتے۔ لہٰذا تمہیں اس رب کی بندگی کرنی چاہیے، جو اس گھر کا بھی رب ہے۔ یہ وہ بات ہے، جو اس سے اگلی سورۃ میں بیان ہوئی ہے اور یہ دونوں سورتیں باہم جڑی ہوئی ہیں، مربوط ہیں اور ان میں ایک تسلسل ہے اور بات بھی تب ہی مکمل ہوتی ہے جب دوسری سورۃ کے ساتھ شامل ہو جائے۔

اس کے بعد پھر اس کے اندر، جو بات بہت واضح اور صاف ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے، جس لشکر کو برباد اور تباہ کیا اُس کو اس نے ایسا کر دیا کہ جیسے کھایا ہوا بھوسا ہو۔ چناں چہ لشکر بھی تباہ نہیں ہوا، بلکہ تین سال کے اندر ابرہہ کی پوری سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور یمن کے اندر اس کا نام و نشان تک بھی مٹ گیا اور دوسرے قبائل نے اس کو مغلوب کر لیا۔ یہ بھی اللہ کی ایک نشانی ہے اور یہ چیز بار بار دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ دنیا کے اندر اٹھتے ہیں اور بڑی قوت کے ساتھ اٹھتے ہیں مگر ان کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے اور وہ تاریخ میں عبرت کا نشان بن کر رہ جاتے ہیں۔

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ (حٰمٓ السجدة:۱۵)

''کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔''

یہ قرآن مجید نے قوم عاد کا دعویٰ نقل کیا ہے کہ ہم سے بڑھ کر طاقت ور کون ہے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عاد کے اوپر آندھی بھیجی اور آٹھ دن مسلسل ہوا چلتی رہی جو پتھر لائی، اولے لائی، برف لائی، جو کچھ بھی لائی، آٹھ دن میں ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ یہاں بھی اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے دنیا پر اور انسان پر یہ واضح کر دیا ہے کہ دراصل یہ کام جو ہوا اور جس طرح اس نے اس کو انجام دیا یہ اس نے اپنے دین کو مکمل کرنے کے لیے اور دین کو غالب کرنے کے لیے انجام دیا تھا۔

اس پوری سورۃ کے اندر بھی وہی اصولی بات صاف اور واضح ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہاں پر اپنا قانون بھی بیان فرمایا ہے، جو ہر زمانے کے لیے ہے اور یہ بات گزشتہ سورتوں میں بھی برابر کہی جا رہی ہے کہ کامیابی کا اصل معیار نہ دولت ہے نہ دنیا کی طاقت بلکہ ایمان اور عمل صالح

ہے وہ ایک ایسا معاشرہ ہے، جس میں لوگ ایک دوسرے کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کریں، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا فریضہ انجام دیا جارہا ہو، جہاں افراد اور معاشرہ ایمان اور عمل صالح پر قائم ہوں اور معاشرے کے اندر ایک دوسرے کی بھلائی اور خیر خواہی اور ایک دوسرے کو نیکی اور دین پر جم جانے کی تلقین پائی جائے۔ لوگ ایک دوسرے سے بے نیاز نہ ہوں، صرف اپنی ہی فکر نہ کریں بلکہ مالی اور مادی طور پر بھی ایک دوسرے کے غم خوار اور خیر خواہ ہوں اور نیکی کے لیے بھی ایک دوسرے کو اس پر قائم رکھیں۔ یہی دراصل کامیابی کی بنیاد ہے۔ ورنہ جو کچھ بھی انسان دولت جمع کرے اور جو کچھ طاقت جمع کرے گا، یہ سب کچھ جب آدمی قبر میں چلا جائے گا، ختم ہو جائے گا اور سب اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے ہے اور جس طرح وہ اپنا نظام حکمت چلا رہا ہے اس کے تحت وہ ختم ہو جائے گا۔

اس کے بعد اس سورۃ میں مال کا ذکر ہے۔ سورۃ الھمزۃ میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔

الَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّ عَدَّدَهٗ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ○ (الھمزۃ:۲،۳)

''جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔''

اس کو بھی چورا چورا کر دیا جائے گا۔ پس وہ جہنم کی آگ میں جائے گا۔

مال جمع کرنا اور گن گن کر رکھنا یہ ہر آدمی کا اپنا ذاتی فعل ہے اس لیے ہر آدمی اس انجام سے دوچار ہوگا اور یہ آخرت میں ہوگا۔ البتہ قوت اور طاقت کے بل پر دوسری قوموں کو مغلوب کرنا اور ظلم ڈھانا چوں کہ ایک قوم کا معاملہ ہے وہ اپنا انجام اسی دنیا میں دیکھ کر رہتی ہے۔ یہ بات پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ افراد اپنے حتمی انجام کو آخرت میں پہنچیں گے، لیکن قومیں اپنے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں دیکھ کر رہتی ہیں۔ اس کی مثال اصحابِ فیل کے واقعے کے اندر بیان کر دی گئی ہے۔ اس سورۃ کے اندر خانہ کعبہ کا مقام بھی واضح کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ خانہ کعبہ کی امانت، جو اللہ تعالیٰ نے امت کے سپرد کی ہے، اس کی حفاظت کرنا اور پھر اس کو دعوتِ دین کا مرکز بنانا یہ بھی اس امت کی ذمے داری ہے۔ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر برپا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اپنی ذمے داری کو پورا کرے اور اس کو ادا کرے۔

یہ سورۃ اپنے مقام پر ٹھیک وہی پیغام لے کر آرہی ہے، جو اس سلسلۂ بیان کے اندر اس جگہ پر فٹ ہوتا ہے اور اسی پیغام کو واضح کرتا ہے، جو شروع سے چلا آرہا ہے کہ دراصل آدمی کو

امتحان میں ڈالا گیا ہے کہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے اور اس کے ذریعے سے کامیابی اور فلاح حاصل کرے۔ اس کو نیکی اور برائی کی تمیز اسی لیے دی گئی ہے۔ لہٰذا جس نے اپنا تزکیہ کیا، نیکی کو اختیار کیا، وہی کامیاب ہوگا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (الشمس:۹،۱۰)

''یقیناً فلاح پا گیا، وہ جس نے تزکیہ کیا اور نامراد ہوا، وہ جس نے اس کو دبا دیا۔''

اس سلسلۂ بیان کی مختلف سورتوں میں، جو مختلف مضامین آئے ہیں، وہ سب کے سب ایک مرکزی موضوع پر مرکوز رہے ہیں کہ آدمی کی بھلائی اور اس کی کامیابی اللہ کی اُس قدرت کو پہچاننے میں ہے کہ وہ نیکی کا اچھا بدلہ دے گا اور برائی کا بدلہ برا دے گا۔ نیکی کو آدمی اختیار کرے اور برائی سے اپنے آپ کو بچائے۔ دنیا کے مال و دولت بھی آزمایش کے لیے ہیں اور قوت اور طاقت بھی آزمایش کے لیے۔ مال و دولت اپنی جگہ پر بری چیز نہیں ہے اور نہ قوت اور طاقت اپنی جگہ بری چیز ہے۔ یہ سب اس لیے ہیں کہ ان سب کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کر کے آدمی آخرت کے لیے نیک اعمال کمائے اور وہاں پر اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ٹھیرے۔

اس کے بعد حضوؐر کی کامیابی اور فتح کی خوش خبری بھی اس سلسلۂ کلام میں آئے گی اور آپؐ کے دشمنوں کی تباہی و بربادی کا ذکر بھی آئے گا۔ یہاں سے پھر اب قریش سے کلام شروع ہوتا ہے اور خاص طور سے اُن کا ذکر ہے۔ اس میں سب انسانوں کے لیے بھی ہدایت ہے اور قریش کے لیے بھی کہ تم پر جو اللہ کا احسان ہے، جس گھر سے تمھاری قیادت، سیادت اور تجارت وابستہ ہے اور عرب کے اندر تمھاری بالادستی قائم ہے، اس گھر کو مسمار کرنے کے لیے جب اتنا بڑا لشکر ہاتھیوں کے ساتھ آیا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی تدبیر سے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ اس گھر کے رب کی بندگی اور اطاعت کریں۔ رہتی دنیا تک، جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور اس کے گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں کعبے کی طرف جائیں اور اس کا حج کریں۔

یہ گھر بہت ساری نشانیوں کا بھی حامل ہے۔ اللہ کی بندگی کے لیے یہ پہلا گھر ہے، جو زمین پر بنایا گیا۔ اہل ایمان کے لیے حج فرض کیا گیا اور اسے مرکز رشد و ہدایت بنایا گیا ہے، جو کنکری مارنے کا فعل ہے، اس کے بارے میں بھی بہت سارے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ جو لشکر پر سنگ باری ہوئی تھی، یہ اسی کی نشانی ہے۔ یہ اُس کی نشانی ہو یا نہ ہو لیکن پتھر مارتے ہوئے یہ چیز کہ

اللہ تعالیٰ نے کنکروں کے ذریعے ایک پورے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا اور دین کی حمایت کے لیے اسلحہ اور ساز و سامان، جتنا ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ ایمان، تقویٰ اور عمل صالح کی ضرورت ہے، یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے۔

اگر غور کیا جائے تو حج جہاد سے مشابہ ہے۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ میری امت کی رہبانیت حج اور جہاد میں ہے۔ جہاد کے لیے، جو لوگ گھروں سے نکلتے ہیں، گھر بار چھوڑتے ہیں، کاروبار چھوڑتے ہیں، بیوی بچوں کو چھوڑتے ہیں اور اللہ کی رضا و خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض ان کے پیش نظر نہیں ہوتی، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جان تک دے دیتے ہیں اور حج کے موقعے پر اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہیں۔ جان، مال، قربانی اور بہت سی قربانیاں کرتے ہیں۔ گو اپنی جان تو قربان نہیں کرتے لیکن نشانی اور فدیے کے طور پر جانور قربان کرتے ہیں، اللہ کے گھر کا چکر لگاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کنکریاں مار کر اس رسم کو زندہ کرتے ہیں کہ کس طرح سے اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے لشکر بھیج کر اپنے گھر کے دشمنوں کو تباہ کر دیا تھا۔ یہ بھی جہاد ہے اور یہ نشانی بھی اسی سورۃ کے اندر موجود ہے۔

اس کے بعد آنے والی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو اپنی بندگی کی دعوت دی ہے، اس انعام کے سلسلے میں کہ اُس نے اُن کو دشمنوں کے خوف سے اور بھوک سے نجات دی۔ اگر وہ ان کو ان انعامات سے نہ نوازتا تو اُن کی تجارت نہ ہوتی اور عرب جہاں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی تھی، وہاں پر یہ ساری غذا اور رزق نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو سمجھنے کی اور اس کے مطابق امت کی تعمیر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆

سورۃ قریش

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○
لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ﴿۲﴾ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ
ھٰذَا الْبَیْتِ ﴿۳﴾ الَّذِیْٓ اَطْعَمَہُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۵ وَّاٰمَنَہُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

چوں کہ قریش مانوس ہوئے (یعنی) جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس، لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے امن عطا کیا۔

تشریح: یہ چھوٹی سی سورۃ چار آیات پر مشتمل ہے اور سورۂ فیل کے بعد قرآن مجید میں درج کی گئی ہے۔ سورۂ فیل میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس قوم سے خطاب فرمایا، جس سے خود نبی کریمؐ کا تعلق تھا اور جو قوم پیغامِ الٰہی کی پہلی مخاطب تھی اور جسے اس پیغام الٰہی کا علم بردار اور پیغام بر بن کے آنے والی دنیا تک اس پیغام کو پہنچانا تھا۔ یہ قریش کا قبیلہ تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی، جس کو اس نے بیتی ''میرا گھر'' فرمایا ہے، جس طرح حفاظت فرمائی اور اس پر ایک انتہائی طاقت ور دشمن کی طاقت کو، جس طرح سے اس نے پسپا کر دیا اور پارہ پارہ کر دیا، اس احسان کا ذکر فرمایا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے قریش کو، جو اس گھر کے پاسبان اور متولی تھے، اس کے قرب و جوار اور پڑوس میں رہتے تھے، امن و سلامتی سے نوازا اور دشمن کے خطرے اور خوف سے نجات دی۔

سورۂ قریش میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس انعام کا ذکر کیا ہے کہ اس نے قریش کو ایک ایسی جگہ رزق دیا اور پیٹ بھرنے کا سامان فراہم کیا جہاں کھیتی باڑی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، جسے حضرت ابراہیمؑ نے بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ (ابراہیم:۳۷) فرمایا تھا کہ جہاں پر کوئی چیز اُگتی نہیں تھی۔ اِن انعامات کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ نے اہلِ قریش کو اس گھر کے خدا کی بندگی کی دعوت دی ہے۔ اگرچہ اس کی یہ دعوت سب کے لیے عام ہے، اس لیے کہ نبی کریمؐ سارے انسانوں کی طرف اللہ کے نبی تھے۔ البتہ صرف یہی وہ واحد مقام ہے، جہاں پر قریش کا نام لے کر اُن سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ صرف اسی رب کی بندگی کریں، جو اس گھر کا رب ہے، جو گھر ان کی نگاہوں کے سامنے ہے، اور جو ان کی سلامتی، امن اور رزق کا ذریعہ بھی ہے اور ضامن بھی۔

بہت سے مفسرین نے تو یہاں تک بھی کہا ہے کہ سورۃ القریش دراصل سورۂ فیل کا ہی ایک حصہ ہے۔ کچھ لوگ اپنے صحیفوں میں بیچ میں بسم اللہ نہیں لکھا کرتے تھے۔ اس سے بھی لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مضمون کے لحاظ سے دراصل یہ ایک ہی سورۃ ہے۔ ان کے بیچ میں بسم اللہ کا لکھنا اور پڑھنا ضروری نہیں ہے مگر اس پر امت کا اجماع ہے کہ یہ سورۃ علیحدہ ہے لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے بالکل پچھلی سورۃ کا ایک حصہ ہے اور اس میں اسی کے مضمون کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ سورۂ فیل میں جس احسان کا ذکر فرمایا ہے یہاں پر بھی اس احسان کا ذکر تو کیا ہے، لیکن یہاں اس سے بڑھ کر قریش کو رزق رسانی، اُن کے مال و دولت اور ان کی خوش حالی کا، جو انتظام فرمایا اس کا ذکر کیا ہے۔ البتہ دعوت وہی بنیادی دعوت ہے: فَلْیَعْبُدُوْا (قریش:۳) پس ان کو چاہیے کہ وہ اسی کی بندگی کریں، اسی کی غلامی اختیار کریں اور ساری زندگی اسی کے سپرد کر دیں۔

قریش کا قبیلہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے بہت سارے بیٹے تھے۔ اُن میں سے ایک بیٹا، جس کا نام تورات میں بھی ہے اور بہت سارے صحیفوں کے اندر بھی ہے، وہ "قیدار" ہے اور اسی کی نسل سے آگے بڑھ کے قریش کا یہ قبیلہ بنا اور اسی قبیلے سے نبی اکرمؐ کا تعلق ہے۔ اِس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم قریش کے قبیلے کی تاریخ میں جائیں، بہر حال یہ قبیلہ خانہ کعبہ کا متولی تھا۔ قصی بن کلاب نبی کریمؐ سے چھے پشت اوپر آپؐ کے دادا تھے اور یہی وہ شخص تھے کہ جنھوں نے قریش کو جمع کیا اور مکہ میں ان کو متحد کیا اور ان کو عرب میں عزت اور سرداری کا مقام دلایا اور فی الواقع مکۃ میں ایک چھوٹی سی شہری ریاست قائم کی۔ انھوں نے حکومت کے

مختلف عہدے بنائے، شوریٰ کا نظام قائم کیا اور دار الندوہ قائم کیا، جہاں لوگ بیٹھ کر مشورے اور فیصلے کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ وہ مقام ہے جہاں سے قریش نے مکہ کے اندر سیادت اور مرکزی مقام حاصل کیا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک لوگ آتے رہے یہاں تک کہ حضورؐ کے دادا اور پردادا تک یہ سلسلہ پہنچا۔ حضورؐ کے پردادا ہاشم تھے اور آپؐ کا تعلق بنو ہاشم سے تھا۔

قریش کے قبیلے اور اہلِ مکہ اور مکہ کو اس پورے خطے کی تجارت میں دو ہزار سال قبل مسیح سے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہ مشرق و مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بھی تھا۔ توراۃ میں اور یونانیوں کی تاریخی اور بہت ساری قدیم کتابوں میں مکہ کا ذکر موجود ہے۔ توراۃ کے اندر اس کا نام بکّہ کے طور پر آتا ہے، وادی بکّا۔ قرآن مجید میں بھی اس نام کو استعمال کیا گیا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران:۹۶)

”بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ، جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے، جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔“

دراصل مکہ، جو اللہ کا پہلا گھر تھا، تجارتی طور پر عرب میں اور اس زمانے کی، جو معروف تجارت تھی اس کے اندر ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ تاریخی کتب سے یہ ثابت ہے کہ ہندستان سے اور اس کے ماوراسے مختلف چیزیں عرب پہنچتی تھیں۔ بحری راستا بھی اُن کے پاس تھا اور برّی راستا بھی اور یہاں سے عرب تجارتی مال وصول کر کے اس کو آگے بڑھاتے تھے۔ یہ سامان شام اور وہاں سے یورپ تک جایا کرتا تھا۔ یہ اُن پر اللہ کی طرف سے کوئی نیا انعام نہیں تھا بلکہ یہ سلسلہ تو عرصے سے چلا آرہا تھا اور اس خطے کی تمام تاریخوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ عموماً مسالے، کپڑے، سونا، چاندی، موتی اور مختلف قسم کے سامان یہ لے جایا کرتے تھے اور اس بات کا قیاس کرنا مشکل نہیں کہ یہ سامان ہندستان تک سے آیا کرتا تھا۔ اس لیے کہ بہت سارے مسالے ان کے نام عربی نہیں بلکہ ہندی ہیں۔ بہت سارے کپڑے، جن کا رواج عرب میں ہے اُن کے نام بھی عربی نہیں بلکہ ہندی میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان سے مسالے بھی آتے تھے اور کپڑے بھی۔ اس کے بدلے میں یہ لوگ اپنے لیے وہاں سے اناج، غلہ، کپڑا، ہتھیار اور چراغ

وغیرہ درآمد کرتے تھے۔ یہی ان کی درآمدات اور برآمدات تھیں۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کی سب چیزیں ہندستان سے ہی آتی تھیں بلکہ خود عرب میں بھی زرخیز علاقے موجود تھے۔ یمن میں سبا کے بند (ڈیم) کا ذکر قرآن مجید نے خود فرمایا ہے۔ قبل مسیح (آج سے تقریباً دو ہزار دو سو سال پہلے) کی یونانیوں کی تاریخ میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے کہ وہاں جہاز اترتا تھا اور مسالوں کی اتنی بہترین خوشبوئیں آتی تھیں کہ ہر شخص محسوس کرتا تھا۔ سونے کی بے شمار کانیں بھی عرب کے اندر تھیں اور اب بھی دریافت ہوئی ہیں۔ ابھی تو صرف پٹرول نکالا جا رہا ہے، لیکن معدنیات کی بے شمار کانیں بھی ہیں کہ جن کو ابھی تک TAP نہیں کیا گیا ہے۔ اُس زمانے میں سونا بھی ان کے ہاں تھا لیکن وہ باہر سے بھی لاتے تھے اور خود بھی فراہم کرتے تھے۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر لے کر آتے جاتے تھے۔ یہ ایک اہم تجارتی شاہراہ تھی۔

اِس خطۂ زمین پر، جو بھی فاتح بن کر آیا اس کی نگاہ اسی پہلو پر رہی کہ زرخیز تجارت پر اس کا قبضہ ہو۔ چناں چہ اگر یمن کے حکمراں ہوئے تو انھوں نے چاہا کہ حجاز پر ان کا قبضہ ہو، اگر ایرانیوں کا غلبہ ہوا تو انھوں نے چاہا کہ حجاز پر ان کا غلبہ ہو، اور اگر یونانی آئے یا رومیوں نے اپنی حکومت قائم کی اور ہندستان میں بھی جب سکندر آیا اور یونانی آئے تو انھوں نے بھی یہی چاہا کہ اس علاقے پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ لیکن یہ دنیا کا وہ واحد علاقہ ہے، جو کبھی مفتوح نہیں ہوا اور کبھی کسی غیر قوم نے آ کر اس پر قبضہ نہیں کیا۔ اللہ نے اس خطے کو جو امن بخشا ہے اس کی ایک علامت تو یہ ہے کہ سب کی نگاہیں اس پر پڑتی رہیں، سب نے کوششیں کیں، سب نے اس کے منصوبے بنائے کہ اس کی تجارت پر قبضہ کریں لیکن کوئی بھی مکہ اور حجاز پر باہر سے آ کر قبضہ نہ کر سکا۔

عربوں کی یہ تجارت قدیم دور سے چلتی آ رہی ہے۔ بحرین کے تاجر اتنے پرانے ہیں کہ شاید یونان میں، جتنا بھی فلسفہ اور علم پہنچا وہ انھی کی وجہ سے پہنچا۔ عرب تاجروں کی تجارت کے حوالے سے تحقیقی طور پر بہت سے پہلو سامنے آ چکے ہیں اور جب کبھی یہ تحقیق مکمل ہوگی (اس کے آثار بھی موجود ہیں) تو یہ معلوم ہوگا کہ شاید سب سے ابتدائی زبان عربی ہے اور سب سے پہلے انسان کسی خطے میں اگر آباد تھا تو وہ عرب کا خطہ تھا۔ قدیم ترین ڈھانچے، جو آج سائنس دانوں نے کینیا میں دریافت کیے ہیں وہ عرب کے سامنے واقع حبشہ کے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر تہذیب وتمدن کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو عربی اور عرب خطے کی تائید قرائن وآثار کرتے ہیں۔

قرآن نے بھی کہا کہ اللہ کی بندگی کے لیے، جو پہلا گھر انسانوں کے لیے بنایا گیا وہ مکہ کے اندر ہے۔ اسی لیے اس سورۃ میں ھٰذَا الْبَیْتِ (قریش: ۳) ''اس گھر کی'' کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہاں محض اشارہ کیا گیا ہے، اس لیے کہ گھر سامنے موجود تھا۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ جب خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے تو آپؓ نے اس سورۃ کی تلاوت کی تو اپنی انگلی سے ھٰذَا الْبَیْتِ کہہ کر نماز کی حالت میں خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کیا کہ دراصل یہ وہ گھر ہے۔ اسی گھر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قریش کو اور مکہ کو یہ سارے امتیازات بخشے اور ان کو ان تمام انعامات سے نوازا۔

اللہ کا یہ پہلا گھر بھی کچھ ایسی خصوصیات کا حامل ہے کہ جن خصوصیات کی حامل کوئی اور عبادت گاہ نہیں ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ سب سے نمایاں اور ممتاز ہے۔ یہ ان معنوں میں منفرد ہے کہ اس گھر کی طرف کثرت سے لوگ ہزاروں برس سے آرہے ہیں۔ قرآن نے اسے پہلا گھر اِن معنوں میں بھی کہا ہے کہ پہلے ہزاروں، لاکھوں، پھر کروڑوں اور اب ایک ارب سے زائد انسان دنیا کے چاروں طرف سے اس طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔ تاریخی طور پر بھی ہمارے مؤرخین یہی کہتے ہیں۔ قرآن جس پر شاہد ہے وہ یہ کہ یہ گھر سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ نے بنایا تھا۔ حضرت آدمؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اسے انھی پرانی بنیادوں پر اللہ کے حکم سے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ کسی اور گھر کے بارے میں، اُس کے متولی یا اُس کے اندر پرستش کرنے والے یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ خدا کے حکم سے بنایا گیا ہے۔ کوئی مندر ہو یا گرجا یا کوئی اور معبد، اسے کس نے بنایا ہے؟ یا بنانے والے کون تھے؟ عموماً اس کے بارے معلوم نہیں ہوتا۔ خانہ کعبہ کو بنانے والے کتنے عظیم الشان اشخاص تھے اس کی طرف خود قرآن نے اشارہ کیا ہے:

وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ط (البقرہ: ۱۲۷)

''اور یاد کرو، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔''

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جیسے لوگ اس کے معمار تھے۔ انھوں نے راج کا کام خود کیا، خود پتھر اٹھا کر رکھتے تھے اور خود مسالہ لگاتے تھے۔ ہیکل سلیمانی بھی بیت المقدس میں اللہ کے حکم سے بنا تھا۔ اس کو بنانے والے غلام تھے اور وہ کاری گر تھے، جن کو حضرت سلیمانؑ

نے جگہ جگہ سے بلا کر کام پر لگایا تھا۔ البتہ کسی اور مندر، گرجا، یا معبد کو یہ شرف حاصل نہیں ہے کہ اس کے لیے پتھر اور اینٹیں اللہ کے دو جلیل القدر نبیوں نے اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوں۔

دنیا میں جتنے بھی گھر خدا کے نام سے منسوب ہیں وہ سب گھر برباد ہوئے ہیں، مسمار ہوئے ہیں، مٹے ہیں اور ایک کی جگہ دوسرا بنایا گیا ہے، لیکن خانہ کعبہ ہزاروں سال سے اپنی جگہ پر قائم ودائم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کو تقریباً چار ہزار سال ہو گئے ہیں، خانہ کعبہ کو آپس کی لڑائی میں شاید کچھ نقصان پہنچا ہو، یا سیلاب سے بھی کچھ حصہ گر گیا ہو لیکن ہیکل سلیمانی کی طرح یہ نہیں ہوا کہ پورا گھر دشمنوں نے جلا کر راکھ کر دیا ہو اور آج اس کی صرف ایک دیوار، دیوارِ گریہ نشانی کے طور پر باقی رہ گئی ہو۔ اس کے علاوہ کسی اور مذہب کے پاس ایسا کوئی گھر موجود نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ ہے۔ اِسی لیے تو قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ یہ سارے انسانوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے، برکت والا گھر ہے اور یہ اللہ نے سب سے پہلے انسان کی بندگی کے لیے بنایا ہے۔

قریش کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ اِس گھر کے متولی تھے اور قریش ایک موحد پیغمبر، جو سلسلۂ توحید کے امام عالی مقام ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اگر چہ اُن کے درمیان کوئی نبی نہیں آیا تھا لیکن ایک عرصے تک وہ توحید پر قائم رہے۔ بہ تدریج انھوں نے اُسی گھر کو، جو خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا تھا، اس کے کونے کونے میں لاکر بت رکھ دیے لیکن انھوں نے اللہ کا انکار نہیں کیا تھا۔ وہ اِس بات کو مانتے تھے کہ یہ بت تو ضرور ہیں اور یہ ہمارے لیے وسیلہ ہیں لیکن اصل خدا اللہ ہی ہے اور وہی حقیقی رب ہے۔ اُس کا انھوں نے انکار نہیں کیا تھا۔ قرآن مجید نے بار بار یہ سوال کیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کس نے ان کو پیدا کیا؟ وہ کہیں گے کہ ''اللہ نے۔'' کون ہے، جو انھیں رزق دیتا ہے؟ کہتے ہیں ''اللہ۔'' ہر چیز کے جواب میں یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ہی خالق و مالک اور رازق ہے اور وہی رب ہے۔ گویا وہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن مجید نے اللہ کا لفظ کوئی نیا ایجاد نہیں کیا بلکہ یہ لفظ تو عرب کے اندر معروف تھا۔ صوم و صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج اور اس کے مناسک، یہ ساری چیزیں قرآن مجید نے نئی وضع نہیں کی تھیں بلکہ یہ انہی اہل عرب کے درمیان معروف تھیں۔ اس لیے کہ وہ دین کا ایک حصہ اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے لیکن آہستہ آہستہ جیسا کہ قرآن مجید نے بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے رب کی بندگی کے اندر

دوسروں کو شریک بنالیا۔ اس کے اختیارات میں، اس کی صفات میں بھی اور اس کی نفع نقصان پہنچانے کی طاقت میں بھی اور کہیں انھوں نے بتوں کو وسیلے اور واسطے کے طور پر شریک کرلیا کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلاَّ لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر:٣) ''ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں۔'' ان کے خیال میں واسطے کے بغیر وہ خدا تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس طرح بہت سارے بت تھے، جو انھوں نے لاکر وہاں پر رکھ دیے تھے۔

جب کسی امت میں نبی آتا ہے یا مبعوث ہوتا ہے تو وہ کچھ باتوں کو ختم کر دیتا ہے، کچھ کو برقرار رکھتا ہے اور کچھ کا اضافہ کر دیتا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو چیزیں صحیح ہوتی ہیں اُن کو برقرار رکھتا ہے، جو چیزیں غلط ہوتی ہیں ان کو مسترد کر دیتا ہے اور جو چیزیں اصلاح پزیر ہوتی ہیں اُن کی اصلاح فرماتا ہے۔ نماز کا طریقہ، زکوٰۃ کا طریقہ، حج کا طریقہ اور مناسک، جو قریش میں رائج تھے قرآن مجید نے ان کی اصلاح فرمائی اور جو شرک پیدا ہو گیا تھا، جو دراصل ساری خرابیوں کی جڑ تھا، اس کی تردید کی اور ایک خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دی۔ بظاہر یہاں مخاطب تو قریش ہیں لیکن اُن کے واسطے سے درحقیقت سارے انسان مخاطب ہیں۔ اگرچہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور ہم سب یا سارے انسان خانہ کعبہ کے متولی نہیں ہیں لیکن ایک حوالے سے سب انسان اِس کے مخاطب ہیں۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (قریش:١)

''اس واسطے کہ مانوس کیا گیا قریش کو۔''

لِ کے معنی عربی میں ''واسطے'' کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ ''تعجب'' سے بھی کیا ہے: دیکھو تو، کتنے تعجب کی بات ہے، کس طرح قریش کو مانوس کرلیا گیا۔ اِیْلٰف کا لفظ ''الفت'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ الفت کا لفظ ہمارے ہاں محبت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں یہ مانوس کرنا، خوگر کرنا، سہل کرنا، آسان کرنا، کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا اندازِ بیان ہے کہ وہ پہلے یہ نہیں کہتا کہ کس چیز سے مانوس کر دیا تاکہ توجہ کھینچی جاسکے، تجسس پیدا ہو اور مزید جاننے کی خواہش اور طلب پیدا ہو سکے۔ یہ اس کا ادبی اسلوب ہے اور تصویر کشی کا ایک منفرد انداز ہے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کا ایک ترجمہ یہ ہے کہ جس وجہ سے قریش کو مانوس کر دیا گیا۔ لیکن

لِاِیْلٰفِ کے معنی صرف مانوس کرنا کے نہیں ہیں۔ علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں اس کی تشریح کی ہے کہ اگرچہ امت کا اجماع تو یہی ہے، اور اکثر مفسرین کے نزدیک اِس کے معنی مانوس کرنے کے ہی ہیں لیکن اس کا ایک غریب ترجمہ یا معنی ''ٹریڈنگ لائسنس'' کے بھی ہیں۔ جس طرح تجارتی پروانے جاری کیے جاتے ہیں اور پسندیدہ حکومت قرار دیا جاتا ہے اور درآمد، برآمد کے پرمٹ جاری ہوتے ہیں، یہ لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے مغلیہ دور میں بھی یہ پروانے دیے جاتے تھے۔ انگریزوں نے مغل شہنشاہوں سے پروانے لے کر ہی تجارتی کمپنیاں قائم کی تھیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ اور بہت سارے لوگوں نے کہا ہے کہ اِیْلٰفِ کا لفظ دراصل یہاں اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ یہ اُن اجازت ناموں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو قریش نے مختلف حکومتوں سے حاصل کیے تھے تاکہ وہ اپنے تجارتی کارواں لے کر اُن کی حدود میں داخل ہوسکیں اور ٹیکس دینے سے مبرّا رہیں اور وہ اپنے مال وہاں پر حفاظت سے بیچ سکیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضوؐر کے پردادا ہاشم نے جب دیکھا کہ بحری راستے پر تو رومیوں نے قبضہ کرلیا ہے تو انھوں نے سوچا کہ بری راستہ جو بحرِ احمر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اس پر تجارت ہمارے قبضے میں آسکتی ہے۔ وہ چار بھائی تھے۔ چار بھائی مل کر آس پاس کی حکومتوں کے پاس گئے۔ اس زمانے میں حبشہ کی حکومت تھی، یمن کی حکومت تھی اور شمال میں شام اور مصر کی حکومتیں تھیں۔ اِن کے حکمرانوں سے انھوں نے تجارتی معاہدے کیے۔ چناں چہ علامہ آلوسیؒ کے نزدیک اِیْلٰف کے معنی یہ ہیں کہ معاہدہ ہوا، تجارتی معاہدہ ہوا۔ قرآن نے بھی دراصل اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ دیکھو! قریش کے لیے کس طرح سے ہم نے تجارتی کاروانوں کے لیے معاہدے کروا دیے اور اُن کو ہر طرف امن اور سکون کے ساتھ آنے جانے کی اجازت مل گئی۔ یہ کس چیز کے لائسنس تھے اور کس چیز کے پروانے تھے اور یہ اگر مانوس کے معنوں میں آیا ہے تو کس چیز سے مانوس کردیا؟ یہ قرآن مجید کا اندازِ بیان ہے کہ پہلی آیت میں وہ کھول کے نہیں بیان کرتا تاکہ ذہنوں میں تجسس پیدا ہو اور سننے والا متوجہ ہو اور اُس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کس چیز کا ذکر کیا جارہا ہے۔ قریش تو اس سے واقف تھے اور اُن کو چونکانے کے لیے، اُن کے ذہنوں پر نقش کرنے کے لیے دوسری آیت میں اس بات کو کھول دیا گیا۔

اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿ (قریش:۲)

''جاڑے اور گرمی کے سفروں سے مانوس ہوئے۔''

مانوس کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی مشیت اور مرضی سے قریش کو سردی، جاڑے میں اور گرمی میں مختلف حکومتوں سے تجارتی کاروانوں کے سفر کرنے کے لیے اجازت نامے حاصل ہوگئے اور یہ تجارتی کارواں سارا سال آنے جانے لگے۔ اس طرح ایک وسیع تجارتی سلسلہ شروع ہوگیا۔ چوں کہ شمال کے علاقے ٹھنڈے تھے اور شام کی طرف بڑی سخت سردی پڑتی تھی، برف باری بھی بعض علاقوں میں ہوتی ہے، چناں چہ گرمیوں میں وہ شمال کی طرف جاتے تھے، جب کہ یمن کی طرف کے علاقے گرم تھے، اِس لیے سردیوں میں یمن کی طرف جاتے تھے جہاں ہندستان تک سے مال آیا کرتا تھا اور یہاں سے مال یورپ کو جایا کرتا تھا۔ مصر کے راستے اور مصر سے پھر اسکندریہ کی بندگارہ پر جہازوں پر سوار ہوکر یورپ تک یہ مسالے، کپڑے اور خوشبوئیں عربوں کے واسطے سے پہنچتی تھیں۔ اُن کو اس سفر کی سہولت دی گئی تھی۔ اس سہولت کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ بات صرف اتنی نہیں تھی کہ آس پاس کی حکومتوں نے اُن کو تجارت کے لائسنس دے دیے تھے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ چاروں طرف لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ کوئی قافلہ بھی امن کے ساتھ نہیں گزر سکتا تھا جب تک کہ وہ ڈاکوؤں کو ٹیکس ادا نہ کرے یا ایک مقررہ حصہ نہ دے۔ کسی کی جان و مال سلامت نہیں تھی۔ لوگ اغوا کر لیے جاتے تھے، ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جاتے تھے۔ قرآن نے بار بار اس طرح اشارہ کیا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ

(العنکبوت:۶۷)

''کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنا دیا ہے۔ حالاں کہ اِس کے گرد و پیش سے لوگ اُچک لیے جاتے ہیں۔''

ان حالات میں کوئی قافلہ سلامتی کے ساتھ نہیں گزر سکتا تھا۔ البتہ یہ معاملہ قریش کے ساتھ نہیں تھا۔ خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے سارے عرب میں قریش کا احترام پایا جاتا تھا۔ اُسی خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے، جو اللہ واحد کی بندگی کے لیے بنایا گیا تھا اور جہاں قریش نے بہت سے بت لا کر سجا دیے تھے۔ عرب کے سارے طول و عرض میں ان کا احترام پایا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں آج بھی کوئی آدمی کتنا ہی بد دین ہو لیکن اگر کسی مزار سے اس کی

وابستگی ہے تو اس مزار کے مجاور ہونے کی نسبت سے اس کا احترام کیا جائے گا۔ قریش تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے اور پھر خانہ کعبہ، جو اہل عرب کا مرکز تھا، اس کے وہ متولی تھے۔ اسی خانہ کعبہ کی وجہ سے عربوں کو دنیا کے اندر عزت حاصل تھی۔ چناں چہ ہر جگہ ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ حتی کہ ڈاکو بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اس لیے قریش کا قافلہ کبھی نہیں رُکتا تھا۔ دوسری طرف حرم کے اندر تو امن تھا ہی اور کوئی باہر کا دشمن اس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ آج تک ہزاروں سال کی تاریخ میں خانہ کعبہ پر کبھی حملہ نہیں کیا گیا اور اگر کبھی کوئی حملہ کیا بھی گیا تو وہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ فیل کی طرح پسپا کر دیا۔

اس وجہ سے حرم کے چاروں طرف قریش کے قافلے امن وامان سے اور بحفاظت سفر کرتے تھے۔ اللہ نے ان پر یہ اِیلٰف کیا، یہ سہولت انہیں فراہم کی کہ سارے عرب کے قبیلے اُن کا احترام اور عزت کرتے تھے۔ یہ دراصل اُن کی رزق رسانی کا سامان تھا۔ وہ خوش حال لوگ تھے، تاجر تھے، تجارت کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کارواں اور تجارتی قافلے چلا کرتے تھے۔ حضورؐ بھی یہ قافلے لے کر جاتے تھے۔ سارے عرب کے مرد اور عورتیں اس میں اپنا سرمایہ لگایا کرتے تھے اور مضاربت اور شراکت کا کاروبار ہوتا تھا اور سامان بیچ کر نفع سب کے درمیان تقسیم ہوتا تھا۔ یہ دراصل تجارتی شاہراہ تھی اور یہی قریش کی معاشی شاہ رگ بھی تھی۔

قرآن نے دو جگہ اس کے لیے اِمَامٌ مُّبِیْنٌ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (یٰسین: ۱۲) یعنی کھلی کتاب، اور دوسری جگہ کہا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٌ (الحجر: ۷۹)، یعنی کھلی شاہراہ۔ مکہ سے شام اور مصر سے عراق جاتے ہوئے یہ علاقہ راستے میں پڑتا ہے، جس پہ بے شمار بستیاں آباد ہیں، قومِ لوط کی بستی اور مختلف بستیاں اور اس پر اللہ کی بے شمار نشانیاں بھی ہیں۔ جب حضورؐ مدینہ پہنچے اور آپؐ نے قریش کے خلاف اپنی جنگی حکمت عملی مرتب کی تو آپؐ نے سب سے پہلے اسی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کی اور اس کے گرد رہنے والے قبائل، حتی کہ کافر قبائل سے بھی معاہدے کیے اور ان کو اپنا حلیف بنایا تاکہ قریش کی، جو معاشی شاہ رگ ہے اس پر آپ کا کنٹرول ہو جائے۔ آپؐ کی جو جنگی حکمت عملی تھی اس میں اسی امام مبین کا حصہ ہے۔

یہ امام مبین کھلا راستہ تھا، جو اللہ تعالیٰ نے قریش کے لیے کھول دیا تھا۔ اس کی تاریخ قرآن نے خود بیان کی ہے کہ یہ ایک ایسی وادی تھی، جہاں نہ پانی تھا اور نہ زراعت تھی بلکہ ایک

بنجر، ویران اور بے آب و گیاہ وادی تھی۔ خدا نے اسے آباد کر دیا۔ اللہ کے حکم سے آبِ زم زم کا چشمہ پھوٹ پڑا، جس سے ہزاروں سال سے لوگ پانی پی رہے ہیں اور پیتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ خشک نہیں ہوا۔ یہ اللہ کا ایک معجزہ اور انعام تھا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُس دعا کا نتیجہ تھا، جس میں آپ نے اللہ سے درخواست کی تھی:

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراھیم: ۳۷)

"پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لیے کیا کہ یہ لوگ نماز قائم کریں۔"

اس سے محض دو رکعت کی نماز کا قیام مراد نہ لیا جائے اگرچہ یہ بھی اس میں آتا ہے۔ درحقیقت نماز اللہ کی بندگی کی ایک علامت ہے۔ انسان اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دیتا ہے، اس کے آگے اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے، اس کے قدموں میں گر جاتا ہے، پیشانی ٹیک دیتا ہے اور زبان سے اس کی تعریف کرتا ہے۔ نماز دراصل پوری بندگی کا چھوٹا سا عملی نمونہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی دعا فرمائی تھی:

فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ (ابراہیم: ۳۷)

"لہٰذا لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا۔"

اس کے نتیجے میں لوگوں کے دل اہلِ قریش کی طرف اس طرح جھک گئے تھے کہ جب وہ مکہ سے باہر جاتے تھے تو اُن کا احترام ہوتا تھا اور لوگ کونے کونے سے ان کی زیارت کو آتے تھے۔ احادیث سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے اور تاریخ سے بھی کہ تقریباً سارے انبیاء علیہم السلام نے خانہ کعبہ کا حج کیا ہے۔ حضورؐ جب آخری حج پر تشریف لے گئے تو ایک جگہ سے آپؐ گزرے تو آپؐ نے کہا کہ اس وادی کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ "وادی ازرق" ہے۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میرے بھائی یونس اونٹنی پر سوار ہیں، ان کے گھنگھریالے بال ہیں اور وہ احرام باندھے لبیک کہتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح اور جگہ بھی آپؐ نے مختلف پیغمبروں کی طرف اشارہ فرمایا۔

خانہ کعبہ ایک ایسی جگہ تعمیر کیا گیا جہاں کوئی پھل نہیں پیدا ہوتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقعے پر اللہ سے یہ دعا بھی کی:

وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ (ابراہیم:۳۷)

''اوران کو پھلوں کا رزق دے۔''

اس وقت تو اس وادی میں کوئی پھل پیدا نہ ہوتا تھا البتہ طائف کی وادی میں انگور اور انار پیدا ہوتے تھے۔ اب وہاں پر برسوں سے دنیا کا کوئی پھل ایسا نہیں ہے، جو نہ ملتا ہو۔ آم، لوکاٹ، انجیر، جو پھل بھی ہو وہ مکے کے اندر ملتا ہے۔ مکہ کے اندر کبھی غذا کی قلت نہیں ہوئی۔ ہزاروں سال سے یہ نظام موجود ہے اور پھر اللہ نے اپنے انعام کو یوں عام کیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ رزق فراہم کریں اور اللہ نے وعدہ فرمایا کہ ہاں، فراہم کروں گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں تخصیص کی کہ جو ایمان لائیں آپ ان کو تو رزق دیں لیکن کافروں کو محروم کر دیں۔ اس پر اللہ نے فرمایا: دنیا کا رزق تو سب کے لیے ہے، ایمان لانے والوں کے لیے بھی ہے او رکافروں کے لیے بھی۔ یہ سب کو ملے گا لیکن لوگوں کے اعمال کے نتائج تو آخرت میں برآمد ہوں گے۔ دنیا میں کفر کی سزا نہیں ملے گی، میں آخرت میں اُن کو سزا دوں گا۔ یہ ابراہیمؑ کی دعا تھی، جسے اللہ نے شرفِ قبولیت بخشا۔

اِس شہر کو ایک عورت نے بسایا تھا۔ حضرت ہاجرہ شاہِ مصر کی بیٹی تھیں اور ایک شہزادی تھیں۔ شاہِ مصر نے ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کیا تھا۔ اُن کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ، اُن کے پہلے بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ وہ اکیلی اپنے اس شیر خوار بچے کے ساتھ آ کر اس گھر کے پاس آباد ہوئیں اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کو چھوڑ کر وہاں سے چلے تو انھوں نے پوچھا کہ وہ اُنھیں کس کے بھروسے پر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: عَلَى اللّٰه، اللہ پر۔ اس پر انھوں نے فرمایا: حسبی، پھر تو وہ میرے لیے کافی ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں اور ایک دوسری روایت میں فَإِنَّ اللّٰهَ لَنْ يُّضِيعَنَا یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کرے گا، برباد نہیں کرے گا، ہلاک نہیں کرے گا اور ایسے ہی ہوا۔ شہر تو بہت سارے دنیا میں موجود ہیں، مٹتے بھی رہے اور خاک کے نیچے دفن ہوتے رہے، جیسے موہن جوڈورو، جس کے آثار ابھی بھی موجود ہیں۔ بڑے بڑے شہنشاہوں نے بے شمار کاری گر لگا کر شہر بسائے لیکن یکہ وتنہا

اُس عورت کا بسایا ہوا یہ شہر اپنی جگہ اسی طرح سے ہزاروں برس سے سلامت ہے۔ یہ بھی دراصل اس لیے ہے کہ وہاں پر اللہ کا گھر موجود ہے اور اسی کی وجہ سے یہ ساری نعمتیں قریش کو حاصل ہوئیں اور اُن کے نصیب میں ہوئیں۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ○ (قریش:۳)

''لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں۔''

رب کے معنی بنیادی طور پر پرورش کرنے والے کے ہیں۔ ''ربوبیت'' پرورش کے معنوں میں آتا ہے۔ عربی کے اندر سردار اور آقا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ رَبَّ هٰذَا الدَّارِ اس گھر کا رب، یعنی گھر کا مالک یا صاحب خانہ۔ شوہر کے لیے بھی رب کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسے گھر کے سردار کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگر رب کا نام بغیر کسی اضافت کے آئے تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے لیے آتا ہے۔ لیکن اگر رب کے نام کے ساتھ اضافت لگ جائے، جیسے رَبِّ الدَّارِ تو پھر یہ انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

سردار، آقا اور رب وہی ہو سکتا ہے، جو فی الواقع پرورش کرتا ہے اور جو ہر چیز فراہم کر رہا ہے۔ لہٰذا اُسی کی غلامی اختیار کرنی چاہیے۔ غلام کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ آقا کون ہے، رزق کون فراہم کر رہا ہے اور پھر صرف اسی کی بندگی اور اسی کی غلامی اختیار کرے۔ درحقیقت دنیا کے اندر رزق کی فراہمی تو وہی کر سکتا ہے، جس کے دستِ قدرت میں دنیا کی ہر طاقت ہو۔ اگر کوئی طاقت بھی اس کے اختیار سے باہر ہوگی تو وہ رزق نہیں پہنچا سکتا۔ گیہوں کا ایک دانہ بھی اگر انسان کے منہ تک پہنچتا ہے، جیسے کسان کھیت سے اُٹھا کر لے کر آتا ہے، تو وہ بھی صرف وہی قوت پہنچا سکتی، جس کے اختیار میں سورج ہو، جو سمندر پر چمکے اور پانی کو بادل بنا کر اٹھائے، جس کے حکم سے ہوائیں پانی کو لے کر جگہ جگہ برسائیں۔ جس کے حکم سے زمین پانی کو ذخیرہ کرے، کہیں سطح زمین پر بہادے، کہیں زیرِ زمین آبی ذخیرے کے طور پر محفوظ کر لے۔ کہیں دریاؤں میں بہادے، کہیں جھیلوں میں محفوظ کر دے اور جس کے تابع بیج کی روئدگی ہو۔ تب کہیں جا کر ایک دانہ گیہوں کا انسان کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ جس کے دستِ قدرت میں کائنات کی یہ ساری قوتیں ہوں، اسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ رزق فراہم کر سکے۔ لہٰذا رب کے معنی ایک بااختیار ہستی کے بھی ہیں کہ جو اِس دنیا کی ہر قوت کی مالک ہے اور جس کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں

کوئی قوت نہیں ہے۔ چناں چہ بندگی کے اندر صرف پرستش کے معنی ہی نہیں ہیں بلکہ اطاعت کے معنی بھی آتے ہیں۔ یہاں یَعْبُدُوْا یعنی تم سب بندگی کرو، کا مطالبہ صرف یہ نہیں ہے کہ محض پرستش کرو، اس کے آگے پیشانی ٹیک دو، اس کے نام کی مالائیں جپتے رہو بلکہ مراد یہ ہے کہ صرف اُسی کی غلامی اختیار کرو۔ صرف اسی کی اطاعت کرو، جو سردار اور آقا بھی ہے اور جس کے علاوہ کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔

انسانی زندگی نفع اور نقصان کی امید کے تانے بانے سے بنتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو نفع کا لالچ اور اس کی جستجو اور نقصان کا خوف اور اس سے بچنے کی ساری انسانی کوششیں، دنیا کی تگ و دو دراصل انہی دو چیزوں کے لیے ہوتی ہیں۔ چوں کہ نفع نقصان کا مالک بھی وہی ہے، اختیار بھی اسی کے پاس ہے، لہٰذا نفع نقصان کی امید اس کے علاوہ کسی اور سے باندھنا جائز نہیں۔ چاند ستارے ہوں یا درخت، یا انسان، کسی کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ یہ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں، یہ بھی شرک ہے۔ اسی لیے ان معنوں میں فرمایا کہ یَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ (قریش:۳) یعنی جس گھر کی وجہ سے اور جس گھر کے رب کی وجہ سے تم کو یہ ساری سہولتیں بہم پہنچی ہیں، لہٰذا تم صرف اسی کی بندگی اختیار کرو۔

اَلَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (قریش:۴)

”جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے امن عطا کیا۔“

اگر دیکھا جائے تو نفع و نقصان اور تحفظ، سب سے بڑھ کر یہی دو بنیادی چیزیں ہیں، جن کی انسان کو ضرورت ہے۔ خوف کے مفہوم میں ہر وہ چیز ہے، جو انسان کو نقصان پہنچا سکتی ہو اور اس سے وہ ڈرتا ہو۔ بجلی کڑکے تو وہ سمجھتا ہے کہ گر جائے گی، اس لیے اس سے ڈرتا ہے، اس کے آگے سجدہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر گائے دودھ دے رہی ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ چوں کہ اس سے مجھے نفع پہنچ رہا ہے لہٰذا اُس کو بھی وہ اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ اس طریقے سے نفع اور نقصان کی بنیاد پر انسان بہت ساری چیزوں کو معبود بناتا چلا جاتا ہے۔ نفع کے بہت سے پہلو ہیں لیکن سب سے اہم پہلو بھوک اور افلاس کا ہے۔ اگر پیٹ نہ بھرے تو آدمی ہلاک ہو سکتا ہے، جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا پیٹ، جو اللہ تعالیٰ نے آدمی کو دیا ہے، اِس پیٹ کے بھرنے سے ہی زندگی کی بقا ہے۔ اگر کوئی شخص ۱۰ دن بھی بھوکا رہ جائے وہ فاقہ کشی سے مر سکتا ہے۔ انسان اور ساری

چیزوں کو برداشت کرسکتا ہے، اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ گولی چلائی گئی اور چھے چھے گولیاں دماغ میں چلی گئیں اور آپریشن کے بعد آدمی بچ گیا، لیکن بھوکا آدمی نہیں بچ سکتا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ قریش پر اپنے دو انعامات کا تذکرہ کیا کہ ہم نے تمھاری بھوک کا علاج بھی کیا اور خوف سے امن بھی دیا: وَ اٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ (قریش:۴) یعنی خوف سے امن بخشا۔ اٰمَنَ کے معنی امن دیا، یعنی تحفظ بھی دیا، جسے انگریزی میں سیکورٹی کہتے ہیں۔ اس نے یہ تحفظ ہر اس خطرے سے فراہم کیا، جس سے سابقہ اہلِ عرب کو پیش آیا۔ لہٰذا اہلِ قریش سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ وہ رب ہے، جس کی بندگی قریش کو چاہیے کہ وہ کریں۔

یہاں سے آگے آخری دس سورتوں میں، جو سلسلۂ کلام چل رہا ہے، اِن سب میں قریش کا اور قریش کے افراد کا اور نہرِ کوثر کا اور خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے اور آخر میں جا کر سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر ہے۔ اگرچہ بظاہر تو آخری سورتیں ہیں لیکن یہ ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھیں، جب قریش مخاطب تھے۔ قرآن کی موجودہ ترتیب کے مطابق ان کا ذکر آخر میں آیا ہے۔ اس میں حضوؐر کے لیے فتح اور نصرت کی پیش گوئی بھی ہے:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝ (النصر:۱)

"جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے۔"

آپ ﷺ کو خیر کثیر عطا کرنے کی بشارت بھی ہے:

اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ۝ (الکوثر:۱)

"(اے نبیؐ) ہم نے تمھیں کوثر عطا کر دی۔"

اور پھر آپؐ کے دشمنوں کی بربادی کی بھی خبر ہے:

تَبَّتۡ يَدَآ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ (اللّھب:۱)

"ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔"

پھر اس کے بعد اللہ کے لیے اخلاص، یعنی توحید، جو سارے دین کا خلاصہ ہے، کا بھی ذکر ہے۔

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (الاخلاص:۱)

"کہو وہ اللہ یکتا ہے۔"

آخر میں توحید کے راستے میں جو خطرات پیش آتے ہیں، جن سے ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے، اُن سے بچاؤ کے لیے بھی دو سورتیں ہیں، جن میں اُن سارے خطرات کی نشان دہی کر دی گئی ہے، جس سے آدمی کا ایمان، اخلاق، اعمال، معاشرہ، گھر اور فرد برباد ہوتے ہیں۔ اس طرح یہاں یہ سلسلۂ کلام ختم ہو رہا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِس کے مخاطب صرف قریش ہی تھے یا کوئی اور آدمی یا کوئی امریکی، انگریز، چینی، جاپانی جس کے ہاتھ میں قرآن مجید کا نسخہ آ جائے اور وہ اس پوری تاریخ سے، جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، جس سے قریش بہ خوبی واقف تھے اور وہ اس کے اولین مخاطب تھے، واقف نہ ہو تو پھر اس کے لیے اس میں کیا سبق ہو سکتا ہے؟ درحقیقت قرآن مجید نے سارے انسانوں کو اسی بنیاد پر دعوت دی ہے۔ یہ صرف خانہ کعبہ اور مکہ کے لیے نہیں ہے بلکہ اس نے بیت المعمور کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اِس لفظ کے معنی مفسرین نے خانہ کعبہ کے بھی کیے ہیں اور ''ساری دنیا'' بھی کیے ہیں۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی ابتدا میں پوری انسانیت کو یوں دعوت دی:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (البقرۃ ۲:۲۱، ۲۲)

''لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی، جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں، ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے، جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اس کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا، اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔''

لہٰذا جو بات مکہ کے لیے سعادت تھی وہ کرۂ ارضی کے ہر خطے کے لیے سعادت ہے، جو قریش کا نام نہ بھی جانتا ہو اور قریش کی تاریخ سے بھی واقف نہ ہو، وہ اپنی چھوٹی سی دنیا پر بھی غور کرے تو وہ یہ دیکھے گا کہ اُس پر اللہ کے کتنے احسانات ہیں۔

اگر ماں کے سینے سے دودھ نہ پہنچتا تو ہر بچہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔ اب تو ڈبے کا دودھ

میسر ہے لیکن جب ڈبے نہیں تھے تب ماں کے سینے سے اگر دودھ کا انتظام نہ ہوتا اور وہ بچے کو نہ پہنچاتا تو کوئی انسان کا بچہ زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چناں چہ دودھ کا انتظام اس نے ماں کے سینے سے کیا۔ بچہ بھی جانتا ہے کہ اس کو دودھ کہاں سے ملے گا۔ وہ فوراً منہ وہیں پہنچاتا ہے اور جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے ویسے ہی خون اور گوشت کے درمیان سے دودھ کی نہر بہنا شروع ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہر انسان جانتا ہے کہ میرے چھوٹے سے عالم اصغر میں، چھوٹے سے مکہ میں، جو میرے اندر موجود ہے، اس کے اندر بھی، جو اللہ کا شہر آباد ہے، اس کے اندر وہی کھلاتا ہے اور وہی رزق پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد اگر آدمی اپنی زندگی پر غور کرے تو ہر جگہ وہ یہ دیکھے گا کہ خوف سے امن اور بھوک سے رزق، یہ اسی سے اس کو ملتا ہے۔

آپ گھر سے باہر نکلتے ہیں، پھل خرید کے لاتے ہیں، اناج خرید کر لاتے ہیں اور بہت ساری چیزیں خرید کر لاتے ہیں، یہ تو بنیادی ضروریات ہیں، جو ہر شخص کو اللہ کی طرف سے ہی پہنچ رہی ہیں۔ گھر سے باہر نکل کر ایک لمحے کے لیے بھی آدمی خطرے سے باہر نہیں ہوتا۔ ہر وقت خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ گاڑی میں جانا ہے تو کبھی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ انسان کا دل دھڑک رہا ہے لیکن یہ کبھی بھی بند ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اور بے شمار خطرات ہیں، جو ہر لمحے انسان کو گھیرے ہوتے ہیں اور کسی بھی وقت لاحق ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے کہ خطرات اچانک گردن پکڑ لیتے ہیں۔ آدمی غور کرے تو ایسے مخصوص واقعات اسے اپنی زندگی میں ضرور ملیں گے جہاں اللہ تعالیٰ نے، اس کے دستِ قدرت اور دستِ رحمت نے آگے بڑھ کر اس کی حفاظت فرمائی ہو، جیسے انسان بیماری میں مبتلا ہوا، کوئی حادثہ پیش آ گیا یا کوئی اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ ہر آدمی اپنے بارے میں اگر غور کرے تو وہ اس بات کو پالے گا کہ خدا کی ذات ہی ایسی ذات ہے، جو اس کو نفع پہنچاتی ہے اور نقصان سے بچاتی ہے۔ نفع اور نقصان، امن اور تحفظ دراصل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا ہی معاملہ ساری دنیا میں پائے جانے والے انسانوں کا ہے۔

سورۂ بقرہ، جو بالکل شروع میں اور سورۂ قریش، جو بالکل آخر میں ہے، ان دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کو مخاطب کیا ہے اور قرآن مجید کی دعوت پوری انسانیت کے لیے ہے۔

قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف:۱۵۸)
''اے نبیؐ، کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول ہوں۔''

یہاں آپؐ نے يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ کہہ کر خطاب فرمایا ہے۔

بہرحال ہدایت کا ذریعہ تو قریش کو ہی بننا تھا اور پہلے مخاطب قریش ہی تھے۔ اس لیے قریش کو جو دعوت دی گئی اس کا ذکر آخر میں کیا لیکن قریش پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی، جو خصوصی نوعیت تھی کسی نہ کسی شکل میں وہ خصوصی انعامات اس کے سارے انسانوں پر ہیں۔

آپ اپنی زندگی پر غور کریں، جب میں اپنے حوالے سے غور کرتا ہوں تو میں پاتا ہوں کہ اُس نے ہر لمحے بے شمار خطرات سے مجھے محفوظ کیا، بے شمار جگہ موت سے بچایا، بے شمار دشمنوں سے محفوظ رکھا اور بے شمار خوف کی جگہیں تھیں وہاں اس نے امن دیا۔ میری زندگی میں ایسے کئی مراحل بھی آئے جب بھوکے مرنے کے بھی امکان تھے لیکن اس نے اُن سب سے بخیر گزار دیا۔ آپ میں سے، جو بھی اپنی زندگی پر غور کرے گا، وہ ان دونوں پہلوؤں، یعنی خوف سے امن، خطرات سے بچاؤ اور افلاس سے نجات کو اپنے اندر ہر لمحے پائے گا۔

انسان کی زندگی مختلف اسباب سے وابستہ ہے۔ انسان مختلف مسائل اور خطرات سے دوچار ہوتا ہے، لیکن بچ جانے پر یہ سمجھتا ہے کہ فلاں سبب سے میں بچ گیا۔ بیمار پڑا تو خیال کرتا ہے کہ ڈاکٹر نے دوا دے دیا اس لیے بچ گیا، حادثے سے اس لیے بچ گیا کہ اچانک دوسری گاڑی کا رخ مڑ گیا، یا اگر ٹکرائی تو سیٹ پر سے کسی چیز نے اُٹھا کر باہر پھینک دیا اس لیے بچ گیا۔ مگر وہ نہیں سمجھتا کہ اس پوری کائنات میں کوئی بھی چیز اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہ کوئی چیز اللہ کی قدرت سے باہر نہیں۔ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (الکہف:۳۹) جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہی ہوا ہے۔ اس کی قوت کے علاوہ کسی کی قوت نہیں ہے۔ جب آدمی اپنے معاملات کی نسبت اس سے ٹھیرا لیتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ وہ بھی قریش کی طرح، ہر وقت جزا بھی پا رہا ہے اور امن بھی پا رہا ہے اور سیکورٹی بھی اس کو نصیب ہے، جان کی بھی اور مال کی بھی۔ اِلّا یہ کہ اللہ کا حکم ہو جائے کہ کسی حادثے یا مصیبت سے اس کی موت واقع ہو جائے۔ اس لیے کہ اس کا ہمیشہ کا وعدہ نہیں ہے کہ دنیا میں زندگی کو ختم نہیں کرنا ہے۔ اس لیے آزمائشیں بھی آتی ہیں۔

لہٰذا اس سورۃ کے مخاطب ہم اور آپ، سارے انسان ہیں کہ جو فی الواقع عطا کرنے

والا ہے اس کی بندگی کریں، اسی کی پرستش کریں، اسی کے آگے سر جھکائیں، اسی کی اطاعت کریں اور پورے کے پورے اسی کے بن جائیں۔ یہاں وضاحت نہیں کی گئی کہ بندگی کی دعوت کی تفصیل کیا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے دوسری جگہ بہت کھول کر بیان فرمایا:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۵ۙ حُنَفَآءَ (البینۃ:۵)

''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خاص کر کے، بالکل یکسو ہو کر۔''

یہاں جس بات کا حکم دیا گیا ہے وہ ایسی بندگی نہیں ہے کہ آدمی صرف اللہ کا نام جپ لے، دو رکعت نماز پڑھ لے، بلکہ پوری زندگی کے سارے نظام کو اسی کے لیے خالص کر دے، اسی کی بندگی میں دے دے اور ہر چیز سے کٹ کر صرف اسی کا ہو کر رہ جائے۔ یہ وہ بندگی ہے، جس کا اس نے مطالبہ کیا ہے۔ اسی بندگی کا پیغام لے کر سارے انبیاء آئے، اسی بندگی پر انسان کی دنیا میں فلاح کا انحصار ہے اور آخرت میں نجات کا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذّٰریٰت:۵۶)

''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔''

اصل بندگی تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی مکمل اطاعت کرے۔ اس کا جینا مرنا، پسند ناپسند، دوستی، دشمنی، سب اللہ کے لیے ہو جائے۔ حضورؐ کے اولین مخاطب تو قریش تھے۔ وہ آپؐ کی دعوت کو جھٹلا رہے تھے، ٹھکرا رہے تھے، ماننے سے انکار کر رہے تھے اور آپؐ کے اوپر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ آپؐ کے قتل کے بھی درپے ہو گئے تھے، لیکن ان کی ساری چالیں بالآخر ناکام ہو گئیں۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کر رہے تھے کہ دولت کے نشے میں غرق ہو چکے تھے۔ خدا کے مقابلے میں ان کے مفادات ان کے پیشِ نظر تھے، جیسا کہ سورۂ عادیات میں، سورہ تکاثر میں اور سورۂ ہمزہ میں اس کا ذکر آیا ہے۔ دل کی تنگی اور دولت کی حرص، دنیا کو جمع کرنا اور دنیا کا بن کر رہ جانا، یہ دراصل وجوہات تھیں، جن کی وجہ سے وہ خدا کی بندگی سے دور ہو گئے تھے اور یہی معاملہ عام انسانوں کا بھی ہے۔ بندگی کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ آدمی صرف نماز پڑھ لے، بلکہ بندگی کے

معنی یہ ہیں کہ اللہ آدمی کے بندوں کے حقوق بھی پورے کرے۔ یہی دراصل بندگی کا کمال ہے۔

کسی بزرگ سے کسی نے کہا کہ فلاں آدمی تو پانی پر چلتا ہے تو انھوں نے کہا کہ پانی پر تو گھاس کا پتا بھی چلتا ہے۔ اس میں کیا کمال ہے؟ اُس نے کہا فلاں آدمی ہوا میں اڑتا ہے، انھوں نے کہا کہ ہوا میں تو مچھر بھی اڑتے ہیں اور مکھیاں بھی اڑتی ہیں۔ اس میں اس کا کیا کمال ہے؟ فرمایا: کمال تو یہ ہے کہ آدمی دنیا میں رہے اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ خدمت کا، عدل وانصاف اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کرے اور یہی کمال ہے بندگی کا۔ اس بات کی طرف اشارہ اگلی سورہ، سورۂ ماعون میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

سورۃ الماعون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔
تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے، جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو، کھانا دینے پر نہیں اُکساتا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے، جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں اور جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔

تشریح: یہ سورۃ سورۂ ماعون کے نام سے جانی جاتی ہے اور سات آیات پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ فیل اور سورۂ قریش کے بعد آتی ہے۔ سورۂ فیل میں اللہ نے قریش پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ کا گھر، جس سے ان کا امن بھی وابستہ تھا اور رزق بھی، اس کی حفاظت کا اس نے انتظام فرمایا۔ وہ دشمن جو اُسے تباہ و برباد کرنے کے لیے بڑے لاؤ لشکر، ساز و سامان اور قوت کے ساتھ آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے خود اس کو، اس کے لشکر کو اور اس کی سلطنت کو پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سورۂ قریش میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُس انعام کا ذکر فرمایا کہ عرب، جس میں کسی کا جان و

مال محفوظ نہیں تھا، لوگ سخت خطرات سے دوچار تھے، کسی کو کسی قسم کا کوئی تحفظ حاصل نہ تھا، راہ چلتے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے، لوٹ مار عام تھی، ان حالات میں قریش کو خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے امن دیا اور تجارت کی راہ ہموار کی اور جہاں بھوک کا خطرہ تھا وہاں رزق کا سامان کیا۔ لہٰذا ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی غلامی اور بندگی اختیار کریں اور اسی لیے یہ گھر بنایا گیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اس گھر کی بنیادیں اٹھاتے ہوئے بھی یہ دعا کی تھی کہ اللہ اس گھر کو آباد کرے، ان کی اولاد سے ایسی اُمت اٹھائے، جو اس گھر کے مالک کی بندگی کرنے والی اور نماز قائم کرنے والی ہو اور اللہ اسے امن اور رزق دے۔ قریش کو میسر آنے والا امن اور رزق اسی دعا کی قبولیت کا نتیجہ تھا۔

قرآن مجید کی آخری سورتوں میں یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کس دور میں نازل ہوئی ہیں۔ قرآن مجید کے مخاطب حضوؐر کے اہل قبیلہ اور اہل خاندان تھے، بنو ہاشم اور بنو عبد مناف تھے اور قریش کا پورا قبیلہ اور اہل عرب تھے۔ یہ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بظاہر خطاب تو قریش سے فرمایا ہے، لیکن اس کے مخاطب سارے انسان، ہم اور آپ بھی ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو رزق اور امن کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ بجائے اس کے کہ قریش اللہ کی بندگی کرتے اور صرف اسی کی غلامی اختیار کرتے، انھوں نے دکھلاوے کی دین داری اختیار کر رکھی ہے۔ انھوں نے جزا اور سزا کو کہ نیک اعمال کی اچھی جزا اور برے اعمال کی بری سزا، جو کہ قرآن مجید کی مستقل تعلیم ہے، فراموش کر رکھا ہے اور اس کا مظہر اللہ کے بندوں کے ساتھ ان کا سلوک ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ○ (الماعون ۱:۱)

''تم نے دیکھا اس شخص کو، جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔''

اس کا خطاب ہم سے بھی ہے اور اُن سے بھی، جو حضوؐر اور قرآن کے براہِ راست مخاطب تھے اور ہر دور میں قرآن کے سننے والوں سے بھی ہے۔ یہاں دیکھنے کے معنی آنکھوں سے دیکھنا نہیں، بلکہ اس سے مراد غور و فکر کرنا ہے۔ یہ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے: تم نے دیکھا، اس نے کیا کہا، یا کیا تم دیکھتے ہو وہ کیسے کام کرتا ہے۔ اردو زبان میں یہ لفظ ہم کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ دیکھنے کا لفظ عربی زبان میں یہاں انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

دین کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ان میں سے دو معنی تو بہت معروف اور عام ہیں۔ایک معنی ہیں انسان کی زندگی بسر کرنے کے طریقے کے ہیں۔اس میں ہر چیز شامل ہے: ایمان، اپنے نفس کے ساتھ اور دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق وغیرہ۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹)

"اللہ کے نزدیک (زندگی بسر کرنے کا صحیح) طریقہ صرف اسلام ہے۔"

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۥ حُنَفَاءَ (البینۃ:۵)

"ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ پورے دین کو (زندگی بسر کرنے کے طریقے کو) اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کریں۔"

گویا دین کے معنی ضابطۂ حیات، قانون، طریقِ زندگی اور پوری زندگی کو وقف کرنے کے ہیں۔

دین کے دوسرے معنی جزا، سزا اور انصاف کے دن کے بھی ہیں۔ جہاں نیک کاموں اور برے کاموں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔یہی جزا و سزا کا مفہوم ہے۔انھی معنوں میں یہ لفظ قرآن مجید کے شروع میں استعمال ہوا ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (الفاتحہ:۳) کہ اللہ انصاف کے دن کا اور جزا و سزا کے دن کا مالک ہے۔یہاں اس کے معنی دین کے بھی لیے جائیں گے۔دراصل دین کی ساری تعلیم کا خلاصہ اس سورۃ کے اندر بیان ہو رہا ہے، جس کا سلسلہ گزشتہ سورۃ سے شروع ہوا ہے، یعنی صرف اللہ کی بندگی اور اخلاص کے ساتھ بندگی، اس کی پرستش اور پوجا اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائی اور اُن کے ساتھ رحمت اور محبت کا رویہ وغیرہ۔یہی اصل دین ہے، اور جو یہ کام نہیں کرتا خواہ وہ کتنی ہی دین داری کا دعویٰ کرے، دکھاوے کی دین داری کرے اور وضع قطع بھی دین داروں کی سی بنالے، وہ دراصل دین کو جھٹلانے والا ہے۔ یہاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے دین کے معنی طریق زندگی کے کیے ہیں، لیکن دوسرے بہت سے صحابہ اور مفسرین نے اس کے معنی جزا و سزا ہی لیے ہیں۔روزِ جزا سے مراد وہ دن ہے، جس دن اللہ تعالیٰ اچھے اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا برا بدلہ دے گا۔قرآن مجید کا آغاز بھی اسی تصور سے ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں فرمایا گیا: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ مالک ہے روزِ جزا کا۔

اسی رویے کا تصور اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے اعمال کا تذکرہ ان آخری

سورتوں میں مختلف حوالوں سے آرہا ہے۔ اسی پارے کی ایک (سورۃ) میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا ہے کہ جب وہ وصول کرتا ہے تو پورا پورا وصول کرتا ہے، ایک ہبہ اور ایک روپیہ تک نہیں چھوڑتا اور اگر خود دینا چاہے تو چاہتا ہے کہ کم سے کم دے اور جب اس سے دوسروں کے حقوق کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو دین کو جھٹلاتے ہیں اور یہ کام وہی کرتا ہے، جس کو اس بات کا ڈر نہ ہو کہ وہ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑا ہوگا اور اپنے تمام اعمال کا جواب دہ ہوگا۔ یہی وہ شخص ہے، جو اللہ کے بندوں کے ساتھ حقوق کے معاملے میں ایسا رویہ اپناتا ہے کہ اپنا حصہ تو پورا پورا وصول کرنا چاہتا ہے اور حق سے زیادہ لینا چاہتا ہے مگر جب دوسروں کا حق دینا ہو تو اس میں ڈنڈی مارتا ہے اور حق سے کم دینا چاہتا ہے۔ فرمایا:

اَلاَ یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ○ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ○ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ (المطففین: ۴-۶)

"کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن، جب سب لوگ اللہ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔"

سورۂ فجر میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ○ وَلاَ تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ○ وَ تَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلاً لَّمًّا○ وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا○ (الفجر: ۱۷-۲۰)

"ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔"

یہاں بھی وہی دو صفات بیان کی گئی ہیں، جن کا ذکر اس سورۃ میں آیا ہے کہ یتیموں کا اکرام نہیں کرتے اور مساکین کو کھانا کھلانے کے لیے ترغیب نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے، جو مال دیا ہے، وہ ماں باپ سے ورثے میں ملے یا کسی اور ذریعے سے حاصل ہو، اس کو وہ خوب جی بھر کے کھانا چاہتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مال کی محبت اس کے دل کے اندر رَچ بس اور گہری اُتری ہوئی ہے۔ اس کے بعد اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے یومِ حساب کا

ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح سورۂ بلد میں بھی ایسے ہی شخص کا ذکر کیا ہے، جو اپنے مال کی بنیاد پر غرور کرتا ہے اور مسکین کو، یتیم کو اور رشتے دار کو اس کا حق ادا نہیں کرتا۔ پھر فرمایا کہ دراصل، جو لوگ اس کا حق ادا کرتے ہیں ان کا حال تو یہ ہے:

وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ؕ (البلد:۱۷)

''اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلق خدا پر) رحم کی تلقین کی۔''

اس کا مطلب اللہ کی راہ پر جم کر چلنا اور ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کے برتاؤ کرنا۔ یہی بات سورۂ عصر میں گزر چکی ہے:

وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر:۳)

''اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔''

گویا ایک ہی مضمون ہے، جو مختلف پیرایے میں بیان ہو رہا ہے اور ہر پیرایے میں مضمون کے کچھ اور پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں۔

دین کی اصل تعلیم یہ ہے کہ انسان انسان بنے، اللہ کا بندہ بن کر انسانوں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آئے اور ان کے حقوق کی ادائی بھی کرے اور حق مار کے نہ بیٹھے۔ دوسروں کے حقوق کی ادائی ان کے حق سے بڑھ کر کرے اور احسان اور نیکی کا برتاؤ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی حق کی ادائی کی تلقین اور تاکید کرے۔ چناں چہ ان معنوں میں دین کا لفظ قرآن مجید میں جزا و سزا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اکثر صحابہ و مفسرین نے اس کو جزا و سزا کے معنوں میں لیا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ جو انصاف ہونے کو جھٹلاتا ہے، یعنی اس بات کو جھٹلاتا ہے کہ انصاف ہوگا اور برائی کا بدلہ برا اور بھلائی کا بدلہ بھلا ملے گا۔

فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ (الماعون:۲)

''پس یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''

یَدُعُّ کے معنی دھکے دینے کے ہیں اور دھکے دینے کا لفظ کئی قسم کے برتاؤ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ معاشرے میں جو ضعیف، کمزور، بے آسرا اور بے سہارا افراد پائے جاتے ہیں، اُن کے ساتھ لوگ طرح طرح کے برتاؤ کرتے ہیں، ان سب کو یدع کے اندر جمع کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح یتیم کے حق کا احترام کرنا اور پھر اُس کو صرف خود ہی نہ تسلیم کرنا بلکہ دوسرے، جو اُس حق

کو لیے ہوئے ہوں ان سب کی حمایت کرنا کہ ان کا حق تسلیم کیا جانا چاہیے اور اس حق کی ادائی کے لیے تاکید و تلقین کرنا اور اگر ضرورت پڑے تو اس کے لیے سینہ سپر ہو جانا، یہ سب معنی لفظ ''یتیم'' کے اندر پائے جاتے ہیں۔ ہمارے مفسرین نے اس بات کی بھی تصدیق کی ہے کہ یہ بھوک کی حد تک بات نہیں یا یتیم کے حق کی بات نہیں ہے بلکہ جو بھی معاشرے کے اندر کمزور اور بے طاقت افراد ہیں، جن کا حق نہ ملتا ہو، ان میں عورتیں بھی شامل ہیں اور بچے اور یتیم بھی اور جانور وغیرہ بھی، سب کا ذکر احادیث میں علاحدہ علاحدہ کیا گیا ہے، ان سب کے حقوق کی ادائی ایمان بالآخرۃ کا تقاضا ہے۔ جو ایمان بالآخرۃ کا دعویٰ تو کرے لیکن انسانوں کا حق ادا نہ کرے اور یہ سمجھے کہ ظاہری دین داری، جس کا ذکر کیا گیا ہے، یہی کافی ہے تو یہ شخص دراصل انصاف، آخرت اور جزا و سزا کو جھٹلانے والا ہے۔

ہمارے ہاں سیاست، معیشت اور معاشرت میں بھی ''یتیم'' ایک اصطلاح بن گئی ہے اور فقہا و علما نے اس کو استعمال کیا ہے۔ عوام کا جو مال خزانے میں آتا ہے اس کے لیے ہماری معروف اصطلاح مالِ یتیم ہے۔ وہ ٹیکس جو خزانے میں جمع ہوتے ہیں، ان کی حیثیت مالِ یتیم کی سی ہے۔ اس لیے جو بھی اس کا والی ہو، حکمراں ہو، جس کے ہاتھ میں اس کو خرچ کرنے کا اختیار ہے اگر وہ اس مال کو ناجائز طریقے سے کھاتا ہے تو وہ قرآن کی رو سے اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے اور جو آدمی اس مال کو صحیح طریقے سے استعمال کر سکتا ہو، جو اس کا مستحق ہو اس کو اس مال کو واپس لوٹا دینا، یہی اس مال کا حق ہے۔ سوائے اس کے کہ جو اس مال کو ضائع کر دے یا اس کے استعمال کا صحیح شعور نہ رکھتا ہو اسے نہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ مالِ یتیم کو اس کے حق دار سے روکے رکھنے کی کوئی صورت جائز نہیں ہے۔

مالِ یتیم کے استعمال کا ایک اصول یہ ہے کہ جو اپنا خرچ خود اٹھا سکتا ہو وہ اس میں سے کچھ خرچ کرنے کا حق دار نہیں اور جو اپنا خرچ خود نہ اٹھا سکتا ہو وہ اس میں سے ناگزیر ضرورت کے پیشِ نظر مال کفاف کی حد تک لے سکتا ہے۔

وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَ مَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ط (النساء ۴:۶)

''اور جو مال دار ہو وہ پرہیز گاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے کھائے۔''

چناں چہ خلفاے راشدین نے اس کا بھی اصول بنایا کہ جو آدمی خود اپنا پیٹ بھر سکتا ہو وہ خزانے سے نہ لے اور جو فقیر ہو، خود اپنا پیٹ نہ بھر سکتا ہو وہ اس قدر لے لے کہ جس سے اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ اگر اس سے زیادہ وہ اپنی عیاشیوں کے لیے پیسہ لیتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے۔

قرآن مجید میں یتیم کا ذکر مختلف مقامات پر بار بار آیا ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں بھی یتیم کا تذکرہ مختلف مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ ضحیٰ میں بھی اس کا ذکر تھا:

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ (الضحیٰ:۹)

''لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو۔''

اس لیے کہ یتیم بحیثیت یتیم کے بھی مطلوب ہے کہ جاہلی معاشرے کے اندر اس کے حقوق مارے جاتے تھے، اور وہ جذبہ اور روح بھی مطلوب ہے کہ جو ان طبقات کے ساتھ انسان کے اندر ہونی چاہیے۔ امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سورۃ کے اندر، جن دو افعال کا ذکر فرمایا گیا ہے، یعنی یتیم کو دھکے دینا اور مسکین کو کھانا نہ دینا، یہ بطورِ مثال اور نمونے کے طور پر دو چیزوں کا تذکرہ ہے، اس کے پیچھے اصل چیز وہ پورا طرزِ زندگی اور وہ سارے اعمال و افعال ہیں، جو اس طرح کے اور اس کی مانند ہیں۔

وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ○ (الماعون:۳)

''اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔''

یَحُضُّ کے معنی تاکید کرنے کے بھی ہیں اور ترغیب دینے کے بھی، اکسانے کے بھی ہیں اور وسیع طور پر معاشرے اور سوسائٹی کے اندر اس کا انتظام و انصرام کرنے کے بھی۔ مسکین کے کھانے کا مطلب یہ ہے کہ مسکین وہ ہے، جو لاچار اور محتاج ہو، اپنا پیٹ خود نہ بھر سکتا ہو۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ خود کھانا نہیں دیتا بلکہ اس کی تاکید کرنا اور ترغیب دینا کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں دونوں باتوں کا جگہ جگہ ذکر ہوا ہے لیکن زیادہ کثرت کے ساتھ ذکر ترغیب دینے کا ہوا ہے۔ خود کھانا کھلانے کا ذکر کم ہوا ہے، اگرچہ وہ بھی کئی جگہ آیا ہے۔ چناں چہ کثرت کے ساتھ ایک دوسرے کو ترغیب دینے اور تاکید کرنے کا ذکر ہوا ہے کہ مسکین کا پیٹ بھرا جائے۔ معاشرے کے اندر وہ لوگ، جو خود اپنا پیٹ بھر سکتے ہوں، جو برسرِ روزگار ہوں اور جن کے پاس اتنا مال ہو کہ بغیر جھکے اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہوں، جن کو انگریزی میں Have بھی کہتے ہیں، رکھنے والا، اور

ایک وہ ہیں، جن کے پاس اتنی دولت اور مال نہیں ہے، روزگار اور وسائل نہیں ہیں کہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں، جن کو ہم انگریزی میں Have Not بھی کہتے ہیں، قرآن مجید نے اس کے لیے محروم کا لفظ استعمال فرمایا ہے، ان کو کھانا کھلانے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ البتہ یہ کھانا اُن پر کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ اُن کا لوگوں کے مال میں حق ہے۔

وَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (اَلذّٰرِیٰت:۱۹)

''ان کے مال میں حق ہے، مانگنے والوں اور محروم لوگوں کا۔''

لہٰذا اُن کے کھانے پینے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا دین ہے، اسلام کے طریقے پر اور جزا و سزا پر ایمان کا تقاضا ہے۔ یہاں دین کے دونوں مفہوم مراد لیے جا سکتے ہیں۔

یہاں قریش کا ذکر ہو رہا ہے۔ قریش کو خانہ کعبہ کا متولی بنایا ہی اس لے گیا تھا کہ وہ لوگوں کو پانی پلائیں غریبوں کو کھانا کھلائیں اور یہ اُن کا عام برتاؤ تھا۔ حضوؐر کے پردادا کا نام ہاشم تھا۔ اس کے معنی ہیں کہ جو روٹی چورا کر کے سالن میں ڈال کر مسکینوں کو کھلائے اور وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ چناں چہ اسی لیے ان کا نام ہاشم پڑ گیا تھا۔ قریش میں یہ بات مشہور تھی کہ حاجیوں کی خدمت کرنا، پیاسوں کو پانی پلانا اور حاجت مندوں کی حاجت روی کرنا نیکی اور بھلائی کا کام ہے۔ اور یہاں اُن کا ذکر ہو رہا ہے، جنھوں نے ایک طرف تو خانہ کعبہ میں لا کر سینکڑوں بت رکھ دیے تھے اور دوسری طرف مال و دولت کے اتنے حریص بن گئے تھے کہ قرآن نے ان کی حالت پر یوں تبصرہ کیا:

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّ عَدَّدَهٗ (الھمزۃ:۲)

''مال جمع کرتے ہیں اور گن گن کر رکھتے ہیں۔''

اگر کوئی دوسرا یتیموں اور ناداروں کو کھلاتا ہے تو اشارہ بازی کرتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی طرف ھمزۃ لمزۃ یعنی منہ پر طعنے دینے والا اور پیٹھ پیچھے برائیاں کرنے والا کہہ کر اشارا کیا گیا ہے۔ دراصل قریش کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ نہ تو وہ یتیم کے حقوق ادا کرتے تھے بلکہ اس کو دھکے مار کر بھگا دیتے تھے اور اگر وہ اپنا حق مانگنے کھڑا ہو جاتا تو اس کو دھتکار دیتے تھے۔ اسی طرح نہ ان کے حقوق ادا کرتے تھے کہ جو محروم ہیں اور نہ اُن کو کھانا کھلاتے تھے کہ جو اس کے مستحق تھے۔

یہ اس لحاظ سے آخرت پر عقیدہ کی تشریح بھی ہوگئی ہے کہ آخرت پر ایمان صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے، استغفر اللہ کی تسبیح پڑھتا رہے کہ اللہ میرے گناہ معاف فرمادے بلکہ آخرت کا عقیدہ تو اعمال کے اوپر منتج ہونا چاہیے۔ آخرت کے عقیدے کے طور پر وہ اعمال پیدا ہونے چاہئیں کہ آدمی اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرے اور صرف حقوق ہی ادا نہ کرے بلکہ دوسروں کو کھڑا کرے کہ وہ بھی یہ حقوق ادا کریں۔ یہ حقوق معاشی حقوق بھی ہیں، جن کا یہاں پر ذکر ہے اور معاشرتی حقوق بھی ہیں اور سیاسی حقوق بھی۔ ان سب کے لیے مسلمانوں کو کھڑا ہونے کا اور انصاف کو قائم کرنے کا اور انصاف پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد پہلے ہی خطبے میں اس بات کی تشریح فرمائی تھی کہ جو تم میں سے کمزور ہے اور اس کا حق مارا گیا ہے، وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ طاقت ور ہے، جب تک کہ میں اسے حق نہ دلوادوں۔ کوئی کمزور اور بے سہارا آدمی اپنے آپ کو کمزور محسوس نہ کرے۔ اس کا حق دلوانے کے لیے ریاست کے قانون کی پوری قوت اس کی پشت پر ہے۔ تم میں سے جو آدمی اپنے آپ کو بڑا مال دار اور طاقت ور سمجھتا ہے کہ اس کے پاس بڑا مال ہے، جائیداد اور جاگیر ہے، وہ میرے نزدیک کمزور ترین آدمی ہے، اور میں اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر اس سے حق وصول کروں گا۔ جب تک یہ حق وصول نہ کرلوں پوری ریاست کی قوت اس کے خلاف ہے۔

یہ اسلام کا فلسفۂ حکومت بھی تھا، فلسفۂ معاشرت بھی اور فلسفۂ معیشت بھی۔ اسلامی معاشرے کے اندر وہ لوگ جو حق سے محروم ہیں طاقت ور ہیں۔ اس لیے کہ گو ان کا کوئی خاندان نہیں، سرپرست نہیں، کوئی باپ نہیں، کوئی طاقت ور قبیلہ نہیں کہ جو ان کی پشت کے اوپر کھڑا ہوجائے، یا کوئی ایم پی یا ایم ایل اے یا کوئی وزیر نہیں ہے، جو ان کا حق دلوائے بلکہ اسلامی ریاست کی پوری ریاستی و قانونی طاقت ان کی پشت پر ہوگی۔ یہ لوگ دھتکارے نہیں جائیں گے اور ان کے حقوق مارے نہیں جائیں گے بلکہ اُن کے حقوق ادا کیے جائیں گے۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ یتیم و بے بس لوگوں کو دھتکارتا ہے، ان کا حق مارتا ہے اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے، جو ایسا کرتے ہیں وہ دراصل انصاف ہی کو جھٹلانے والا ہے۔ دین کی تکذیب کرنے والا ہے، پورے دین کی تکذیب بھی اور جزا و سزا کی بھی۔ آخرت کو جھٹلانے سے یہی مراد ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ○ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ○ (الماعون: ۴-۷)

"پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے، جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔"

وَيْلٌ کا لفظ پہلے بھی آچکا ہے۔ اس میں کم بختی، تباہی، بربادی کا مفہوم شامل ہے۔ یہاں پر نمازی کا لفظ جب آگیا تو سمجھنے والے تھوڑی سی الجھن میں پڑ گئے کہ ذکر تو ہو رہا ہے سورۂ قریش میں کفار کا اور کفارِ قریش تو نماز پڑھنے والے نہ تھے، نماز پڑھنے والے تو مسلمان ہیں۔ چناں چہ بعض لوگوں نے کہا کہ اس کی پہلی چار آیات مکہ میں نازل ہوئیں اور بعد کی تین آیات مدینہ میں نازل ہوئیں، جہاں نماز فرض ہوگئی تھی۔ نمازی نماز پڑھنے آتے تھے، لیکن ان میں دکھاوے کی نماز پڑھنے والے منافق پیدا ہو گئے تھے۔

یہاں پر مُصَلِّيْن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے ایک معانی تو نماز پڑھنے والوں کے ہیں اور کفارِ قریش بھی اپنی دانست میں، جو عبادت کرتے تھے وہ ان کے نزدیک نماز پڑھنا ہی تھی۔ قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ط (الانفال: ۳۵)

"بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے؟ بس سیٹیاں بجاتے ہیں اور تالیاں پیٹتے ہیں۔"

اسی کو وہ نماز خیال کرتے تھے۔ وہ حج بھی کرتے تھے، طواف بھی کرتے تھے، باہر بھی نکلتے تھے۔ اگرچہ عرفات کے میدان میں نہیں جاتے تھے، البتہ یہ عبادات ان کے ہاں کسی نہ کسی شکل میں رائج تھیں۔ حضورؐ اعلانِ نبوت سے پہلے غارِ حرا میں جا کر روزے رکھتے تھے، شب بیداری کرتے تھے اور اللہ کو یاد کرتے تھے۔ قریش کے اندر ایسا کرنے والے دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ عبادت کرنے والے موجود ہی نہیں تھے۔ اس طرح صلوٰۃ کے ایک عام معنی یہاں عبادت کے ہیں۔

صلوٰۃ کے ایک معنی دین داری کے بھی ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اپنے آپ کو دین دار خیال کرتے ہیں اور قریش ان معنوں میں اپنے آپ کو دین دار خیال کرتے تھے کہ ہمارے پاس ایک مقدس ادارہ ہے، ہم پروہت اور پادری کی طرح یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ہم خانہ کعبہ

کے متولی ہیں۔ اسی لیے جب حضورؐ نے دعوت دینا شروع کی تو قریش کا الزام یہ بھی تھا کہ یہ بے دین لوگ ہیں، صابی بن گئے ہیں، انھوں نے اپنے آباءواجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ ہر جگہ ان کا یہی پروپیگنڈا ہوا کرتا تھا کہ یہ اپنے دین سے پھر گیا ہے، بے دین ہو گیا ہے اور اس نے اپنے آباءو اجداد کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے۔ ان معنوں کے اندر بھی مُصَلِّیْن کا لفظ آتا ہے۔

قرآن مجید کسی مخصوص زمانے کے لیے نہیں ہے۔ چناں چہ مدینہ میں اگر مصلّین آئے تو وہ، جس قسم کے مصلین تھے ان کا ذکر موجود ہے۔ اُن پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور آج چودہ سو سال کے بعد اس طرح کے مصلین پائے جاتے ہیں کہ جو سمجھتے ہیں کہ دین تو بس یہی ہے کہ نماز پڑھ لیں اور اپنی وضع قطع نمازیوں کی سے بنا لیں اور نماز سے فراغت کے بعد بچوں سے جس طرح کا چاہیں سلوک کریں، یتیموں کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں، عورتوں کو جس طرح چاہیں پھٹکاریں، نوکروں کے ساتھ جس طرح کا چاہیں سلوک کریں، وہ لوگ، جن کی یہ روش ہو اور جنھیں اس بات کا زعم ہو کہ وہ بڑے متقی اور پرہیزگار ہیں، نماز پڑھتے ہیں، مسجد جاتے ہیں، ان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

دراصل قرآن مجید کی یہ آیات ہر زمانے کے لیے ہیں۔ صرف مکہ اور مدینہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ بیسویں صدی کے لیے بھی ہیں اور چھٹی صدی کے لیے بھی۔ چناں چہ اس میں وہ مصلین بھی شامل ہوں گے، جو آج پائے جاتے ہیں کہ جن کی نماز کا اُن کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی وہ اعمال، جو وہ مخلوق کے ساتھ برتتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں تو یہ تصور پایا جاتا ہے کہ جتنا کوئی نمازی ہوگا اتنا ہی وہ اپنی بات چیت کے اندر سخت ہوگا۔ اگر کوئی مسئلہ بتائے گا تو پھٹکار کر اور ڈانٹ کر بتائے گا، اور تعلیم دے گا تو سختی برتے گا اور اس کو بڑا زعم ہوگا کہ میں تو بڑا نمازی ہوں، پانچ وقت مسجد جاتا ہوں اور اللہ کا بڑا عبادت گزار ہوں اور میرے دین دار ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اسی طرح، جن لوگوں نے دین کو نماز تک محدود کر لیا ہے وہ بھی ان آیات کے اندر شامل ہیں۔ یہ آیات بڑی غور طلب ہیں۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ o (الماعون:۵)

''وہ لوگ جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔''

نماز سے غفلت برتنے اور بے خبر ہونے کے کئی معنی ہیں، جن کو جاننے کی ضرورت

ہے۔ایک تو وہ نمازی تھے، جن کا تعلق قریش سے تھا اور انھوں نے اس نماز کو ضائع کر دیا، جس نماز کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے دی تھی۔اس کی جگہ انھوں نے اپنی مرضی کے رسم ورواج کو نماز قرار دے دیا۔نماز سے غفلت کے یہ بھی معنی ہیں کہ نماز اپنی اصلی شکل میں تو موجود ہو، جس کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولؐ نے اپنی کتاب وسنت میں دی ہے، لیکن اس نماز کو صحیح طرح سے پڑھنے سے لوگ غافل ہو جائیں۔ اول تو نماز پڑھتے ہی نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو لاپروائی برتتے ہیں اور غفلت سے پڑھتے ہیں۔ وقت پر نماز نہ پڑھنا، ٹال مٹول کرتے رہنا، دل چاہا تو نماز کو کھڑے ہو گئے، ذرا سے مصروفیت ہوئی تو نماز ٹال دی، یہ سب نماز سے غفلت میں شمار ہوتا ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر نماز کی، جو اصل روح ہے، یعنی اللہ کی یاد، اس سے غفلت برتی جائے اور بے دلی سے پڑھی جائے، نیز نماز سے متعلق اللہ اور اس کے رسول نے، جو تعلیمات دی ہیں، ان سے بھی غفلت برتی جائے۔

غفلت کے حوالے سے دو چیزیں اہم ہیں۔قرآن مجید نے مدینہ کی زندگی میں منافقین کا دو حوالوں سے تذکرہ کیا ہے۔ایک یہ کہ وہ نماز کے طرف آتے ہیں تو کسل مندی، سستی اور بے پروائی سے آتے ہیں اور دوسرا یہ کہ انفاق سے گریز کرتے ہیں:

وَلاَ یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلاَّ وَ ھُمْ کُسَالٰی وَلاَ یُنْفِقُوْنَ اِلاَّ وَ ھُمْ کٰرِھُوْنَ ○ (التوبۃ:۵۴)

''نماز کے لیے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادلِ نخواستہ خرچ کرتے ہیں۔''

یہ تذکرہ اس سورۃ میں بھی آیا ہے۔آخرت کو جھٹلانے کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ خیرات ہی نہیں کرتے اور اگر جیب کھلتی بھی ہے تو بڑی مشکل سے اور جیب سے زیادہ تنگ ان کا دل ہے۔دل ہے کہ نرم ہی نہیں پڑتا کہ بندوں کے لیے مال خرچ کیا جائے۔قرآن مجید نے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ یہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے آتے ہیں اور اللہ کو نماز میں تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں (النساء:۱۴۲) اگرچہ نماز پوری پوری پڑھتے ہیں، ارکان پورے ادا کرتے ہیں، تلاوت بھی کرتے ہیں، لیکن اللہ کی یاد دل میں نہیں ہوتی۔یہ بھی نماز سے غفلت ہے۔

نماز کا اصل مقصد ہے کہ یہ صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے، اس میں اخلاص ہونا چاہیےاور ساری بندگی اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ اسی لیے فرمایا کہ انہیں یہی حکم دیا گیا تھا:

لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۥ حُنَفَآءَ (البینۃ:۵)

''اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کواس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر۔''

لہٰذا نماز بھی قائم کرو تو اللہ کے لیے کرو، کسی کو دکھانے کے لیے نہ کرو۔ نماز کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (العنکبوت:۴۵)

''بے شک نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے۔''

اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہو اور فحش و منکرات کا ارتکاب کرتا ہو تو یہ بھی نماز سے غفلت ہے۔ یہ سَاهُوْنَ کے مختلف پہلو ہیں، جو بیان کیے گئے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ (الماعون:۶)

''جو ریاکاری کرتے ہیں۔''

دکھاوے کی نماز وہ ہوتی ہے کہ جس میں یہ خیال ہو کہ لوگ کہیں کہ بڑا دین دار آدمی ہے۔ دکھاوے کی نماز اس لیے بھی ہوتی ہے کہ یہ ورثے میں مل جایا کرتے ہے، یعنی باپ دادا نمازی چلے آرہے ہیں اور نماز پڑھنے کا رواج ہے، اس لیے اس کو آدمی رسم کے طور پر ادا کرتا رہے۔ وہ بالکل اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ نماز میں ہم کیا کہہ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کس بات کا حکم دے رہا ہے؟ اور کیا اعمال ہیں جن کو نماز کے نتیجے کے طور پر کرنا چاہیے؟ دل بھی کھلنا چاہیےاور جیب بھی کھلنی چاہیے، نیز اللہ کے بندوں کے حق بھی ادا ہونے چاہئیں۔

وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (الماعون:۶)

''اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) برتنے کے لیے نہیں دیتے۔''

ماعون کے معنوں میں بھی صحابہ کرام اور ہمارے مفسرین کی کئی آرا ہیں۔ ایک کے معنی تو اس کے زکوٰۃ کے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی ذکر فرمایا ہے وہاں پر زکوٰۃ کا لفظ ہے۔ ایک دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ اس سے مراد معمولی چیزیں ہیں، جو لوگوں کے برتنے اور استعمال کرنے کی

ہوتی ہیں۔ چناں چہ بعض حدیثوں کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جیسے پانی کا ڈول جو کنویں سے پانی نکالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یا گھر کے اندر پائپ لگا ہوا ہے یا ٹیوب ویل لگا ہوا ہے اور لوگوں کو پانی کی ضرورت ہے مگر دروازہ بند ہے کہ کوئی اندر نہ آنے پائے۔ حالاں کہ پانی تو عام استعمال کی چیز ہے۔ اسی طرح اس سے مراد آگ جلانے کی چیزیں یا دیا سلائی ہے کہ جواب ہمارے ہاں تو اتنی معروف نہیں ہے لیکن عرب میں تو یہ بھی بڑی چیز تھی کہ کوئی چیز آگ جلانے کو مل جائے۔ اگر سواری کی فوری ضرورت پڑ گئی تو اسے سواری دے دی جائے۔ گویا ماعون سے مراد وہ چیزیں ہیں، جو عام استعمال کی ہوں یا حقیر ہوں اور آدمی ان کو بھی روک کر بیٹھا رہے اور چاہے کہ یہ بھی اس کو نہ دینی پڑیں اور کسی کے استعمال میں نہ آئیں۔ اسی طرح یہ خیال کرنا کہ کوئی ڈرائنگ روم میں آ کر نہ بیٹھ جائے کہ یہ گندا ہو جائے گا۔ اس لیے باہر سے ہی کھڑے کھڑے رخصت کر دیا، یا یہ کہ یہ غریب یا حقیر ہے اس لیے اس لائق نہیں کہ اندر آ کر بیٹھ جائے۔ یہ بہت ساری چیزیں آج بھی معاشرے کے اندر مل جائیں گی۔ گویا یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ سے مراد ہے وہ، جو معمولی برتنے کی چیزوں کو بھی روک کر بیٹھ جائیں۔

اسی طرح اس سے مراد مَنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ (ق:۲۵) یعنی خیر اور بھلائی سے روکنے والا اپنے آپ کو بھی روکنے والا اور دوسروں کو بھی روکنے والا۔ اس لیے قرآن مجید نے جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے لیے مُعۡتَدٍ اور اَثِیۡمٍ دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ (ق:۲۵) کا لفظ اعتدال سے نکلا ہے، اس کے معنی زیادتی کرنے کے ہیں، یعنی کسی دوسرے کا حق ہاتھ بڑھا کر چھین لینا۔ اثیم کا لفظ اثم سے نکلا ہے، جس کے معنی گناہ کے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ رویہ ہے کہ کسی کا حق اگر میرے اوپر آتا ہو تو اس کو میں دینے سے انکار کر دوں اور کہیں اور سے کسی کا حق آتا ہے تو ہاتھ بڑھا کر اسے چھین لوں۔

اس آیت میں ایک تو نماز سے غفلت کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے، دکھاوے کے لیے دین داری برتنے کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرا یہ کہ دل کی تنگی اور بخل کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں، جو معمولی برتنے کی ہیں، ان کو بھی آدمی دینے سے رک جائے۔

نماز سے غفلت کی ایک قسم یہ بھی ہو سکتی کہ نماز تو اس لیے آئی ہے کہ فحش اور منکر سے روکے اور نماز اس لیے آئی ہے کہ اللہ کے ذکر کے ساتھ جاری ہو اور دل اللہ کی طرف متوجہ ہوں

اور ساری نظریں اللہ کی رضا اور خیر پر اور اس کے انعام پر ہوں، مگر اس پہلو سے غفلت رہے۔ یہ دراصل نماز کا ایک مقصد ہے۔ فحش اور منکر سے روکنا ایک دوسرا مقصد ہے۔

اس آیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ کی راہ میں کھلے دل سے دیا جائے اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ جہاں بھی نماز کا ذکر آیا ہے تقریباً ہر جگہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر ضرور آیا ہے۔ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ نماز قائم کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے۔ خاص طور پر جہاں رات کی نماز کا ذکر آئے گا کہ جو اللہ کی خالص بندگی ہے کہ آدمی رات کے اندھیرے میں کھڑا ہو کر اللہ کو یاد کرے تو وہاں پر تو ضرور اللہ نے انفاق کا، اپنے مال میں سے دوسروں کا حق ادا کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہو کر رو دھو لینا ہی دین نہیں ہے بلکہ دین یہ ہے کہ اللہ نے جو مال و دولت دیا ہے. مکان دیا ہے، جائیداد دی ہے، دن میں اس میں سے اللہ کے بندوں کا، سائل کا، محروم کا حق نکالنا ہے اور اللہ نے جو رزق دیا ہے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، اسی کے بندوں پر لٹانا اور اس کی راہ میں لگانا ہے۔ یہی اصل دین ہے۔

اگر آپ کو سورۂ لیل یاد ہو تو وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی راہ میں، جس کو یسریٰ کہا تھا، اس کی جو پہلی صفت بیان کی تھی وہ اعطٰی، یعنی جس نے دیا، بیان کی ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں سے دیا، کتنا دیا، کس کو دیا، کیا دیا، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ راہِ خدا میں خرچ کیا جائے۔ اس لیے کہ اللہ کو اس کی راہ میں دینا محبوب اور مرغوب ہے اور روک کے رکھنا ناپسند ہے۔ آگے چل کر فرمایا کہ جس نے بخل کیا، کنجوسی کی، روک کر رکھا، اور جمع کر لیا، اور اس بات کا بار بار ذکر آ رہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ غضب فرماتے ہیں۔ یہ بات اس کی ناراضی کا سبب ہے۔ یہاں پر اس پوری سورۃ میں قریش کے حوالے سے اس بات کا ذکر ہے۔ آپ غور کریں کہ اشارہ کس طرف ہے۔

قریش کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اس بڑے انعام سے نوازا کہ اپنے گھر کے پاس لا کر بٹھایا اور اس گھر کے واسطے سے جہاں کچھ نہیں ملتا تھا، سب کچھ فراہم کیا اور جہاں چاروں طرف لوگوں کی جان و مال خطرے میں تھی وہاں ان کو امن بخشا۔ لہٰذا قریش کو چاہیے تھا کہ اللہ کی بندگی کرتے اور بندگی کے تقاضے کے طور پر اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ خانہ کعبہ

میں بت بنا رکھے ہیں اور جزا و سزا سے غافل ہو کر یتیموں کے حق مار رہے ہیں اور مساکین بھوکے مر رہے ہیں۔ دین داری دکھانے کے لیے کہ ہم بڑے دین دار ہیں نماز پڑھتے ہیں اور سارے کام کرتے ہیں لیکن یہ سب دکھاوے کے لیے ہے۔ اور ان کے دل اتنے تنگ اور کنجوس ہیں کہ بخل سے بھرے ہوئے ہیں کہ معمولی چیزوں کے لیے بھی ہاتھ نہیں کھلتا۔ اب یہ اس لائق نہیں رہے کہ یہ خانہ کعبہ کے متولی ہوں بلکہ اب تو وہ لوگ جو اللہ کی بندگی کر رہے ہیں، یتیموں اور مساکین کی خوب مدد کر رہے ہیں وہ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی ہوں۔

حضرت جعفر طیارؓ کی تقریر آپ کے ذہنوں میں رہنا چاہیے کہ جب ان سے پوچھا گیا تھا کہ تمہارے نبی نے کیا دین پیش کیا ہے تو انھوں نے اس بات کا بھی ذکر فرمایا تھا کہ ہم بت پوجتے تھے اس نے ہمیں بت پوجنے سے روکا۔ پھر فرمایا کہ انھوں نے ساتھ ہی یہ تعلیم بھی دی ہے کہ ہم یتیموں کا اور بے کسوں کا حق ادا کریں اور بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔ یہ ایک بین الاقوامی دربار میں دین کا تعارف پیش ہو رہا ہے، جو دین محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے تھے۔ وہ اس دین کا تعارف اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ اس نے ہمیں بتوں کو پوجنے سے روکا، مردار کھانے سے روکا۔ ہم حرام مال کھاتے تھے اس سے منع کیا، اور یتیموں اور مساکین کا، غریبوں اور بیواؤں کا، غلاموں کا، ان سب کا حق ادا کرنے کی تعلیم دی۔

اب یہ قوم تیار ہو چکی تھی اور آگے چل کر اسی کا ذکر فرمایا ہے اور نصرت اور فتح کی پیش گوئی کی ہے اور حضورؐ کو کوثر عطا کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے۔

یہ سورتیں اسی ترتیب سے آئی ہیں اور اس مقام پر لے کر جا رہی ہیں کہ جو حضورؐ کی فتح اور نصرت اور آپؐ کے دشمنوں کی بربادی اور ہلاکت پر منتج ہوا۔ اس کے بعد توحید کی راہ مستقیم پر انسانوں کو بلایا گیا ہے اور اس راہ میں، جو خطرات ہیں اور ان سے بچنے کے لیے نسخہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ بیان کیا گیا ہے۔

اب یہ سورتیں اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہیں اور قرآن مجید ختم ہو رہا ہے لیکن ایک خاص انداز میں ختم ہو رہا ہے اور وہ ساری تعلیمات جو دین کا خلاصہ ہیں، جن پر دین قائم ہے، ان کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ دین ان مسائل پر قائم نہیں ہے کہ جن مسائل پر ہم کثرت کے ساتھ پڑھتے ہیں اور تذکرہ کرتے ہیں۔ دین جن صفات پر قائم ہے وہ سخاوت ہے، اخلاص کے ساتھ اللہ کی

بندگی ہے۔ یہ ریا کاری سے بچ کر سارے کام اللہ کے لیے کرنا اور اللہ کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا، ان کے ساتھ نیکی کرنا، ان کے ساتھ نرمی، رحمت اور شفقت کا برتاؤ کرنا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں، جن پر اللہ کا دین قائم ہے۔ یہ وہی تعلیمات ہیں، جو تعلیمات آپؐ لے کر آئے۔

سورۂ شمس سے برابر ان تعلیمات کو دہرایا جا رہا ہے۔ جب بھی ان کو دہرایا جاتا ہے، کوئی نیا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس سورۃ سے یہ معلوم ہوا کہ دراصل آخرت کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ آدمی زبان سے کہہ دے کہ میں آخرت پر ایمان رکھتا ہوں اور ہمیں اللہ کے سامنے جواب دینا ہے، بلکہ آخرت کے عقیدے پر ایمان تو یہ ہے کہ آدمی دوسرے کا حق ادا کرے، دوسروں کا حق نہ مارے ان کے حق کی حمایت کرے اور ان کے حق کے لیے کھڑا ہو جائے۔ اس کی تاکید کرے اور ترغیب دے۔ وہ غنی ہو، اپنا مال نکال نکال کر اللہ کے بندوں پر خرچ کرے۔ یہ دراصل اللہ کی بندگی اور آخرت پر ایمان ہے۔ یہی خدا کی بندگی اور تصورِ آخرت کی تشریح و توضیح ہے، جو یہاں پر اب ختم ہو گئی ہے۔ اب اس کا ذکر نہ آئے گا۔ اس کے بعد توحید کا ذکر آئے گا۔

☆☆

سورۃ الکوثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔
(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا۔ پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔

تشریح: یہ قرآن مجید کی سب سے مختصر سورۃ ہے۔ اس میں تین آیات ہیں۔ اس میں نبی کریم ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کوثر عطا کرنے کی بشارت اور خوش خبری دی ہے، دوسرے یہ کہ اس عطا اور بخشش کے لیے آپ ﷺ کو صرف اللہ کے لیے نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور تیسری بات یہ کہ آپ ﷺ کو یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کے دشمنوں کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ یہ وہی دشمن ہیں، جو قریش سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا ذکر اس سے پہلے سورۂ فیل اور سورۂ قریش میں بھی آچکا ہے۔ ان کی اللہ سے غفلت، آخرت کا انکار، بخل اور کنجوسی اور اللہ کی مخلوق سے بے پروائی اور بے اعتنائی وغیرہ کا تذکرہ بھی گزشتہ سورتوں میں ہو چکا ہے۔ اس سورۃ میں ایک لفظ ''کوثر'' استعمال ہوا ہے اور اسی لفظ کو صحیح طرح سمجھنے کے نتیجے میں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو، جو بخشش اور عطا کی خوش خبری اور بشارت دی ہے وہ سمجھ میں آسکتی ہے:

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ (الکوثر: ۱)
''(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا۔''

ہمارے ہاں اردو زبان میں ایک لفظ ''کثرت'' بولا جاتا ہے، جس کے معنی بہتات یا کسی چیز کے بڑی تعداد میں پائے جانے کے ہیں۔ ''کوثر'' کا لفظ بھی انھی معنوں میں آتا ہے، لیکن یہ لفظ کثرت سے زیادہ مبالغہ اور وسعت رکھتا ہے۔ اس سے مراد ایسی کثرت ہے، جس کی کوئی حد اور انتہا نہ ہو۔ وسعت کے لحاظ سے بھی اور انواع و اقسام کے لحاظ سے بھی۔ یہ لفظ انتہائی کثرت، بھلائی اور خیر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے کسی چیز کی صفت ہے۔ اگر دولت بڑی کثرت سے ہے تو اس کو بھی کوثر کہیں گے۔ اگر کسی چیز کی تعداد بہت کثرت سے ہو، اس کو بھی کوثر کہیں گے اگر روحانی برکتیں بڑی کثرت کے ساتھ ہوں تو انھیں بھی کوثر کہہ سکتے ہیں۔

کوثر سے کیا مراد ہے؟

اگر احادیث کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو ایک بڑی تعداد میں، تقریباً ۵۰ سے زائد احادیث میں صحابہ کرامؓ نے اس کے معنی بیان کیے ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز ایک حوض ہوگا جہاں پیاسے پہنچیں گے، آپ ﷺ کی امت جمع ہوگی اور آپ ﷺ امت کی پیاس بجھائیں گے۔ کچھ اور روایات میں جنت میں ایک نہر کا تذکرہ ملتا ہے، جس کا نام کوثر ہے، جو مستقل وہاں پر بہہ رہی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، اگرچہ کچھ اختلاف بھی ہے لیکن ان دونوں روایات کے اندر کوثر ایک متعین چیز کا نام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے صحابہ، تابعین اور مفسرین نے کوثر کے معنی اپنے اندر دین و دنیا کی ساری بھلائیوں کو جمع کرنے والی لیا ہے۔ سعید بن جبیرؒ ایک مشہور مفسر قرآن ہیں، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ اس سے مراد قیامت کے روز پایا جانے والا حوض اور ایک نہر ہے، جس کا نام کوثر ہے۔

ایک روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ اس کے اندر دین و دنیا کی ساری بھلائیاں، خیر اور دولت و ثروت، سب اس کے اندر جمع ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے معنی حوض اور نہر کے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ وہ معنی بھی اس کے اندر شامل ہیں۔ گویا اس کے اندر کسی قسم کا کوئی اختلاف یا معنوں میں تضاد نہیں ہے۔ ایک جامع معنی ہیں اور خیر اور بھلائی کا ایک حصہ ہے، جسے نہر اور حوض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اس کے معنی صرف حوض اور نہر کے ہیں تو اس حوالے سے کوئی آیت یا حدیث نہیں ملتی، جو اسے ان معنوں تک محدود کرتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی یہاں کوئی تحدید نہیں کی اس کے معنی حوضِ کوثر یا نہر کے ہیں بلکہ الکوثر کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

اس لحاظ سے اس کے معنی عام بھی ہیں اور اگر کسی مخصوص چیز کی طرف اشارہ کیا جائے تو وہ بھی لیے جاسکتے ہیں۔ چناں چہ مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کا ترجمہ یہی کرتے ہیں کہ اس سے مراد حوضِ کوثر بھی ہے اور وہ ساری بھلائیاں اور نعمتیں بھی ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو عطا کیں۔ ان سب پر کوثر کا لفظ حاوی ہے۔

اگر اس سے کوئی خاص چیز مراد ہے تو پھر ہمارے علما اور مفسرین نے اس میں کچھ اور چیزوں کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس سے مراد صرف حوض اور نہر نہیں ہے بلکہ حضورؐ کی نبوت، قرآن مجید، وہ علم و حکمت، جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو عطا فرمایا، دین اسلام، جو توحید پر قائم ہے، آپ ﷺ کی امت، جو اپنے غلبے، قوت، کامیابی، کثرت ان سب کے لحاظ سے دنیا میں سب سے ممتاز ہے، یہ سب مفہوم بھی اس میں شامل ہیں۔

ہمارے دور کے ایک مفسر نے اس کے معنی خانہ کعبہ کے بھی کیے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو خانہ کعبہ کا ہی ذکر سورۂ فیل اور سورۂ قریش سے چلا آ رہا ہے اور خانہ کعبہ ہی دنیا میں امن اور ہدایت کا مرکز ہے اور خانہ کعبہ ہی پر امت دنیا میں جمع ہوتی ہے۔ یہ خانہ کعبہ ہی کی کنجی تھی، جس کے ذریعے پورا عرب مغلوب ہو گیا اور لوگ دین میں فوج در فوج داخل ہوئے، جس کے نتیجے میں امت کی کثرت، قوت اور طاقت میں اضافہ ہوا اور یہی کنجی تھی، جس کے ذریعے سارے عالم کی فتوحات کا دروازہ کھلا۔

مفسرین نے اس کے مخصوص معنی بھی لیے ہیں اور عام معنی بھی اور یہ سب ہی اس لفظ کے اندر جمع ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ضحیٰ میں نبی کریمؐ سے، جو وعدہ فرمایا تھا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰىؕ ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰىؕ ۝ (الضحیٰ: ۴،۵)

''اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔''

وہ یہاں پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہاں یُعْطِیْکَ کے لفظ سے مراد تھی کہ آپ ﷺ کی زندگی میں یا آپ ﷺ کے بعد، جو بھی دور آنے والا ہے اس میں جو بھی خیر اور بھلائی جمع ہوگی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو وہ کچھ عطا کرے گا کہ جس سے آپ ﷺ راضی اور خوش ہو جائیں گے۔ اگر ہم یہاں لفظ ترضیٰ پر غور کریں اور پھر جاننے کی کوشش کریں کہ آخر حضور نبی کریم ﷺ کی سب سے بڑی دلی خواہش کیا تھی۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ لوگ آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کر لیں۔

قرآن مجید نے بھی بار بار اس کا ذکر کیا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۝ (الکھف:۶)

اچھا، تو اے نبیؐ، شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو، اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔''

یعنی آپؐ پر بار بار یہ واضح کیا گیا کہ آپؐ سب لوگوں کو ہدایت پر نہیں جمع کر سکتے۔ لیکن آپؐ کی یہ فکر، یہ خواہش اور یہ آرزو بحیثیت رسول سب سے بڑی خواہش اور آرزو تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ حق کو قبول کر لیں، دوزخ سے بچیں، جنت کی راہ میں چلیں. آپ ﷺ کا دامن تھام لیں، آپ ﷺ کے پیچھے چلیں اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مستحق ٹھہریں۔ اسی میں آپ ﷺ کے لیے سب سے بڑی خیر و برکت بھی تھی۔ اگر لوگ آپ ﷺ کی دعوت قبول کرتے، آپ ﷺ کا دامن تھام لیتے اور آپ ﷺ کے ساتھ آتے تو پھر قیامت تک ہدایت کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ حضور ﷺ کی ذات سے جو سلسلہ شروع ہوا، جو اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا، اس کی نیکی، خیر اور بھلائی آپ ﷺ کے دم سے ہے اور اس سب کا اجر آپ ﷺ کے لیے ہے۔ لہٰذا خیر کی سب سے بڑی نہر دین اور ہدایت ہے، جسے لوگوں نے قرآن، ہدایت، حضورؐ کی نبوت، اسلام اور توحید کی دعوت وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ ان سب کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ ﷺ کو ذاتی طور پر سب سے بڑا فیض اور اجر ملے گا وہ اس

لیے کہ آپ ﷺ نے شہادت کا فرض ادا کیا، امانت کا حق ادا کر دیا اور حق کو پہنچا دیا اور لوگوں نے آپ ﷺ کے سامنے حق کو قبول بھی کر لیا۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى O (الضحیٰ:۵) کی صورت میں حضورؐ سے وعدہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو اتنا عطا کرے گا، یہاں تک کہ آپ راضی ہو جائیں، نہال ہو جائیں اور خوش ہو جائیں، اس میں سب سے بڑی بات یہی تھی۔ لوگوں نے کوثر میں آپؐ کے اخلاق کو بھی شمار کیا ہے۔ وہ اخلاق، جن کے بارے میں فرمایا گیا:

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ O (القلم:۴)

''آپؐ اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہیں۔''

کسی شخص کے اخلاق عظیم کی شہادت اس کے خالق نے اس طرح نہیں دی، جس طرح حضور ﷺ کے اخلاق فاضلہ اور اخلاقِ کریمانہ کی شہادت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس پر یہ بات بھی گواہ ہے کہ اگرچہ مخالفین نے آپ ﷺ پر چھوٹے موٹے الزامات لگا کر آپ ﷺ پر کیچڑ اچھالی ہے لیکن بحیثیت مجموعی دوست دشمن سب نے اعتراف کیا ہے کہ اخلاق کے لحاظ سے آپ ﷺ کی کوئی نظیر اور مثل دنیا کے اندر موجود نہیں۔

قرآن مجید جو آپ ﷺ کی نبوت کا سرچشمہ ہے اور جس میں خود سورۂ کوثر موجود ہے، وہ قرآن مجید خود کتنا بڑا خیر کثیر ہوگا۔ الکوثر کے مفہوم میں قرآن مجید بھی شامل ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کی امت بھی کوثر میں شامل ہے۔ کسی نبی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مقام عطا نہیں ہوا کہ اس نے اپنی زندگی میں پوری کی پوری قوم کو اپنے دین کے دائرے میں داخل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اور اس کی نظروں کے سامنے اس کی قوم نے دین کو قبول کیا ہو اور فوج در فوج، گروہ در گروہ لوگ شامل ہونے لگے ہوں، اور اس کی نگاہوں کے سامنے دین غالب ہو گیا ہو۔ عیسائیت بھی دنیا کے اندر غالب آئی لیکن سیدنا مسیح علیہ السلام کے ڈھائی سو سال کے بعد۔ اس کے علاوہ جن پیغمبروں کی داستان قرآن نے سنائی ہے، ان کی قوموں کی تباہی کے بعد ان کو غلبہ ملا۔ لیکن قریش کے وہ چند سردار، جنھوں نے حضورؐ کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی تھی، جنھیں غزوۂ بدر میں ہلاک کر دیا گیا، ان کے علاوہ اہلِ عرب نے بڑی تعداد میں ایمان قبول کیا، اسلام کے داعی بن کر کھڑے ہوئے اور بالآخر دنیا کے گوشے گوشے میں اس کو پہنچایا۔

اسی طرح کوثر کے مفہوم میں آپ ﷺ کا ذکر بھی شامل ہے۔ اس کی طرف قرآن مجید نے پہلے بھی واضح اشارہ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰیO (الضحیٰ:۵) یعنی عنقریب تمھارا رب تمھیں اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے، میں کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (الم نشرح:۴) کہ ہم آپ ﷺ کے ذکر کو بلند کرنے والے ہیں۔ آپ ﷺ کا ذکر اس طرح بلند ہوا کہ ایک ایسا بچہ جو یتیم پیدا ہوا، جس کے پاس کوئی مال و اسباب اور وسائل نہیں تھے، جس کا کوئی سہارا نہیں تھا، جو بالکل اکیلا تھا، جس کا کوئی حامی و ناصر نہیں تھا، اس کا اس تیزی کے ساتھ شہرہ ہوا کہ صرف ۴۰ سال کے عرصے میں مہذب دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا نام پکارا جانے لگا۔ پہاڑوں میں، وادیوں میں، میدانوں میں، کھیت اور کھلیانوں میں، جنگلوں اور بیابانوں میں، شہروں اور دیہاتوں میں، مسجد کے میناروں سے، حجروں اور گھروں سے اس پر علانیہ درود بھیجا جانے لگا۔ آپ ﷺ کا اس طرح سے ذکر بلند ہونا، یہ نعمت بھی آپ ﷺ کو کوثر کی صورت میں عطا ہوئی۔

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (الکوثر:۱) میں انا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ بے شک ہم ہی نے دیا ہے، اور یہ ماضی کا صیغہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی۔ بعض نے صلح حدیبیہ کا وقت بتایا ہے اور بعض نے اس سے پہلے کا وقت بتایا، لیکن پوری سورۃ جس سیاق میں آئی ہے اور جو اس کا مضمون ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ سورۃ اس سے قبل نازل ہوئی، جب کوئی آثار اس بات کے نہیں تھے کہ پورا عرب اس دین کو قبول کرنے والا ہے، بلکہ آپ ﷺ کے اپنے قبیلے کے لوگ ہی آپ ﷺ کے قتل کے درپے تھے۔ اس وقت کوئی ایسی امید نہیں تھی سوائے اس کے کہ مدینہ کے چند کسانوں نے آ کر آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا تھا اور تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا میں اس دین کی سربلندی کی بظاہر کوئی امید نہ تھی اور اس بات کے کوئی آثار نہیں تھے کہ یہ امت پوری دنیا کے اندر غالب ہوگی۔ لیکن حضورؐ کو اس بشارت پر یقین تھا اور آپ ﷺ نے اسی بنیاد پر مدینہ ہجرت فرمائی اور مدینہ جاتے ہوئے سراقہ کو اس بات کی بشارت دی تھی کہ وہ وقت آئے گا کہ جب کسریٰ کے کنگن تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے۔ یہ اللہ کے وعدے پر بے پناہ یقین تھا ورنہ کس طرح ایک آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ کسریٰ کی سلطنت زیر ہو جائے گی اور کسریٰ کے کنگن

تمھارے ہاتھوں میں ہوں گے۔ یہ ہجرت سے قبل ہی کی بشارت تھی، جس میں آپ ﷺ کی بخشش کا بھی ذکر ہے اور آپ ﷺ کے دشمنوں کی تباہی کی خبر بھی دی گئی ہے۔

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ دراصل کثرت، غلبہ اور وسعت اس دعوت کا مقدر تھا، جس کو حضور ﷺ لے کر آئے تھے۔ اس کے مقابلے میں تنگی، سکڑنا اور بالآخر مغلوب ہو جانا، اس کلمے اور زندگی کے لیے تھا، جس کے علم بردار آپؐ کے مخالف تھے۔ یہ بھی دنیا نے حضورؐ کی زندگی ہی میں اور آپ ﷺ کے بعد صرف چند برسوں کے اندر اندر دیکھ لیا کہ کس طرح یہ امت پھیلتی چلی گئی اور اسلام کو غلبہ حاصل ہوتا چلا گیا اور دوسرے لوگ سکڑتے اور محدود ہوتے چلے گئے۔ آج بھی اس گئی گزری حالت میں دنیا یہ محسوس کرتی ہے کہ واقعی اگر کوئی ایسا گروہ موجود ہے یا امت موجود ہے جو ایک بار پھر اٹھ کر دنیا کی مالک بن سکتی ہے تو وہ یہی امت محمد یہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔

پہلی آیت میں حضور ﷺ کی بخشش کی خوش خبری سنائی گئی ہے، جو دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیوں پر محیط ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا اور اس میں جنت کا وہ حوض اور نہر بھی شامل ہے، جس کی احادیث میں بڑی کثرت کے ساتھ بشارت دی گئی ہے۔ اسی کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے روز تم لوگ اس حوض پر آؤ گے اور میں تم سے پہلے اس حوض پر پہنچ جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر میں پیاسوں کو پانی پلاؤں گا۔ اس کا مشروب شہد سے زیادہ میٹھا اور دودھ اور بعض روایات کے مطابق چاندی سے بھی زیادہ سفید اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہوگا، جو وہاں پلایا جائے گا۔ اس روز جو اس سے سیراب ہوگا صرف اسی کی پیاس بجھے گی اور جو اس سے سیراب نہیں ہوگا اس کی پیاس نہیں بجھے گی۔ یہ بھی کوثر کے مفہوم میں شامل ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ کوثر کا یہ بھی مطلب ہے اور یہ اس خیر اور بھلائی کے اندر شامل ہے، جس کا حضورؐ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو حوضِ کوثر بھی دراصل ایک مثال ہے اس دین کی اور ان کامیابیوں کی اور اس خیر اور بھلائی کی، جو قرآن، نبوت، دین، توحید اور خانہ کعبہ کی فتح، عرب کی فتح اور سارے عالم کی فتح کی صورت میں آپؐ کو عطا کی گئیں۔ چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سب سے پہلے اس حوض پر پہنچوں گا اور آپؐ نے ہی فتح مکہ سے ان فتوحات کا آغاز فرمایا، جس کا دائرہ اتنی تیزی کے ساتھ پھیلا کہ اتنی تیزی کے

ساتھ فتوحات کے دائرے کے پھیلنے کی کوئی اور مثال پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اس قدر تیزی کے ساتھ یہ دین پھیلتا چلا گیا کہ اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ بھی دراصل وہی خیر اور بھلائی ہے، جس کا وعدہ اللہ نے نبی کریمؐ سے کیا تھا، جس طرح یہاں لوگ اپنی روح کی پیاس دین سے بجھا رہے ہیں، اسی طرح وہاں اس حوض سے اپنی پیاس بجھائیں گے۔

اسی لیے حضور ﷺ نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جو لوگ میرے طریقے سے ہٹ جائیں گے وہ اس بات کے مستحق نہیں ٹھہریں گے کہ میں ان کو حوضِ کوثر سے پانی پلاؤں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگ لائے جائیں گے اور انھیں فرشتے پکڑ کر لے جائیں گے اور ان کو حوض کوثر سے ہٹا دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ تو میرے ہی لوگ اور میرے ہی امتی ہیں۔ ان کو پکڑ کر کہاں لے جا رہے ہو؟ فرشتے کہیں گے کہ آپ ﷺ نہیں جانتے کہ یہ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے راستے سے ہٹ گئے تھے۔ انھوں نے آپ ﷺ کے طریقے میں تبدیلیاں کردی تھیں اور دوسرے راستوں پر چل نکلے تھے۔

اگرچہ یہ سورۃ آپ ﷺ کے لیے خاص ہے، لیکن پورا قرآن امت کے لیے ہے اور جو نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو عطا فرمائیں ان کا کوئی نہ کوئی حصہ اس امت کے لیے بھی ہے، جو بشارتیں آپ ﷺ کو دیں، ان کا وعدہ امت سے بھی ہے۔ اگرچہ کسی شخص یا پوری امت کو وہ خیرِ کثیر اس طرح تو حاصل نہیں ہوسکتا، جس طرح حضورؐ کو حاصل ہوا لیکن اس کا کچھ نہ کچھ حصہ سب کو مل سکتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے یہ بتایا کہ جب لوگ حوضِ کوثر پر سے ہٹا لیے جائیں گے اور ان کو پانی نہیں ملے گا تو ان الفاظ کے ساتھ فرمایا کہ دیکھو، وہاں میرا منہ کالا نہ کرنا کہ تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں تو دعویٰ کروں کہ یہ میرے امتی ہیں اور فرشتے کہیں کہ نہیں، یہ آپؐ کے امتی نہیں ہیں بلکہ یہ آپ ﷺ کے راستے سے ہٹ گئے تھے اور انھوں نے دین کو بدل ڈالا تھا۔ اس لیے یہ پوری امت بھی اس بشارت کی مستحق ہے۔ اگر وہ اس نبوت، قرآن مجید اور دعوت کو لے کر کھڑی ہو تو اس کے لیے وسعت، غلبہ اور دنیا میں خیر اور بھلائی ہے اور آخرت میں حوضِ کوثر، کوثر کی نہر اور جنت ہے۔ اگر وہ حضور ﷺ کے راستے سے ہٹ جائے تو دعوت، رسالت اور جہاد کا راستہ ہے تو دنیا میں بھی مغلوبیت، ذلت اور پسپائی ہے، اور ایک ارب سے زائد ہونے کے باوجود دوسروں کے رحم وکرم پر ہونا ہے، اور آخرت میں حضور ﷺ کی ناراضی اور قرب سے محرومی۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○ (الکوثر:۲)

''پس تم اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔''

لفظ ف کا مطلب ہے کہ پھر تم ایسا کرو۔ اس کے بہت واضح معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوثر کے لفظ میں اپنے جس عطیے اور بخشش کا ذکر کیا ہے اس کا اور نماز اور قربانی کا آپس میں ایک تعلق ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ چوں کہ ہم نے تمھیں یہ خیر کثیر عطا کی ہے، پس تم نماز پڑھو اور قربانی دو۔

یہ تعلق کئی پہلو سے واضح ہے۔

پہلی بات نماز کے حوالے سے یہ سمجھنے کی ہے کہ نماز کی ایک صورت تو عبادت کی ہے، جو ہم پڑھتے ہیں اور یہ پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ نماز ایک لحاظ سے اللہ کی پوری زندگی کا اظہار ہے۔ اگر غور کیا جائے تو نماز میں وہ ساری چیزیں جمع ہیں جن کا اللہ نے اپنے بندوں سے پوری زندگی میں مطالبہ کیا ہے۔ یہ کہ صرف میری طرف رخ کرو، صرف مجھے ہی اپنا مقصود و مطلوب بناؤ، صرف میرے اوپر نظر رکھو، اور نماز میں ہم قبلے کی طرف رُخ کر کے اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔ ساری دنیا کو چھوڑ دو اور صرف میری بڑائی کو تسلیم کرو، ہم اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر دنیا کو رخصت کرتے ہیں اور اس سے بے نیاز ہو کر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ساتھ قول و قرار کرتے ہیں۔ یہ ہم زبان سے بھی کرتے ہیں اور اشاروں سے بھی، انگلی اٹھا کر بھی کرتے ہیں اور پیٹھ جھکا کر بھی کرتے ہیں اور اس کے آگے اپنے آپ کو بچھا کے اور جھکا کر سجدے کی حالت میں بھی۔

یہ سب اس بات کا اقرار ہے کہ ہم اس کے احکام کے آگے جھک جائیں گے، اس کے آگے بچھ جائیں گے اور اپنے آپ کو اس کے آگے سپر ڈال دیں گے اور اس کی بندگی کریں گے۔ اسی لیے نماز اور زکوٰۃ کہہ کر اکثر جگہ بات ختم کر دی گئی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ نماز اور زکوٰۃ ہی دین میں سب کچھ ہیں بلکہ نماز دراصل جامع ہے ان سب بندگیوں اور عبادتوں کی، جو اللہ اور بندے کے درمیان ہونا چاہئیں۔ جب کہ زکوٰۃ مالی عبادات و اطاعت کا نام ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو کوثر عطا کی ہے، یہ دراصل اسی بات کا نتیجہ

ہے کہ حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں اور آپ ﷺ کی امت نے اللہ کی بندگی اور اس کی راہ میں قربانی، ان دو چیزوں کو اختیار کیا۔

نحر کے معنی قربانی کے ہیں۔ عربی زبان میں نحر اونٹ کو ذبح کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربوں اور بنی اسمٰعیل کے لیے اونٹ کی قربانی سب سے محبوب قربانی تھی۔ حضور ﷺ نے اپنے آخری حج کے موقعے پر منٰی کی قربان گاہ میں کھڑے ہو کر ۱۰۰ اونٹ نحر فرمائے تھے۔ ۶۳ اونٹ آپ ﷺ نے خود ذبح کیے تھے اور اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ۶۳ برس تھی اور باقی ۳۷ اونٹ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کے حوالے کر دیے تھے۔ اسی طرح نحر کا لفظ ہر جانور کی قربانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پھر یہ اس قربانی کا بھی قائم مقام بن گیا، جو قربانی دراصل سنت ابراہیمی علیہ السلام تھی، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اپنی سب سے محبوب چیز، یعنی اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری رکھ دی تھی۔ چناں چہ اس کی قائم مقام ساری قربانیاں ہو گئیں خواہ وہ بکرے کی ہو، دنبے کی ہو، گائے کی ہو یا اونٹ کی۔ درحقیقت قربانی کا تعلق اس اطاعت سے ہے، جس میں انسان اللہ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ایک طرف نماز ہے اور دوسری طرف قربانی اور دنیا کے اندر امت کو جو کثرت، وسعت، غلبہ اور فتح مکہ اور عالم عرب و عجم کی فتح کی جتنی بھی بشارتیں کوثر کی صورت میں ملیں، ان سب کی کلید دراصل اللہ کی بندگی اور اللہ کی راہ میں قربانی ہے۔

اس میں ایک شرط اخلاص کی بھی لگائی گئی ہے اور وہ ہے لِرَبِّکَ یعنی نماز پڑھو، بندگی کرو اور قربانی دو صرف اپنے رب کے لیے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ عرب کے اس پسماندہ معاشی معاشرے میں اللہ کے بندوں کو کھلانے پلانے، ان کی ضروریات پوری کرنے اور ان کی خدمت کرنے کا بڑا ذریعہ قربانی ہی تھی۔ چناں چہ قرآن نے کہا ہے کہ قربانی کرو، لوگ اس کے فائدے کا مشاہدہ کریں، مستفید ہوں، خود بھی کھائیں اور غریب لوگوں کو بھی کھلائیں۔

اس سے پہلے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ اہل قریش، جو خانہ کعبہ کے متولی تھے انھوں نے شرک کی آمیزش کر کے اللہ کی بندگی کو بھی ضائع کر دیا تھا اور نماز سے بھی غافل ہو گئے تھے۔

اَلَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ○ الَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ○ (الماعون:۵،۶)

’’جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں۔‘‘

اسی لیے فرمایا کہ تم صرف اللہ کے لیے نماز کو خالص کر کے پڑھو۔ اس کے بعد فرمایا:

وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ○ (الماعون:۷)

’’اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔‘‘

وہ کنجوس اور بخیل ہو گئے تھے۔ یتیموں کو دھکے دیتے تھے، مسکینوں کو کھانا کھلانے کا اہتمام نہیں کرتے تھے بلکہ یہ عام استعمال کی معمولی معمولی چیزیں بھی استعمال کے لیے نہ دیتے تھے اور ان پر بھی سانپ بن کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں پھر یہ آیت آئی، جو صرف اللہ کی خالص بندگی کی دعوت دیتی تھی: یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا ؕ (النور:۵۵) یعنی جو صرف میری بندگی کرتے ہیں اور کسی کو بھی اس کا شریک نہیں ٹھہراتے۔ ایسے ہی لوگوں سے اس نے زمین میں خلافت کا وعدہ فرمایا کہ ان کو زمین میں اقتدار دیا جائے گا اور یہ حکم دیا کہ جب تمہیں خلافت دی جائے تو پھر نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے۔

زکوٰۃ بھی قربانی کا قائم مقام ہے۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں اپنے مال کو بندوں کے لیے اللہ کی راہ میں قربان کرنا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وسعت، غلبہ اور سربلندی کے لیے بنیاد دراصل اللہ کی خالص بندگی اور اس کی راہ میں قربانی دینا۔

نماز اور قربانی کا یہ تعلق بھی بہت واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے وسعت، دین کا غلبہ اور اس کی کثرت اور عالم عرب و عجم کی فتح و نصرت کی نعمت بخشی ہے تو پھر ان کا بھی کچھ حق ہے۔ ہر نعمت کا ایک حق ہوتا ہے اور ایک ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اس نعمت کا حق یا اس کے ساتھ، جو ذمے داری آئی اس کا یہ طریقہ ٹھہرا کہ اللہ کی خالص بندگی کی جائے اور اس کی راہ میں ہر قسم کی قربانی دی جائے۔ یہ صراطِ مستقیم ہے، یہی دین قیم ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ بھی یہی ہے اور اسی بات کو خود اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ کھول کر یوں بیان فرمایا ہے:

قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۬ۚ دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ۚ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ○ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ○ لَا شَرِیۡکَ لَهٗ ۚ (الانعام:۱۶۱-۱۶۳)

"اے نبیؐ، کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے، بالکل ٹھیک دین، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ، جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔"

گویا میرے رب نے مجھے، جو صراطِ مستقیم دکھائی ہے، یہ دین قیم، سیدھا دین ہے، یہ ابراہیمؑ کا طریقہ ہے اور یہ سب سے کٹ کر صرف اللہ کا بن جانے کا نام ہے۔ اس میں کسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

نُسُک ان قربانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو حج کے موقعے پر کی جاتی ہیں اور اسی سے لفظ مناسک حج نکلا ہے۔ حج کے موقعے پر انسان بہت سی قربانیاں دیتا ہے۔ عملاً وہ سب کچھ ترک کردیتا ہے، خوشبو، لباس، بیوی کے ساتھ تعلق، اولاد، عزیز، رشتے دار، دوست احباب، وقت، سرمایہ، آرام وراحت اور آخر میں اپنا جانور تک بھی قربان کردیتا ہے۔ ان کو مناسک حج اسی لیے کہا جاتا ہے کہ حج میں قربانی شامل ہے۔ یہ دراصل اللہ کی نعمتوں کا شکر ہے، ان کا حق ہے اور ان کا حق ادا کرنے کا طریقہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کوثر کی صورت میں جو بشارت دی ہے، اس کے قیام اور بقا کا راستہ بھی یہی ہے۔ اگر کوئی سمجھے کہ کثرت تعداد سے، ڈالر جمع کرنے سے، کارخانے لگانے سے اس امت کو دنیا کے اندر کثرت، وسعت اور غلبہ نصیب ہوسکتا ہے، تو اس سے اس امت کی ماہیت اور حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ یہاں فرمایا کہ اگر اس کا کوئی نسخہ ہے تو یہی ہے کہ خدا کی خالص بندگی اور اس کی راہ میں ہر طرح سے قربانی کرنا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی کتاب تفہیمات میں اس حوالے سے ایک مشہور واقعہ لکھا ہے کہ افغانستان کا ایک حکمران تھا، جو مسلمانوں کو خراج دیا کرتا تھا۔ اس نے خراج دینے سے انکار کردیا۔ خلیفہ وقت نے لشکر بھیجا اور کہا کہ فوج کشی کرو اور اس سے خراج وصول کر کے لاؤ۔ اس نے کہا کہ وہ لوگ کہاں گئے، جو تم سے پہلے آتے تھے، جن کے پیٹ ان کی کمر سے لگے ہوتے تھے، جن کے پھٹے پرانے کپڑے ہوتے تھے، جن کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان ہوتے تھے، جو راتوں کو جاگتے تھے، انھوں نے کہا کہ وہ لوگ گزر گئے، اب وہ نہیں رہے۔ اس پر اس نے کہا کہ میں تو انھی کو خراج دیا کرتا تھا، تمھیں نہیں دوں گا۔ یہاں بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ کوثر،

قوت اور کثرت کا راز دراصل فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ہے۔

ایک لحاظ سے یہ اللہ کے ساتھ معاہدہ بھی ہے۔ اللہ نے اس امت کو ہدایت دی، نبوت دی، قرآن دیا اور وہ اس پر قائم ہوگئی تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کی پابند ہوگئی۔ یہ معاہدہ لکھ پڑھ کر کہیں نہیں ہوا۔ یہ اسی طرح ہے، جس طرح تنخواہ وصول کرنے کے بعد ملازم پابند ہوجاتا ہے کہ وہ آقا کے حکم کی تعمیل کرے اور بندہ جب اپنے رب کے دسترخوان سے کھاتا ہے تو وہ اس کا پابند ہوجاتا ہے کہ وہ اس کی بندگی کرے۔ امت مسلمہ نے جب قرآن مجید، نبوت محمدیؐ، اسلام اور امامتِ عالم کا منصب قبول کرلیا تو وہ اس بات کی پابند ہوگئی۔ اب اس نے اپنے اللہ سے عہد کرلیا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اس کو عہد سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی دی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (البقرۃ:۱۲۴)

''میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔''

جب انھوں نے پوچھا کہ کیا یہ عہد میری اولاد کے بارے میں بھی ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ○ (البقرۃ:۱۲۴)

''میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔''

گویا یہ اب میرے اور تمھارے درمیان معاہدہ ہوگیا کہ تم قربانی کرو، تم نے میری راہ میں اپنا بیٹا قربان کیا اور تمھاری اولاد بھی اگر بندگی پر قائم رہے گی تو یہ میرا عہد پورا ہوگا اور اگر وہ عہد پر قائم نہیں رہے گی تو میرا یہ عہد بھی ان کے حق میں پورا نہیں ہوگا۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ ۚ (البقرۃ:۴۰)

''میرے ساتھ تمھارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں۔''

اس طرح سے اس نے یہ صاف اعلان فرمادیا ہے، اور اس طریقے سے یہ عہد کی ایک صورت بن گئی ہے۔

قربانی اور نماز کا بھی آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ نماز دراصل بدنی قول وقرار اور اظہارِ بندگی ہے۔ اللہ کی راہ میں چلنے کے لیے قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو ان چیزوں

سے روکنا، جو اللہ کو ناپسند ہیں، اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہے۔ صرف نماز پڑھ لینے، سجدہ کر لینے یا وضو کر لینے سے آدھا کام ہوتا ہے، جو کہ آسان کام ہے۔ اس کے مقابلے میں مشکل کام یہ ہے کہ جو بات اللہ کو ناپسند ہے اس کے قریب بھی نہ پھٹکا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا:

لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرۃ: ۳۵)

"مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا، ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔"

اصل امتحان تو یہ تھا۔ گویا جس چیز سے روکا جائے اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک قربانی جان کی قربانی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں جان بھی دینے کو تیار رہے اس کا بھی مطالبہ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ایک قربانی وہ ہے، جب آدمی اللہ کی راہ پر چلتا ہے تو وہ اس کی نافرمانی کا مرتکب نہ ہو۔ مرنا تو شاید اس راہ میں نسبتاً آسان ہو لیکن جینا زیادہ مشکل کام ہے۔ جینے میں تو ہر ہر قدم پہ جان نکلتی ہے۔ ہر وہ پیسہ، جو جیب سے نکلتا ہے، اس پر جان نکلتی ہے۔ دنیا کی جو نعمتیں چھوڑنا پڑتی ہیں ان پر جان جاتی ہے، اس کے لیے آدمی دن میں ہزار بار مرتا ہے۔ اس لیے اگر اسے اللہ کی راہ پر چلنا ہے، اس کی بندگی کرنا ہے تو جگہ جگہ اسے قربانی دینی ہو گی۔ اس لیے قربانی اور نماز کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

قرآن نے نماز اور قربانی کے حوالے سے اس تعلق کو بھی واضح کر دیا ہے کہ دراصل نماز اللہ کی یاد ہے، مومن کی زندگی ہے اور جہاں اللہ کی یاد ہوتی ہے وہیں زندگی ہوتی ہے اور قربانی بھی زندگی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قربانی ہی زندگی کی کلید ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۵۴)

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔"

گویا وہ لوگ مارے نہیں گئے بلکہ انھوں نے تو زندگی حاصل کر لی، اپنے لیے بھی اپنی قوم کے لیے بھی اور اپنی ملت کے لیے بھی۔ جو مرنے کے لیے تیار نہ ہوں، پھر ان کے لیے زندگی بھی نہیں ہے۔ یہاں صبر اور صلوٰۃ دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ قربانی کے لیے بھی صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور نماز تو نام ہی بندگی کا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان دو جملوں کے اندر، یعنی

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ پس نماز پڑھو اور قربانی دو صرف اپنے رب کے لیے، اللہ تعالیٰ نے دین کی تمام بنیادوں کو سمیٹ کر بیان کر دیا ہے۔

ایک مفسر لکھتے ہیں کہ یہی دراصل ہماری امت کا امتیاز ہے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ یہودیوں نے قربانی کو تو اختیار کیا، لیکن نماز کو ترک کر دیا۔ ان کے ہاں نماز کا رواج ختم ہو گیا تھا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (مریم:۵۹)

''پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔''

عیسائیوں نے تو نماز اور قربانی دونوں کو ضائع کر دیا۔ جن جانوروں کو یہودی بھی اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں، جیسے سور، ان کو بھی انھوں نے اپنے لیے حلال کر لیا۔ قریش نے اپنی قربانی میں شرک کی آمیزش کر دی۔ وہ اللہ کے لیے خالص نہیں رہی، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ پھر مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں عطا فرمائیں۔ صرف اللہ کی بندگی کرنے، صرف اللہ کے لیے جینے اور مرنے اور اللہ کے لیے قربانی کرنے کا حکم حضورؐ کو دیا گیا اور حضورؐ کی معرفت امت مسلمہ کو دیا گیا۔

اس سورۃ میں حضورؐ اور مسلمانوں کے لیے تسلی اور سہارا بھی ہے اور دشمنوں کی تباہی اور بربادی کی دھمکی بھی۔ اس کا ذکر آخری آیت میں کیا جا رہا ہے۔

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ (الکوثر:۳)

''تمھارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔''

شَانِیْءٌ اس دشمن کو کہتے ہیں، جسے بغض ہو اور اس وجہ سے وہ بدسلوکی کرنے، گالی گلوچ کرنے اور بدنام کرنے پر اتر آئے۔ اس حوالے سے روایات بھی ہیں کہ جب حضورؐ کا کوئی بیٹا زندہ نہ رہا تو لوگوں نے کہا کہ آپؐ کی تو نسل ہی مٹ گئی۔ یہ دشمنوں کے طعنے کے حوالے سے اس کا ایک پہلو ہے۔ اس کا سب سے بڑا پہلو یہ تھا کہ آپؐ اپنے دین سے کٹ گئے، اپنے قبیلے سے کٹ گئے، آپؐ صابی اور بے دین ہو گئے۔ آپؐ نے آباو اجداد کا دین چھوڑ دیا۔ ان کے بقول اس لحاظ سے آپؐ کی جڑ کٹ گئی۔

اس میں ہجرت کی طرف بھی اشارہ تھا۔ ہجرت کے قریب یہ سورۃ نازل ہوئی اور لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ حضور ﷺ مکہ چھوڑ کر اب مدینہ تشریف لے جارہے ہیں۔ مکہ والے تو اپنے لوگ تھے۔ قریش حضور ﷺ کا اپنا قبیلہ تھا، جب کہ مدینہ والے اپنے نہ تھے۔ وہ دوسرے قبائل تھے، جن میں اوس وخزرج بھی شامل تھے۔ مکہ میں خانہ کعبہ تھا، جس سے وابستگی کی وجہ سے قریش کو پورے عرب میں ایک اعزاز حاصل تھا اور سرداری حاصل تھی۔ اس وجہ سے ان کے قافلے شام اور یمن تک جایا کرتے تھے، جب کہ مدینہ میں خانہ کعبہ نہیں تھا۔ جب قریش نے یہ سنا کہ آپ ﷺ مدینہ تشریف لے جارہے ہیں تو انھوں نے آپ ﷺ کو طعنہ دیا کہ آپ ﷺ اجنبیوں کے درمیان جارہے ہیں۔ آپ ﷺ اپنے قبیلے سے بھی کٹے، اللہ کے گھر سے بھی کٹے اور وہاں بھی انھیں کوئی سہارا نہیں ملے گا اور بالآخر ان کے دین کا سلسلہ بھی ختم ہوجائے گا۔ کوئی ان کا حامی وناصر نہیں ہوگا۔

یہاں ہجرت کی طرف اشارہ دے کر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلی دی کہ آپ ﷺ کی جڑ نہیں کٹے گی بلکہ آپ ﷺ کے انصار تو بڑھتے ہی چلے جائیں گے اور آپ ﷺ اجنبی نہیں رہیں گے بلکہ لوگ آپؐ کو اپنے دل میں جگہ دیں گے۔ آپ ﷺ کی حمایت میں وہ اس حد تک جائیں گے کہ اگر آپ ﷺ کہیں گے کہ سمندر میں کود جاؤ تو وہ سمندر میں کود جائیں گے، اور جہاں تک آپ ﷺ کہیں گے آپ ﷺ کے پیچھے چلیں گے۔ وہ انصار، جو اوس وخزرج تھے، وہ عرب جہاں سارا تعلق نسب اور قبیلے کی بنیاد پر ہوتا تھا وہ آپ ﷺ کے ایسے جان نثار بن گئے کہ وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ جو حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے خواہ اس راہ میں ہمارے اشراف، ہمارے نیچے کے لوگ، ہمارے بچے، بوڑھے، خواتین، سب کی گردنیں کٹ جائیں مگر ہم آپ ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ لوگ آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ اسی لیے فرمایا کہ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ جڑ تو آپ ﷺ کے دشمنوں کی کٹنے والی ہے اور آپ ﷺ کو مقام بلند ملنے والا ہے۔

اگلے دس برسوں میں دنیا نے دیکھ بھی لیا کہ پورا عرب آپ ﷺ کے سامنے سرنگوں ہوگیا۔ وہ ۷۰ بڑے بڑے سردار، جو مکہ میں آپ ﷺ کی دشمنی پر کمر باندھے ہوئے تھے، سب کے سب غزوۂ بدر میں ہلاک ہوگئے۔ حالاں کہ فتح مکہ سے تین سال پہلے تک یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ خندق کھود کر مدینہ کا دفاع کررہے تھے۔ آپ کی کس مپرسی اور قوت کی کمی کا یہ حال تھا کہ ایک لشکر جرار کے مقابلے میں آپ ﷺ مکہ خندق کھود کر اپنی حفاظت پر مجبور تھے۔ صرف تین سال بعد ہی

یہ صورت حال تھی کہ آپ ﷺ مکہ کے اندر فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور کسی ایک شخص کو بھی آپ ﷺ کی مزاحمت اور مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر آپ ﷺ کا راستہ روک سکتا۔ یوں آپ کا نہیں بلکہ آپ کے دشمنوں کا نام ونشان اس طرح مٹا کہ ابولہب، ابوجہل کسی کی نسل تک باقی نہیں رہی۔ حضور ﷺ کی صرف ایک بیٹی سے اتنی بڑی تعداد میں آج لوگ موجود ہیں، جو اپنے آپ کو ان سے منسوب کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارا بھی حضورؐ سے رشتہ ملتا ہے، جب کہ ابوجہل یا ابولہب کی اولاد آج دنیا میں موجود نہیں ہے۔ کوئی ان سے اپنا تعلق تک جوڑنا پسند نہیں کرتا۔ اس طرح حضورؐ کی نسبی اولاد بھی موجود ہے اور دینی و روحانی اولاد تو آج ایک ارب سے زائد کی تعداد میں مسلمانوں کی صورت میں موجود ہے ہی۔

یہ سورۃ جو سورۂ فیل، سورۂ قریش اور سورۂ ماعون کے بعد آئی ہے، یہ دراصل حضورؐ کے لیے بشارت ہے۔ اس کے بعد مکہ اور عالم عرب کی فتح و نصرت کی، جو بشارت ملنے والی تھی اس کا ذکر سورۂ نصر میں آیا ہے۔ لیکن سورۂ کوثر میں سارے خیر کو سمیٹ کر آپ ﷺ کو بشارت دی گئی ہے اور اس نعمت کا حق ادا کرنے کا اور اس نعمت کو باقی رکھنے، اس کی بقاو دوام کا اور قوت واستحکام کا نسخہ بھی بیان کر دیا گیا ہے، اور تمام دشمنوں کی بربادی خاص طور پر ابولہب کا نام لے کر، جو سب سے زیادہ کمینگی کے ساتھ آپ ﷺ کی دشمنی پر اترا ہوا تھا، اس کی تباہی کی الگ سے خبر دی گئی ہے۔ اس سورۃ کی صرف تین آیات کے اندر یہ سارا مضمون جمع کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ سورۃ خاص طور پر رسول کریمؐ کے لیے ہے اور جس طرح آقا کی بعض عنایات اپنے خاص بندوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، سورۂ ضحیٰ، سورۂ الم نشرح، سورۂ کوثر، یہ وہ سورتیں ہیں، جو حضورؐ پر خاص عنایات، بخشش اور اللہ کی نظر میں آپ ﷺ کا مقام بلند اور اعزاز اور منصب اور جو خاص عطائیں اور بخششیں آپؐ کو ملنے والی تھیں، اس حوالے سے آپؐ کے لیے اللہ کی خاص عنایات میں سے ہیں۔ لیکن ان میں امت بھی آپؐ کے ساتھ شریک ہے اور کوئی نعمت ایسی نہیں ہے، جس میں امت آپ ﷺ کے ساتھ شریک نہ ہو۔ یہ دین کی نعمت ہو یا ہدایت کی، قرآن کی نعمت ہو یا غلبہ و کثرت کی، سب نعمتوں میں امت آپ ﷺ کے ساتھ شریک ہے اور بشارتوں کی مستحق ہے۔

اس سورۃ کی مخاطب امت مسلمہ بھی ہے۔ امت کو کوثر اسی طرح، اسی درجے میں، اسی مقدار میں تو نہیں مل سکتی، جس طرح کہ حضورؐ کو دنیا میں ملی اور آخرت میں ملے گی لیکن یہ کہ اس کا

کچھ حصہ ضرور ملے گا۔ البتہ اس کی کامیابی کی کنجی صرف اس بات میں مضمر ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کرے اور اس کی راہ میں اور دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرے، جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ روزِ قیامت لوگ میرے پاس حوضِ کوثر پر آئیں گے اور میں ان کو پانی پلانا چاہوں گا لیکن فرشتے ان کا ہاتھ پکڑ کر لے جائیں گے، اور میں کہوں گا کہ یہ تو میری امت کے لوگ ہیں ان کو کہاں لیے جا رہے ہو۔ وہ کہیں گے کہ یہ بعد میں آپ ﷺ کے راستے سے ہٹ گئے اور بگڑ گئے اور انھوں نے آپ ﷺ کے راستے میں تبدیلی کر دی۔ دیکھو! قیامت کے دن میرا منہ کالا نہ کرانا۔ آج جو لوگ قیامت کے روز حضور ﷺ کا منہ کالا کرانے کا سامان کر رہے ہیں، ان کا منہ دنیا میں بھی کالا ہوگا اور آج دنیا میں ہم یہ جگہ جگہ دیکھ رہے ہیں کہ اس امت کے اعمال بحیثیت مجموعی حضورؐ کے لیے روزِ قیامت باعث فخر نہیں۔ یہ اعمال، حضورؐ کا طریقہ جو کہ دعوت اور جہاد کا طریقہ تھا، اس کے مطابق نہیں ہیں اور جس کی نشان دہی فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ میں کی گئی ہے، یعنی ایک خدا کی اطاعت، توحید، اس کی بندگی، صرف اسی کا بن جانا اور اس کی راہ میں، جو قربانی بھی دینا پڑے اس کے لیے تیار رہنا۔ یہ دراصل وہ بات ہے، جس کی مخاطب پوری امت ہے۔ یہی راستا حضورؐ کے لیے خوشی اور مسرت کا باعث ہے اور اسی میں امت کی سربلندی کا راز بھی مضمر ہے۔

اس کے بعد کفر اور کفار سے اعلان برأت ہے اور کفر کے خلاف اعلان جہاد ہے، جس کا تذکرہ آنے والی سورۃ، سورۂ کافرون میں آ رہا ہے۔

سورة الكافرون

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾
وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾
وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے
کہہ دو کہ اے کافرو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا، جن کی عبادت تم کرتے ہو، نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں، جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

تشریح: سورۂ کافرون چھے آیات پر مبنی ہے۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو خطاب کرکے کہا ہے کہ آپؐ کافروں سے کہہ دیں کہ اے کافرو! اس کے بعد چار آیات میں نبی کریمؐ رب کی، جس بندگی کی دعوت دے رہے تھے، اس کی بنا پر آپ ﷺ کے مخاطبین، جن جن کی بندگی کر رہے تھے، اس سے اعلانِ برأت کیا گیا ہے، یعنی ایک دوسرے سے بالکل علیحدگی کا اعلان۔ آخر میں چھٹی آیت میں کہا گیا ہے کہ تمھارے لیے تمھارا راستا اور دین ہے اور میرے لیے میرا راستا اور دین ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ (الکفرون:۱)

''کہہ دو کہ اے کافرو!''

اس سورۃ اور آیت کا آغاز قُلْ سے ہو رہا ہے اور نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ خود مخاطب ہے۔ اس لیے یہ بات واضح اور صاف ہے کہ آگے، جو بات بھی کہی جا رہی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اور اس کی ہدایت کے مطابق کہی جا رہی ہے۔ یہاں اے کافرو! کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

پورے قرآن مجید میں حضورؐ کے مخالفین، کو جو کفر اور شرک کی بے شمار گندگیوں میں مبتلا تھے، کہیں بھی اس طرح مخاطب نہیں کیا گیا۔ یہ تو کہا گیا ہے کہ یہ کفر کرتے ہیں، یہ کافر ہیں۔ جگہ جگہ ان کا ذکر کافروں کی حیثیت سے کیا گیا ہے، لیکن اے کافرو! کہہ کر سوائے اس ایک جگہ کے کہیں اور خطاب نہیں کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں کہا گیا ہے؟ یہاں ان کو کافر قرار دے کر ان کے کافر ہونے کا اعلان کر کے مخاطب کیوں کیا گیا ہے؟ چوں کہ لہجے میں شدت ہے، اس لیے بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کے غضب، غصے اور ناراضی کا اظہار ہے۔

زیادہ صحیح بات دراصل یہ ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی کے آخری دنوں کی سورۃ ہے۔ یہ اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریمؐ اہل مکہ کے سامنے گزشتہ ۱۰، ۱۲ سال میں حق کو آشکارا کر چکے تھے اور ان کے لیے اس کو نہ ماننے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اسے تسلیم نہ کریں۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم بھی مل چکا تھا اور آپ ﷺ ہجرت کرنے والے تھے۔ یثرب کے کچھ لوگوں نے آپ ﷺ کو ٹھکانا فراہم کرنے کی پیش کش بھی کی تھی اور مدینہ ہجرت کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سارے انبیاے کرام کی، جو داستانیں بیان کی ہیں، ان میں ایک بات کا وعدہ فرمایا ہے کہ غلبہ بالآخر رسولوں کے لیے ہے۔ اس لیے کہ رسول، اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ساری کائنات میں غالب ہے، اس لیے غلبہ بالآخر رسولوں کے لیے ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ (المجادلہ:۲۱)

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔''

مختلف جگہ پر، مختلف انداز میں بار بار اس وعدے کا اقرار کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ غلبہ نبی کی زندگی میں ہی ہو جائے۔ تمام انبیا کے بارے میں بھی یہی بات تھی اور حضورؐ کو مخاطب کر کے بھی یہی کہا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے ہم اسے تمھاری زندگی میں دکھادیں اور ہوسکتا ہے کہ ہم تمھاری زندگی کے بعد اسے دکھائیں۔ جن کو اپنی زندگی میں غلبہ دیکھنا نصیب ہوا اور جن کو نہ دیکھنا نصیب ہوا۔ اور ان کی زندگی کے بعد غلبہ ہوا، دونوں قسم کی مثالیں قرآن مجید میں مختلف قصص میں بیان کی گئی ہیں۔ جنھوں نے اپنی زندگی کے بعد غلبہ دیکھنا نصیب ہوا، وہ حضورؐ سے پہلے آنے والے سیدنا مسیح علیہ السلام ہیں۔

انجیل کی بے شمار عبارتیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بار بار اس بات سے متنبہ کیا تھا کہ اگر تم نے میری دعوت سے انکار کیا اور اس کو نہ مانا تو بالآخر تباہی اور ہلاکت تمھارا مقدر ہے۔ بظاہر رومیوں اور یہودیوں نے مل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھادیا تھا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ اس واقعے کے ۳۰ سال کے اندر اندر پوری ہوگئی۔ ۶۱ ہجری میں رومیوں نے حملہ کر کے ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجادی، جس کی اب صرف ایک دیوار باقی ہے، جسے دیوار گریہ کہا جاتا ہے۔ اب تک وہ ہیکل دوبارہ تعمیر نہیں ہوسکا۔ اس موقعے پر رومیوں نے لاکھوں آدمیوں کا خون بیت المقدس میں بہایا، باقی سارے یہودیوں کو گھیر کر دنیا کے اندر تتر بتر کردیا، اور ایک بڑی تعداد کو غلام بنا کر اپنے ساتھ یورپ لے گئے۔ یورپ میں بھی وہ دو ہزار سال تک ذلت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس پر تاریخ گواہ ہے۔ انھیں ایک مخصوص لباس پہنایا جاتا تھا، بات بات پر ان کے محلوں میں حملے ہوتے تھے اور قتل و غارت ہوتی تھی۔ یورپ میں یہودی ہونا ایک گالی تصور کیا جاتا تھا اور اسے ذلیل جانا جاتا تھا۔ اب بھی Anti Sematic کے نام پر یہودیوں کے مخالفین موجود ہیں۔

بعض اوقات یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ آج یہودی غالب ہیں؟ تجارت، معیشت، صحافت، ہر جگہ ان کا تسلط ہے اور اسرائیل کی صورت میں وہ قابض ہیں۔

اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے:

اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران:۱۱۲)

کہیں اللہ کے ذمے یا انسانوں کے ذمے پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔''

یعنی یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ کی طرف سے ان کی رسی دراز کی گئی ہوگی یا لوگوں کے سہارے ان کو

کوئی ٹھکانا میسر آ جائے گا۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یہودیوں کو آج، جو بھی مقام نصیب ہوا ہے وہ اپنے بل بوتے پر نہیں ہے بلکہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے بل پر نصیب ہوا ہے۔ اگر اسرائیل آج سلامت ہے تو انھی کے دم خم سے ہے۔ اگر وہ ہاتھ اٹھالیں تو نہ ان کے اپنے ممالک میں ان کے لیے کوئی جگہ ہوگی اور نہ اسرائیل کا وجود ہی باقی رہ سکے گا۔

دوسرے، اس میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جس قسم کے بھی عذاب آئے ہیں اور وہ تباہی، ہلاکت اور بربادی کے لیے نہ ہوں، محض تنبیہ یا ڈراوے کے لیے ہوں، خواہ وہ زلزلے ہوں، تیز ہوائیں ہوں، طوفان ہوں یا دشمن قومیں مسلط کی جائیں، عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (المرسلٰت:۶) یعنی خدا کی یاد کے عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر ہوتے ہیں۔ اس سے یا تو اتمامِ حجت ہو جاتا ہے یا تنبیہ کی جاتی ہے۔ اس میں امت مسلمہ کے لیے بھی تنبیہ ہے اور اگر وہ جاگ جائے تو اس کے حصے میں بھی غلبہ آ سکتا ہے، اور اگر وہ نہ جاگے گی تو کوئی دوسری قوم بھی اس مقام پر لا کر کھڑی کی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

یہ ایک شبہ تھا، جس کی میں نے وضاحت کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاء کی زندگی میں یہ مرحلہ آتا ہے کہ جب ان کی قوم انھیں مارنے پر تل جاتی ہے، انہیں قتل کرنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ سب انبیاء کی داستانوں میں اس کی مثال موجود ہے کہ ان کی قوم کے لوگوں نے انہیں کہا کہ ہم تمہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے، تمہیں سنگسار کر دیں گے، تمھیں قتل کر دیں گے۔ جب انھیں اس قسم کی دھمکیاں ملنے لگتی ہیں تو وہ اپنی قوم کو چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان کے نکلنے کے بعد پھر وہ قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے، جنگ و جدل یا کسی بھی طریقے سے، جو اللہ کی مشیت ہو۔ تباہی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ یہ دراصل اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اب کافروں پر اس حد تک اتمام حجت ہو چکا ہے کہ انہیں اے کافرو! کہہ کر پکارا جا سکتا ہے اور ان کے خلاف اعلانِ برأت کیا جا سکتا ہے۔ اس میں اس بات کی بھی نشان دہی ہے کہ اب ہجرت، جہاد اور دیگر مراحل پیش آنے والے ہیں۔ چناں چہ اس سورۃ میں مسلمانوں کے لیے بھی یہ پیغام ہے کہ اب مکہ چھوڑ کر جانا ہوگا، ہجرت کرنا ہوگی، اب کافروں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہا جا سکتا، بلکہ ان کے ساتھ جہاد اور قتال کا مرحلہ پیش آنے والا ہے اور بالآخر غلبہ تمھارا ہوگا۔

سورۂ کافرون کو ترتیب کے لحاظ سے یہاں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے بعد اہلِ کفر

پر اتمامِ حجت ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے غلبے کا دور شروع ہونے والا ہے۔ اس غلبے کے نتیجے میں جو کچھ ملنے والا تھا اس میں مکہ فتح ہونے والا تھا، اس کی تولیت حضورؐ کو ملنے والی تھی، پورا عرب آپؐ کے لیے مفتوح ہونے والا تھا، سارا عالم آپ ﷺ کے قدموں میں جھکنے والا تھا، کثرت اور وسعت نصیب ہونے والی تھی، اس کا اشارہ سورۂ کوثر میں اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ کہہ کر کیا گیا ہے۔ ہجرت کے بعد جہاد ہوگا اور اس میں اللہ کی مدد سے مسلمانوں کو فتح کی بشارت تھی، اس کی طرف اشارہ سورۂ نصر میں کیا گیا ہے۔

سورۂ کافرون کی پہلی آیت میں ان تمام امور کی طرف نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد کی چار آیات میں تقریباً ایک ہی بات کہی جارہی ہے:

لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۝ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۝ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ ۝ (الکافرون:۲-۵)

”میں ان کی عبادت نہیں کرتا، جن کی عبادت تم کرتے ہو، نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں، جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے، جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔“

ان آیات کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کے حوالے سے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عربی زبان کے اندر بہت بڑی بڑی باتیں بغیر کسی فعل (verb) کے بیان کی جاسکتی ہیں۔ جملے میں کوئی فعل نہیں ہوتا اور بات مکمل ہو جاتی ہے۔ اردو زبان میں فعل ضرور لگانا پڑتا ہے، مثلاً وہ آدمی عالم ہے۔ یہاں جب تک ”ہے“ استعمال نہ کیا جائے تو بات پوری نہیں ہوتی۔ لیکن عربی میں اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات، جو کئی کئی سطور پر مشتمل ہوتی ہیں، جن میں کئی کئی باتیں کہی جاتی ہیں، لیکن ان میں کوئی فعل نہیں ہوتا اور صرف اسم (Noun) کی بنیاد پر بات مکمل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے عربی سے دوسری زبانوں کے اندر ترجمہ مشکل ہوتا ہے۔ اسم کے اندر زمانہ یعنی ماضی، حال یا مستقبل نہیں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں جانے والا ہوں، یہ مستقبل کی بات ہو سکتی ہے۔ گویا اس کے حوالے سے ماضی، حال اور مستقبل تینوں کی بات ہو سکتی ہے۔ اسی لیے تمام مفسرین میں ان چار آیات کے بارے میں اختلاف کی بنیادی وجہ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عربی زبان میں، جو فعل استعمال ہوتے ہیں وہ بہت محدود فعل ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے انگریزی پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ انگریزی کے بارہ صیغے ہوتے ہیں، یعنی زمانے کے بارہ افعال ہیں، جو استعمال ہوتے ہیں۔ اردو کے اندر کوئی حد ہی نہیں ہے۔ اس میں فعل کی مختلف قسمیں استعمال ہوتی ہیں۔ عربی کے اندر صرف دو قسم کے فعل استعمال ہوتے ہیں۔ ایک ماضی، اور دوسرا نامکمل فعل، یعنی جس میں کام ابھی جاری ہو۔ یہ حال میں بھی ہوسکتا ہے اور مستقبل میں بھی کوئی بات ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی جائے، کوئی جاتا ہے اور کوئی جائے گا یہ فعل ہوسکتا ہے اور ان کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ گویا ایک ہی فعل حال، مستقبل اور حال اور مستقبل کے بغیر ایک کام جو جاری ہو، ان سب کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔

ان آیات میں بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں عابد کا لفظ بطورِ اسم آیا ہے، جس کے معنی بندگی کرنے والا یا عبادت کرنے والا کے ہیں۔ اسی طرح یہاں ایک لفظ حال اور مستقبل دونوں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جیسے کہا گیا کہ میں بندگی نہیں کروں گا، یا میں بندگی نہیں کرتا ہوں، اور ایک جگہ فعل کے معنوں، یعنی ماضی کے حوالے سے بھی استعمال کیا گیا ہے، یعنی تم نے بندگی کی۔

میں نے یہ دو باتیں اس لیے عرض کی ہیں تاکہ ان آیات میں، جو ترجمے کے اندر فرق ہے اسے بہ آسانی سمجھا جاسکے۔ اس لیے کہ جو آدمی عربی نہ جانتا ہو اور وہ کسی تفسیر کا مطالعہ کرے، تو اسے ان آیات کے مطلب کے سمجھنے میں خاصی دقت پیش آسکتی ہے۔

ان چار آیات میں سے پہلی دو آیات میں بعض لوگوں کے نزدیک حال کا ذکر ہے، جو تمھارے معبود ہیں، میں ان کی بندگی نہیں کرتا اور جو میرا معبود ہے تم اس کی بندگی نہیں کرتے۔ دوسرے حصے میں مستقبل کا ذکر ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جس کی بندگی میں کرتا ہوں اس کی بندگی تم نہیں کروگے اور جن کی بندگی تم کرتے ہو ان کی بندگی میں ہرگز نہیں کروں گا۔ بعض لوگوں نے اس ترتیب سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک پہلے حصے میں مستقبل کا ذکر ہے اور اس میں یہ کہا گیا ہے کہ میں نہیں کروں گا ان کی بندگی جن کی بندگی تم کرتے ہو، اور جس کی بندگی میں کرتا ہوں، تم اس کی بندگی نہیں کروگے، اور دوسرے حصے میں حال کا ذکر کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں فعل کے استعمال کے حوالے سے ان دونوں کی گنجائش بھی موجود ہے۔ بعض کے نزدیک دوسری

آیات کا ماضی سے تعلق ہے اور ان میں ماضی کا صیغہ بھی آیا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ میں عبادت کرنے والا نہ تھا، نہ ہوں اور نہ ہوں گا۔ یہاں یہ تینوں معنی ہی مراد ہیں۔

دراصل ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ معبود جو مشرکین و کفار کے معبود تھے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ماضی، حال اور مستقبل میں، یعنی تینوں زمانوں کے حوالے سے ایک قطعی اعلانِ برائت ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو اللہ کو معبود بنائے گا اس نے کفار کے معبودوں کو نہ معبود بنایا ہے، نہ بنا رہا ہے اور نہ بنائے گا۔ اسی طرح جو اللہ کے علاوہ کسی اور کو معبود بنائیں گے، ان کی بندگی کریں گے پھر وہ اللہ کی بندگی نہیں کریں گے، نہ انھوں نے ایسا کیا ہے، نہ وہ ایسا کر رہے ہیں، اور نہ وہ ایسا کریں گے، خواہ وہ اللہ کو ماننے کا کتنا ہی دعویٰ کریں۔ مختلف تفاسیر میں انھی پہلوؤں کو ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے لیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہاں زمانے کی قید سے بالاتر ہو کر ہر زمانے کے بارے میں یہ قطعی اعلان ہے کہ اللہ اور دوسرے معبودوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ یہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔

دوسری اہم بات سمجھنے کی یہ ہے کہ دنیا میں ایک معبودِ اعلیٰ کا انکار شاذ و نادر ہی کیا گیا ہے۔ سب مذاہب کے لوگ خدا کو مانتے ہیں۔ عیسائیوں کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ وہ ایک خدا کو مانتے ہیں۔ اگر انھیں کہا جائے کہ تم شرک کرتے ہو تو وہ بہت خفا اور ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم موحد ہیں، ہم تو ایک خدا کو مانتے ہیں۔ ان کے بقول دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں اسی ایک خدا کی صفات، رحمت اور سلامتی کا ظہور ہوا ہے۔ وہ کوئی الگ سے خدا نہیں ہیں۔ یہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہی یہ ہے کہ وہ ایک خدا کے پیروکار ہیں۔ ہندو بھی ایک ایشور کا تصور رکھتے ہیں کہ ان سب خداؤں کے اوپر ایک خدا ہے اور وہ سب سے بالاتر اور اعلیٰ ہے۔

نبی کریمؐ کے سب مخاطبین اللہ کو خدا مانتے تھے اور ان سب کا یہ دعویٰ تھا کہ زمین و آسمان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس حوالے سے ان کے درمیان سوال و جواب نقل کیا گیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے تو یہ کہیں گے کہ اللہ نے۔ رزق کون دیتا ہے؟ تو یہ کہیں گے کہ اللہ دیتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ زندگی اور موت کون دیتا ہے تو کہیں گے اللہ تعالیٰ مارتا اور جلاتا ہے۔ ان کو ان باتوں میں سے کسی کا بھی انکار نہیں تھا بلکہ وہ اللہ کو مانتے تھے۔ ان آیات میں بندگی کے حوالے سے ایک تکرار اس لیے بھی پائی جاتی ہے کہ

اہلِ مکہ پر یہ بات زور دے کر واضح کی گئی ہے اور حضوؐر نے فرمایا ہے کہ تم جن بہت سے خداؤں میں سے اسے اعلیٰ خدا مانتے ہو اور اس کی بندگی کرتے ہو، یہ وہ بندگی نہیں ہے، جس ایک خدا کی بندگی میں کرتا ہوں، اور یہ وہ رب نہیں ہے جس کی بندگی کی میں تمھیں دعوت دے رہا ہوں، اور نہ یہ اس کی بندگی کا صحیح طریقہ ہے جو تم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

تیسری بات جو بہت اچھی طرح سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے معبود کے لیے ''الٰہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے ہاں اردو ترجمہ کرنے والوں نے الٰہ کے معنی حاکم، یعنی حکم دینے والا اور معبود کے کیے ہیں اور کہیں صرف الٰہ کے ہی کیے ہیں۔ قرآن مجید کی اس تعریف کی روشنی میں یہ لازم نہیں ہے کہ الٰہ سے مراد صرف پتھر کے بت ہی ہیں بلکہ جس کے ساتھ دو چیزیں وابستہ ہو جائیں وہ معبود بن جاتا ہے۔ کوئی بھی اختیار جو اللہ سے علاوہ حاصل ہو، یا اللہ سے بالاتر حاصل ہو تو وہ معبود بن جاتا ہے۔ اگر یہ اختیار کسی فرد یا پارلیمنٹ کو حاصل ہو تو وہ معبود بن جاتا ہے۔ جس سے محبت، وفاداری اور وابستگی اللہ کے برابر اِس سے اعلیٰ درجے کی ہو جائے تو وہ بھی معبود ہوتا ہے۔ لٰہذا اللہ کو ماننا یا نہ ماننا مسئلہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک خدا کو ماننا اصل بات ہے۔

مغرب جسے شیطانی یا دہریہ تہذیب کہا جاتا ہے، وہاں بھی صرف امریکہ میں ۹۴ فیصد لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی طرح یورپ اور ہندستان میں ۷۰ فیصد سے زائد لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہیں۔ اہلِ عرب بھی یہی کہتے تھے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ خدا کے وجود سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ لٰہذا یہ بات واضح کرنا بہت ضروری تھی کہ جس طرح کا معبود تمھارا ہے وہ میرا معبود نہیں ہے اور جس طرح تم اس کی بندگی کرتے ہو اس طرح میں اس کی بندگی نہیں کرتا۔

اس کے بعد اگلی بات، جو بہت اہم ہے اور جسے سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جدید دور میں اور اس سے پہلے بھی، جو نئے نئے خدا پیدا ہوئے ہیں وہ مجسم خدا نہیں ہیں، جس طرح مٹی اور پتھر کے بت تھے، یا گائے کی پرستش کی جاتی تھی، یا لوگ سورج، چاند اور آسمان اور زمین کی پوجا کرتے تھے، یا فصلوں کی لوگ پرستش کرتے تھے۔ یہ اس طرح کے خدا نہیں ہیں۔ خود قرآن مجید نے کہا ہے کہ آدمی کی خواہشِ نفس بھی معبود یا خدا بن سکتی ہے:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ (الفرقان: ۴۳)

''کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے، جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنالیا ہو۔''

خواہشِ نفس کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس کی کوئی پرستش نہیں کرتا اور نہ کوئی اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا اور اس کی نماز پڑھتا ہے۔ چوں کہ آدمی اس خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے، اس کے ساتھ آدمی کی وابستگی ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے معبود شمار کیا ہے۔ اسی طرح اگر آدمی سائنس اور ٹیکنالوجی کے متعلق یہ سمجھے کہ یہ وہ کام کر سکتے ہیں جو اللہ سے ماورا ہو سکتا ہے تو یہ بھی وہی معبود ہے۔ اگر آدمی اپنی قوم اور ملک سے ایسی وفا اور وابستگی رکھے جو خدا کی وفاداری اور وابستگی سے اوپر ہو تو وہ بھی معبود ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا کا انکار آج بھی شاذ و نادر ہے اور پہلے بھی شاذ و نادر ہی تھا لیکن خدا کا اختیار، اس کی محبت اور وفاداری اور اس کے ساتھ وابستگی میں دوسروں کو اس کی صفات میں شریک کیا جاتا ہے اور اس کی بندگی میں دوسروں کو شریک ٹھیرایا جاتا ہے۔

اگر ہم موجودہ دور کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت کا شرک تو چلتا ہی رہا لیکن جس شرک کا آغاز یورپ میں ہوا وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ ۱۶ ویں صدی میں نیوٹن نامی ایک سائنس داں تھا۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سورج، چاند، ستارے یہ سب ایک دوسرے کے درمیان باہمی کشش پر قائم ہیں۔ یہ بہت مشہور نظریہ ہے اور نیوٹن کو جدید سائنس کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ وہ پکا عیسائی تھا، خدا پرست تھا اور موحد تھا، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بھی نہیں مانتا تھا اور صرف ایک خدا کا قائل تھا۔ اس نے جب اپنی کتاب لکھی تو اس میں یہ لکھا تھا کہ میں نے یہ کتاب اس لیے لکھی ہے کہ اس سے خدا کی وحدانیت ثابت ہو اور خدا کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔

خدا کا انکار تو نہیں ہوا لیکن یہ نظریہ فروغ پا گیا کہ چوں کہ کائنات تو کششِ ثقل کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس لیے اس دنیا کو چلانے کے لیے اب خدا کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کا نظام، سورج، چاند، ستارے، سب قوانینِ فطرت کے پابند ہیں۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ خدا موجود ہے، قوانینِ فطرت بھی اسی کے ہیں، زمین اور آسمان کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے، اسی کے نظام کے تحت یہ کائنات چل رہی ہے، لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ مغرب کے افکار میں اس تصور کو گھڑی ساز خدا کہا جاتا ہے، یعنی وہ خدا جس نے گھڑی بنائی، اس میں چابی بھر دی اور وہ چل پڑی اور اب وہ چابی بھر کر کسی گوشے میں بیٹھ گیا ہے۔ اب اسی چابی کے بل پر یہ گھڑی برابر چل رہی ہے۔ اس لیے اب کسی خدا کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن مجید نے جہاں بھی یہ بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے وہاں یہ بات ضرور

کہی کہ وہ عرش کے اوپر قائم ہوگیا۔ عرش اسے کہتے ہیں کہ جو تخت سلطنت ہو اور جہاں سے احکاماتِ حکومت جاری کیے جاتے ہیں۔ گویا حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (الفرقان:۵۹)

"وہ جس نے چھے دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا، جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں، پھر آپ ہی "عرش" پر جلوہ فرما ہوا۔"

گویا وہ ایسا خدا نہیں ہے، جو کائنات کو بنا کر اور اس کے نظام کو چلا کر فارغ ہو گیا ہے بلکہ آسمان سے زمین تک اس کا حکم چلتا ہے:

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (السجدۃ:۵)

"وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔"

وہی تدبیر کر رہا ہے۔ پانی وہ برساتا ہے، کھیتی وہ اگاتا ہے، انسان وہ پیدا کرتا ہے، قوموں کی الٹ پلٹ وہ کرتا ہے، اگر کسی کو حکومت دیتا ہے تو وہ دیتا ہے، اگر حکومت چھینتا ہے تو وہ چھینتا ہے، ذلیل کرتا ہے تو وہ کرتا ہے اور عزت دیتا ہے تو وہ دیتا ہے۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (آل عمران:۲۶)

"کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (الاعراف:۵۴)

"اسی کی خلق اور اسی کا امر ہے۔"

تخلیق بھی اس کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔ مگر جدید نظریات کے تحت اللہ تعالیٰ کو کائنات کے نظام سے بے دخل کرنا یہ دراصل ماننے کے باوجود نہ ماننے کے برابر ہے۔ یہ جدید دور کا شرک ہے۔

یہ تصوّر کہ جب کائنات کو چلانے میں خدا کی ضرورت نہیں ہے تو پھر انسانی معاملات کو چلانے میں بھی اس کی کیا ضرورت ہے۔ انسان خود اپنے معاملاتِ زندگی چلا سکتا ہے۔ اس کے

نتیجے میں یہ نظریہ وجود میں آیا کہ انسان اب بالغ ہوگیا ہے۔ پہلے وہ بچہ تھا۔ بجلی کڑکی تو وہ ڈر گیا اور اس نے اسے سجدہ کرلیا۔ گائے نے دودھ دیا، اس کا فائدہ ہوا تو اسے سجدہ کرلیا۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹا، نقصان پہنچا تو اسے سجدہ کرلیا۔ اسے جس جس چیز سے نفع یا نقصان پہنچتا گیا وہ اس کی پرستش کرنے لگا۔ چوں کہ وہ بچہ تھا، اسے اتنی عقل سمجھ نہیں تھی، اسی لیے وہ بہت سے معبود بناتا گیا۔ پھر جب عقل بڑھی، شعور پیدا ہوا تو اس نے سوچا کہ اتنے معبود تو ٹھیک نہیں، اس لیے صرف ایک معبود ہی ہونا چاہیے۔ اب چوں کہ وہ بہت بالغ ہوگیا اور شعور پختہ ہوچکا ہے، اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ زندگی کو چلانے کے لیے ایک خدا کی بھی اب کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔ سیاست، معیشت، تجارت، حکومت، معاملات، یہ سب کچھ ہم اس کے بغیر بھی چلا سکتے ہیں۔ انسان اب بالغ ہوگیا ہے اور بالغ ہونے کے بعد وہ اپنے معاملات خود چلا سکتا ہے۔ چناں چہ جدید شرک یہ ہے کہ ہم اس بات کا انکار تو نہیں کرتے کہ خدا نہیں ہے بلکہ تصور یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہے لیکن اب اس کی ہماری زندگی میں کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اس کو زندگی سے بے دخل کردیا گیا ہے اور غیر ضروری بنا دیا گیا ہے۔ وہ دہریے تو نہیں ہیں کہ خدا کی ذات سے انکار کریں بلکہ انھوں نے اس مسئلے کو ہی ختم کردیا ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ ان کے نزدیک اب انسان کو خدا کی ضرورت نہیں رہی۔

اصل مسئلہ اب یہ نہیں ہے کہ خدا کو مانا جاتا ہے یا نہیں، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جس بندگی کی دعوت حضورؐ دے رہے تھے اور جس معبود کی حضورؐ پیروی کر رہے تھے، جس طرح سے آپؐ اپنی زندگی کو اس کے لیے خالص کر کے بندگی کر رہے تھے، اس کی صفات، مقام اور اختیارات میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے، وہ بندگی نہیں کی جارہی۔ حضورؐ کا راستا الگ ہے اور اس سے ہٹ کر راستا الگ ہے۔ جو اس طرح بندگی کرے کہ اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے اور حاکم بھی اور تدبیر بھی کر رہا ہے، اور اسی کا حکم چل رہا ہے اور آدمی کا تعلق اس کے ساتھ محض ایسا نہیں ہے کہ اس نے پیدا کردیا اور پھر لاتعلق ہوگیا بلکہ اس کے ساتھ اس کی گہری جذباتی وابستگی بھی ہے۔ وہ اس سے ڈرتا بھی ہے، اس پر بھروسا بھی کرتا ہے، اگر کسی خطرے کا اندیشہ ہو تو مدد کے لیے اس کی طرف لپکتا ہے، اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، اس سے مانگتا ہے، اس کے آگے اپنی پیشانی ٹیکتا ہے اور پرستش کے تمام مراسم صرف اسی کے لیے بجالاتا ہے، اور بندگی اور اطاعت بھی صرف اسی کی کرتا ہے ــــ درحقیقت یہی اصل بندگی ہے جو خدا کو مطلوب ہے اور جس کی طرف نبیؐ کی دعوت تھی۔

حضورؐ اللہ کی طرف جس بندگی کی دعوت دے رہے تھے وہ یہی تھی۔ یہی وہ مفہوم ہے، جو ان آیات کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کی مکمل بندگی کی دعوت اس کے اندر آ جاتی ہے۔ اور وہ دعوت یہ ہے:

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط (الاعراف:۵۹)

''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔''

اس لیے سورۂ کافرون کا ایک نام ''الاخلاص'' بھی ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کا نام بھی ''الاخلاص'' ہے۔ احادیث میں اس سورۃ کا نام بھی یہی بیان کیا گیا ہے، یعنی اپنی پوری زندگی اور بندگی اللہ کے لیے خالص کر دی جائے۔

اس سورۃ کا ایک اور نام ''منابزہ'' ہے، جس کے معنی اٹھا کر پھینک دینا ہے۔ اس لیے کہ تمام جھوٹے معبودوں کو جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں، ان سب کو یہ سورۃ اٹھا کر پھینک دیتی ہے اور ان سے اعلان برأت کرتی ہے۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ (الکافرون:۲)

''میں ان کی عبادت نہیں کرتا، جن کی عبادت تم کرتے ہو۔''

اس آیت کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں، لیکن میرے خیال میں اس کا سب سے بہتر ترجمہ یہ ہے: ''میں بندگی نہیں کروں گا، جس کی تم بندگی کرتے ہو۔'' اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ کفارِ قریش آخر میں جب اس بات سے مایوس ہوتے جا رہے تھے کہ حضورؐ کسی طرح ان کی بات نہیں مانیں گے، یا اپنی دعوت نہیں چھوڑیں گے، یا اللہ کی بندگی کی طرف لوگوں کو بلانا نہیں ترک کریں گے تو وہ یہ تجاویز لے کر آئے تھے کہ آپؐ کچھ لین دین کر لیں۔ کچھ آپ ﷺ ترمیم کر لیں اور کچھ ہم ترمیم کر لیتے ہیں۔ کچھ آپ ﷺ ہماری بات مان لیں اور کچھ ہم آپؐ کی بات مان لیتے ہیں۔ آپ ﷺ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں ہم آپؐ کے معبود کو برا نہیں کہیں گے۔ سیرت میں یہ تمام واقعات نقل ہوئے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ کوئی دوسرا قرآن لے آئیں یا اسے کچھ بدل دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کا کوئی اختیار حاصل نہیں کہ میں اپنی طرف سے قرآن مجید کو بدل دوں۔ کفار کے اس مطالبے کا مستقبل کے حوالے سے جواب بھی اس کے اندر موجود ہے۔ حال کا ذکر تو اس کے اندر ہے ہی کہ نہ میں ان کی بندگی کرتا ہوں اور نہ کروں گا، جن

کی بندگی تم کرتے ہو اور جس طرح تم کرتے ہو۔ اسی طرح یہ بات کہ جس طرح تم اللہ کی بندگی کرتے ہو کہ اس کے ساتھ تم نے بہت سے بتوں کو آبا و اجداد کو اور جنوں اور بہت سی چیزوں کو شریک کر رکھا ہے، میں ان کی بندگی نہیں کرتا۔ گویا یہ فرما دیا گیا کہ نہ میں نے ان کی بندگی کی ہے، نہ کرتا ہوں اور نہ کروں گا۔

وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ ۝ (الکٰفرون:۳)

''اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔''

یہاں مستقبل کا صیغہ بھی ہے اور حال کا بھی۔ اس لیے کہ تمھارے سامنے یہ پوری دعوت پیش کی جا چکی ہے۔ قرآن مجید نے بھرپور دلائل دیے ہیں، آفاق و انفس اور زمین و آسمان کی بے شمار نشانیاں تمھارے سامنے پیش کی جا چکی ہیں لیکن تم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اس لیے اب نہ تم کو مجھ سے کوئی امید رکھنا چاہیے کہ میں اپنا راستا چھوڑ کر تمھارے راستے پر آؤں گا اور نہ تم سے مجھے کوئی امید ہے کہ تم اپنے راستے کو چھوڑ کر اس راستے پر آؤ گے، جس کی میں دعوت دے رہا ہوں۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۝ (الکافرون:۴)

''اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔''

یہاں ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اسے بعض لوگوں نے مستقبل کے معنوں میں لیا ہے اور بعض نے حال کے معنوں میں۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات ماضی کے معنوں میں کہی گئی ہے کہ جن معبودوں کی تم اب تک بندگی کرتے رہے ہو، ان کی بندگی میں کبھی کرنے والا نہیں تھا۔ حضورؐ کی نبوت سے قبل کی زندگی اور نبوت کے بعد کی زندگی اس پر ثابت ہے کہ آپؐ نے کبھی بھی جھوٹے بتوں کو نہیں مانا اور کبھی بھی ان کی پرستش نہیں کی۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ قبل از نبوت آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کو اس طرح سے نہیں مانتے تھے، جس طرح سے قرآن مجید میں اس کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن آپ ﷺ اپنی فطرتِ سلیم سے اور دین حنیفی کی بنا پر، جس کو ماننے والے اس وقت بھی عرب میں بہت سے لوگ موجود تھے، خدا کو ایک مانتے تھے۔ آپ ﷺ غارِ حرا میں جا کر عبادت کرتے تھے، اسی کے لیے آپ ﷺ بھوکے پیاسے رہتے تھے، اسی کے آگے آپ ﷺ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اور اس سے التجا کرتے تھے کہ مجھے روشنی اور ہدایت دے اور میری رہنمائی فرما کہ میں تیری بندگی کیسے کروں۔ یہاں ماضی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نہ میں نے پہلے کبھی بتوں کی پوجا کی ہے اور نہ میں آئندہ کروں گا۔

وَ لَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُo (الکفرون:۵)

''اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔''

اس آیت اور تیسری آیت دونوں کے الفاظ بالکل ایک سے ہیں، البتہ مفسرین نے دونوں کے مطلب میں فرق کیا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ پہلی آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ میں بھی تمھارے معبودوں کی بندگی نہیں کر رہا ہوں اور دوسری جگہ اس کا مطلب اس طرح ہے، جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ میں آج جانے والا ہوں یا اگلے سال جانے والا ہوں، یا میں کبھی جانے والا ہی نہ تھا۔ ان میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا ذکر آ جاتا ہے۔ یہاں بندگی کو بھی انھی معنوں میں لیا گیا ہے کہ میں تمھارے معبودوں کی کبھی بندگی کرنے والا نہیں، نہ اب کرنے والا ہوں اور نہ آیندہ کبھی کروں گا۔ گویا یہاں تینوں زمانوں کے حوالے سے نفی آ گئی، یعنی میں ان معبودوں کی بندگی بھی نہ کروں گا، جو اللہ کے علاوہ آپ ﷺ کے مخالفین نے بندگی میں شریک کر رکھے تھے، یا آپ ﷺ سے پہلے شریک رہے ہیں، یا آپ ﷺ کے بعد کبھی شریک ہوں گے، یا اللہ کی صفات میں، جس سے اس کی کسی صفت میں کمی بیشی یا خرابی پیدا ہو اس میں شریک ہوں گا، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھے دن میں زمین و آسمان پیدا کیے اور ساتویں دن آرام کیا۔ بائبل کا یہی بیان ہے لیکن قرآن نے اس کی تردید کی ہے۔

قرآن مجید نے اللہ کے بیٹے، بیٹیاں، فرشتے اور شفاعت کا تصور وغیرہ اس قسم کے غلط تصورات کے حوالے سے بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حلال و حرام کا اختیار ہے کہ اگر اللہ کے علاوہ کسی کو یہ اختیار دیا جائے گا تو یہ بھی شرک ہے۔ قانون بنانے کا اختیار بھی صرف اللہ کا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کی جائے گی تو وہ بھی معبود کے زمرے میں آتا ہے۔ اس طرح ان چار آیات کے اندر ہر قسم کے شرک کی، ہر قسم کے معبود کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفی ہوگئی اور اس وقت، جب کہ مکہ میں نبی کریمؐ کو معرکہ پیش تھا اس سے اعلانِ برأت بھی کر دیا تھا۔ یہ اس بات کا اعلان بھی تھا کہ اب تم اس مقام پر پہنچ چکے ہو کہ جہاں تم پر کافر ہونے کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔

ایک اور بات بھی بہت اہم ہے، جسے ہمیں اپنے مسائل کے حوالے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ احادیث میں اس بات کو سخت ناپسند کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی تکفیر کرے، اس پر کفر کا فتویٰ دے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام کافرانہ ہے، یہ

عقیدہ کافرانہ ہے اور یہ بات جو کہی گئی ہے یہ کفر پر مبنی ہے، لیکن کافر نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ کافر کہنے کے معنی ہیں کہ وہ امتِ مسلمہ سے خارج ہوگیا ہے۔ مسلمان تو مسلمان، کفارِ قریش کے بارے میں بھی سوائے اس ایک مقام کے کہیں بھی انھیں کافر کہہ کر نہیں پکارا گیا۔ یہ بھی اس وقت کہا گیا جب حضورؐ گزشتہ ۱۳ سالوں میں اپنی تمام تر جدوجہد کے نتیجے میں ان تک اسلام کا پیغام عملاً پہنچا چکے تھے اور یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ اب اپنا کفر چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں اور یہودیوں کے بارے میں بار بار ذکر کیا ہے کہ یہ شرک کرتے ہیں، یہ کفر کرتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ کہ تین خدا ہیں، یہ شرک ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں، یہ شرک ہے۔ لیکن کہیں اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ مشرک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مشرک کا لیبل ان پر کہیں نہیں لگایا۔ ان پر کفر کا فتویٰ جاری نہیں کیا بلکہ برابر انھیں اہلِ کتاب کہہ کر ہی مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ فرق روا رکھا گیا ہے کہ یہ مشرکین مکہ ہیں اور یہ اہلِ کتاب ہیں۔ حالاں کہ اہل کتاب بھی شرک کرنے والے اور کفر کرنے والے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں بھی ہمیشہ جید علما نے بھی یہی ہدایت کی کہ ایک دوسرے کو کافر قرار نہ دیا جائے۔ لیکن اب یہ بات بہت عام ہے۔

کسی بھی دارالافتا میں چلے جایئے، کسی کے بھی حوالے سے فوراً کفر کا فتویٰ مل جائے گا۔ دیوبندیوں کا بریلویوں کے بارے میں، بریلویوں کا دیوبندیوں کے بارے میں۔ بڑی بڑی شخصیات کے بارے میں، جیسے مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کے بارے میں کفر کے فتوے جاری ہوتے رہے ہیں۔

ایک حدیث، جسے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے اپنے مکتوبات میں روایت کیا ہے کہ اگر ایک آدمی میں کفر کے حوالے سے ۹۹ وجوہ پائی جاتی ہیں اور اس میں صرف ایک وجہ ایسی ہو، جس کی وجہ سے وہ مسلمان شمار کیا جاسکتا ہو تو اسے مسلمان ہی شمار کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل قبلہ کی تکفیر مت کرو۔ یہ بات انھوں نے شیعوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہی ہے اور ان تمام وجوہ کو گنوایا ہے، جن کی وجہ سے یہ اہلِ بدعت، اہلِ ضلالت اور گمراہ ہیں۔ اس سب کے باوجود انھوں نے کہا کہ ان کی تکفیر نہ کی جائے۔ یہ اہل قبلہ ہیں۔ حدیث ہے کہ جو ہمارے قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں وہ مسلمان ہیں۔ وہ امت مسلمہ

میں سے خارج نہیں ہیں۔ قرآن مجید نے اس حوالے سے جس احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس سورۃ سے ظاہر ہے۔ جب کہ حضورؐ خود موجود تھے اور کفار کو ۱۳ برس تک دعوت دی گئی مگر انھیں سوائے اس ایک مقام کے کبھی بھی اے کافرو! کہہ کر نہیں پکارا گیا۔ جب ہجرت کا وقت آ گیا، اتمامِ حجت ہو گیا، جہاد کی نوبت آ گئی، اس وقت اللہ تعالیٰ نے کفار کو اے کافرو کہہ کر پکارا۔

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝ (الکفرون:۶)

''تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

دین کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی زندگی بسر کرنے کے طریقے کے ہیں اور دوسرے روزِ جزا کے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کے معنی بدلے کے دن کے کیے ہیں اور آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ تمھارے اعمال کا بدلہ تمھارے لیے ہے اور میرے اعمال کا بدلہ میرے لیے۔ تقریباً تمام ترجمہ کرنے والوں اور مفسرین نے اس آیت کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ گویا میری زندگی بسر کرنے کا طریقہ میرا ہے اور تمھاری زندگی بسر کرنے کا طریقہ تمھارا ہے۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ اس میں تو رواداری کی تعلیم ہے کہ تم اپنے راستے پر چلتے رہو اور میں اپنا راستا چلتا رہوں، نہ میں تمھیں چھیڑوں گا اور نہ تم مجھے چھیڑو۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہیں ہم سے کیا غرض ہے۔ تم اپنے راستے پر چلو اور ہم اپنے راستے پر چلیں گے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ رواداری کی تعلیم نہیں ہے بلکہ یہ تو اعلانِ جنگ ہے کہ اب ہمارے اور تمھارے راستے بالکل الگ ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک دوسرے کی مخالفت ایک دوسرے سے برأت اور ایک دوسرے کے خلاف جہاد ہے۔ اس لیے مدینہ ہجرت کرنے سے جہاد شروع ہو گیا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے مکے والوں کو چھوڑ نہیں دیا تھا اور نہ مکہ والوں نے آپ ﷺ کو چھوڑ دیا تھا بلکہ آپ ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی۔

آپ ﷺ نے جنگ میں مدد حاصل کرنے کے لیے اپنے حلیف تلاش کرنا شروع کر دیے۔ یہودی مدینہ میں رہتے تھے، آپ ﷺ نے ان سے معاہدہ کیا، انھیں اپنی ریاست میں شامل کیا اور شہریت کے تمام حقوق دیے اور یہ کہا کہ ہم سب ایک ملت واحدہ ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے مدینہ سے باہر نکل کر اہل مکہ کا تجارتی راستہ، جو ان کی معاشی شاہ رگ تھی، اس کی نگرانی کا اہتمام کیا۔ اس غرض کے لیے اردگرد کے تمام کفار قبائل سے معاہدے کیے کہ نہ ہم

تمھارے خلاف جنگ کریں گے اور نہ تم ہمارے خلاف لڑو گے۔ آپ ﷺ کو پہلے دن ہی سے یہ اندازہ تھا کہ ان کا قریش، جیسے دشمن سے مقابلہ ہے، جو حملہ بھی کرے گا اور صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش بھی کرے گا۔ آپ ﷺ کو ان تمام خطرات کا بھی اندازہ تھا کہ اب جب کہ ہجرت ہو چکی ہے، لڑائی بھی ہوگی، جہاد بھی ہوگا اور قتال بھی ہوگا۔ مکہ میں حکم تھا کہ کفار کے خلاف ہاتھ روکے رکھو، وہ حکم اب واپس لے لیا گیا اور واضح طور پر حکم دیا گیا کہ تلوار ہاتھ میں لے لو اور دشمنانِ اسلام سے لڑو۔ بیشتر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ یہ آیت رواداری نہیں بلکہ جنگ کا اعلان ہے۔ یہ امن اور چین کا اعلان نہیں ہے کہ تم اپنا راستا چلو اور میں اپنا راستا چلوں گا۔ میں اپنے معبود کو مسجد میں جا کر پوجتا رہوں گا اور تم مندر اور گرجے میں جا کر اپنے معبودوں کو پوجتے رہو۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ لوگوں کو زبردستی ان معبودوں کی بندگی سے ہٹایا جائے، جو غلط معبود ہیں۔ یہ بھی قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے کہ جو اپنی آزاد مرضی سے، جس کی بندگی کرنا چاہیے، بندگی کر سکتا ہے۔ چناں چہ جزیہ کی ادائی کے بعد اسلام میں ہمیشہ عیسائیوں اور یہودیوں کو عبادت کی آزادی ملی۔

ہمارے ہاں تصویر تو یہ بنتی ہے کہ گویا یہودیوں اور عیسائیوں کی مسلمانوں سے مسلسل چودہ سو سال سے دشمنی چلی آ رہی ہے مگر یہ جھوٹی تصویر ہے۔ مدینہ میں مسلمانوں کی یہودیوں سے لڑائی ضرور ہوئی لیکن اس کے بعد یہودی مسلمانوں کے ساتھ جہاں بھی رہے بڑے امن، چین، سکون اور عزت کے ساتھ رہے۔ یورپ، جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے مقابلے میں جب یہودی اپنا موازنہ اسپین سے کرتے تھے تو اس دور کو، جو انھوں نے مسلمانوں کے تحت گزارا، اپنا سنہری زمانہ کہتے تھے۔ انھیں عبادت کی آزادی تھی، ان کے بڑے بڑے فلسفی، سائنس داں بڑی آزادی کے ساتھ اور احترام کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ معاملات طے کرنے کے لیے عیسائی، یہودی سب کی اپنی اپنی عدالتیں تھیں۔ آج کل اگر کوئی شخص برطانیہ میں یہ کہے کہ میں اپنے شادی بیاہ کے معاملات اپنے قوانین کے تحت کرنا چاہتا ہوں تو اسے غدار کہا جائے گا، جب کہ مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کو ہمیشہ اس کی آزادی دی کہ وہ جس طرح چاہیں، اپنے معاملات طے کر سکتے ہیں۔

جب مسلمان ہندستان آئے تو علما کے ایک گروہ نے کہا کہ ہندی بھی اہل کتاب میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس بھی چار کتابیں، چار وید ہیں۔ گویا مسلمانوں نے بندگی

کی تو پوری اجازت دی لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اطاعت اور قانون کا نظام اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں پر قائم ہوسکتا ہے۔ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ میں دراصل اسی بات کا اعلان تھا۔

یہ مختصر سی سورۃ ہے، جس کی حضورؐ نے پڑھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ اکثر آپ ﷺ مغرب کی دوسنتوں اور فجر سے پہلے کی دوسنتوں میں پڑھا کرتے تھے، یعنی سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص۔ فجر کے فرضوں میں بھی ان دوسورتوں کے پڑھنے کی روایت ملتی ہے۔ آپ ﷺ ہمیشہ لمبی قرأت نہیں کرتے تھے کہ لازماً طویل سورتیں پڑھتے تھے۔ فجر کی نماز میں فرضوں میں یہ دوسورتیں پڑھنا بھی آپ ﷺ سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے رات کو سوتے ہوئے اسے پڑھنے کی بہت تاکید کی ہے۔ کئی صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ رات کو کیا پڑھیں تو آپ ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورۃ شرک سے پاک صاف کرتی ہے۔ آپ ﷺ کا یہ بھی عمل تھا کہ آپ ﷺ اس سورۃ کو اور دیگر سورتیں پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک کر اپنے اوپر دم کر کے سویا کرتے تھے۔ اس حوالے سے چار سورتیں مشہور ہیں۔ ان میں سورۂ کافرون کی بھی آپ ﷺ نے کثرت سے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ ﷺ خود بھی کثرت کے ساتھ اسے پڑھا کرتے تھے۔

اس میں شرک اور جھوٹے معبودوں سے برأت کا اعلان ہے اور خدائے واحد کی بندگی کا اعلان ہے، جس کی دعوت قرآن مجید نے جگہ جگہ کھول کر دی ہے، جو پیدا کرنے والا ہے، بااختیار ہے اور حکمراں بھی ہے، جس سے آدمی کو سب سے بڑھ کر محبت بھی کرنی چاہیے اور ڈرنا بھی چاہیے۔ ہر چیز اس سے مانگنی چاہیے، سارے اختیارات کا مالک وہ ہے۔ بھروسا بھی اسی پر کرنا چاہیے اور حکم بھی اس کا چلنا چاہیے۔ یہ تمام پہلو قرآن مجید نے بیان کیے ہیں۔ ان تمام صفات کا حامل معبود وہ معبود ہے، جس کی ہم بندگی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی طریقے سے ہم کسی کی بندگی نہیں کرتے۔ ہم خدا کی بندگی اس طرح نہیں کرتے کہ کسی دوسرے کو اس کے ساتھ شریک کرلیں۔ اس لحاظ سے یہ سورۃ ہجرت کی سورۃ بھی ہے۔ برأت کی سورۃ بھی ہے، شرک سے پاکیزگی کی سورۃ بھی ہے اور توحید کا اعلان بھی ہے۔ جب مسلمان شرک سے پاک ہوجائے اور توحید کے اس مقام پر پہنچ جائے تو پھر اللہ نے اس کے لیے فتح و نصرت مقدر کی ہے۔ اس کا ذکر آگے آنے والی سورۃ، سورۂ نصر میں موجود ہے۔

سورۃ النصر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۙ‏ ﴿۱﴾ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ‏ ﴿۲﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳ ع ۱۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔

جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

تشریح: یہ چھوٹی سی سورۃ بھی دراصل اس سلسلے کی سورتوں کی ایک کڑی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بالخصوص اور آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنے والے گروہ کو بالعموم خوش خبری اور بشارت دی ہے۔ ان سورتوں میں اس مشن، دعوت اور رسالت کی ذمے داری کے تکمیلی مراحل کا ذکر ہے، جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سپرد کی تھی۔ پھر ان سورتوں میں توحید و شرک کا بیان بھی ہے اور جھوٹے معبودوں سے اعلان برأت بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اہل مکہ کو ایک اللہ کی بندگی کی دعوت کے موضوعات بھی ان میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان سورتوں میں ان احسانات کا ذکر بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر اور بالخصوص قریش پر کیے، مثلاً اصحابِ فیل کو شکست دی، دنیا بھر سے ان کو رزق بہم پہنچایا اور خوف سے امن دیا۔

اس سورۃ کے بغور مطالعے سے جو بات قاری کے ذہن میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ دعوت کا کام، بندگانِ خدا کو دین کی طرف بلانے کا مشن اور دین کو قائم کرنے کی، جو ذمے داری اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کے سپرد کی تھی وہ بارگاہِ رب العالمین میں قبول ہوگئی ہے۔ چناں چہ اللہ کی مدد سے آپ ﷺ کو فتح نصیب ہوگی اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ اہل عرب اور دیگر اقوامِ عالم گروہ در گروہ، فوج درفوج، جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس میں جہاں فتح ونصرت اور دین کے پھیلنے کی بشارت ہے وہاں اس کامیابی کو برقرار رکھنے کا نسخہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کثرت سے اللہ کی حمد، اس کی تسبیح اور استغفار کریں۔

اس سورۃ مبارکہ سے پہلی سورۃ، سورۂ کافرون میں حق تعالیٰ نے کافروں کو ''اے کافرو!'' کہہ کر خطاب فرمایا ہے۔ یاد رہے کہ قرآن پاک میں یہ واحد مقام ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے مخاطبین کو یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس خطاب سے اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ مکہ کی زندگی میں دعوت الی اللہ کا، جو کام آپؐ سرانجام دے رہے تھے وہ اس مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں کہا جاسکتا ہے کہ دعوت کا حق ادا ہوگیا۔ یہاں یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ مقام کہ دعوت کا حق ادا ہوگیا صرف اور صرف اللہ کے رسول ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ میرے اور آپ جیسے انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتا پھرے کہ میں نے بہت کام کرلیا، بڑی محنت کی ہے، یہ جاہل قوم تو مانتی ہی نہیں، لہٰذا میں نے حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ کے رسولؐ کو یہ حق اس لیے حاصل ہوتا ہے کیوں کہ وہ براہِ راست اللہ کی نگرانی میں کام کرتا ہے اور جو شرائط اس کام کے لیے ضروری ہوتی ہیں وہ پوری کرتا ہے اور اس بات پر اللہ خود گواہ ہوتا ہے کہ دعوت کا حق ادا ہوگیا، حجت تمام ہوئی اور اب کوئی صورت باقی نہیں رہی کہ یہ لوگ ایمان لائیں گے۔ جب یہ مرحلہ آجاتا ہے تو پھر ''اے کافرو'' کہہ کر خطاب کیا جاسکتا ہے۔

دعوت کے سلسلے میں اللہ کی ایک سنت یہ بھی) ہے کہ اللہ کا رسول بھی اگر یہ مرحلہ آنے سے پہلے جلدی کرے اور قوم کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہو تو اس صورت میں قوم پر سے عذاب ٹل بھی جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کے قصے میں بیان کی گئی ہے کہ جب وہ اپنی قوم سے مایوس ہوکر اپنی بستی سے نکل کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم سے عذاب ٹال دیا اور پھر وہی قوم ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئی۔ لیکن جب یہ حجت پوری ہوجائے تو پھر نہ ماننے والی

قوم کوتباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ کہیں آسمان سے عذاب نازل ہوتا ہے، جیسا کہ قوم عاد، قوم ثمود، قوم نوح اور قوم لوط وغیرہ کے ساتھ ہوا کہ پیغمبر جب یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ میں تمھیں نصیحت کر چکا لیکن تم ماننے والے نہیں ہو، لہٰذا میں تمھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اسی طرح کہیں کڑکا آیا، کہیں پتھر برسے، کہیں زلزلے آئے، آندھیاں چلیں اور کہیں شکلیں مسخ ہوئیں، اور کہیں نبی کے ذریعے ان کو ہلاک و برباد کر دیا جاتا ہے۔ چناں چہ حضور ﷺ کے معاملے میں حق تعالیٰ کی سنت یہ رہی کہ آپ ﷺ کے ذریعے مخالفوں کو ہلاک و برباد کر دیا۔ اس کے لیے ہجرت ہوئی، جہاد ہوا اور پہلے ہی دن سے بشارتیں دی جاتی رہیں۔

حضورؐ کی دعوت یہ تھی کہ میں تمھیں ایک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم اس کو مان لو تو عرب و عجم تمھارے زیرِ نگیں ہوں گے۔ جب مخالفین آپ ﷺ سے گفتگو کر کے واپس جاتے تو یہ تاثر لے کر جاتے تھے کہ آپ جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں۔ چناں چہ آپس میں یہ کہتے تھے کہ ان کو، یعنی (محمدؐ) کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر ان کو غلبہ ہو گیا تو اس میں ہمارا بھی فائدہ ہوگا اور اگر عربوں نے ان کو ہلاک کر ڈالا تو یہ جھوٹے (نعوذ باللہ) ثابت ہو جائیں گے اور ہمارا کام بھی ہو جائے گا۔ لہٰذا ہمیں ان سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن سردارانِ قریش آپ ﷺ کی ذات کو اپنی جھوٹی شان و شوکت کے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور آپؐ کی جان لینے کے درپے تھے۔ ہجرت سے پہلے کی رات اسی سازش کے تحت انھوں نے آپ ﷺ کے مکان کا گھیراؤ کر لیا تھا لیکن آپ ﷺ اللہ کے حکم سے بخیر و عافیت ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے، جس کے نتیجے میں مدینہ کی ریاست قائم ہوئی اور اسلام کو بتدریج وہ غلبہ حاصل ہوا کہ لوگ فوج در فوج اور گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے اور اسلام دنیا پر ایک غالب تہذیب بن کر ابھرا۔

اپنے انبیا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے یہ وعدہ اپنے کسی نبی سے نہیں فرمایا کہ وہ اسے اس کی زندگی ہی میں کامیابی اور غلبہ عطا فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوا:

وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (یونس۱۰:۴۶)

”جن برے نتائج سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں ان کا کوئی حصہ ہم تیرے جیتے جی دکھادیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اٹھالیں۔“

البتہ یہ وعدہ ضرور فرمایا ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ ؕ (المجادلۃ:۲۱)

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔''

تاہم اللہ تعالیٰ کی مختلف پیغمبروں اور مختلف قوموں کے ساتھ اپنی مشیت کے تحت مختلف سنتیں رہی ہیں۔

یہ سورۃ کب نازل ہوئی، جس میں فتح ونصرت کی پیشین گوئی ہے؟ اس معاملے میں جو کچھ منقول ہے اس کے مطابق ایک روایت تو یہ ہے کہ یہ سورۃ آخری حج کے موقعے پر جب حضورؐ کے وصال میں تین مہینے رہ گئے تھے، عرفات یا منیٰ کے میدان میں نازل ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق یہ قرآن مجید کی آخری مکمل سورۃ ہے جو نازل ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی آیات تو بعد میں بھی تین مہینے نازل ہوتی رہیں اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ آخری وحی کون سی نازل ہوئی۔ لیکن یہ حج کے موقعے پر نازل ہوئی اور اس میں، جس فتح کی پیش گوئی کی گئی ہے یہ وہ فتح ہے، جس کے تحت پورا عرب آپ ﷺ کے ماتحت آنے والا تھا، اور پھر اس کے بعد تقریباً جتنی مہذب دنیا تھی وہاں بھی آپ ﷺ کا ذکر اور آپ ﷺ کی دعوت پہنچنے والی تھی اور مجموعی طور پر دنیا میں اسلام کو، جو ایک ہزار سال تک غلبہ نصیب ہونے والا تھا یہ اس فتح کی پیش گوئی اور بشارت ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ دراصل فتح مکہ سے پہلے کی بات ہے اور فتح مکہ سے پہلے صلح حدیبیہ کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اس میں فتح کا، جو لفظ ہے یہ دراصل فتحِ مکہ کی طرف اشارہ ہے۔

ان دونوں باتوں کو جمع بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ ان روایات میں مجموعی طور پر فتح کی بات کی گئی ہے۔ اس میں فتح مکہ پہلا قدم ہے اور مزید فتوحات کی کنجی ہے۔ امام رازیؒ کے الفاظ میں فتح مکہ فتح الفتوح ہے۔ آگے جتنی بھی فتوحات ہونے والی تھیں ان کا دروازہ فتح مکہ کے بعد کھلا۔ فتح مکہ ہوئی تو اہل عرب اُٹھے، منظم ہوئے، فوجیں بنیں اور اس کے بعد پھر چند سال کے عرصے میں، جو قریب قریب کی دنیا تھی وہاں اسلام غالب آگیا۔ چناں چہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ میرے خیال میں تو دونوں ایک ہی بات کے مختلف پہلو ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں عموماً فتح مکہ کا لفظ فتح مکہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ نے چوں کہ فتح مکہ کا راستہ ہموار کیا تھا، اس لیے صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے فتحِ مبین قرار دیا ہے۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور ۶ھ کو آپ ﷺ نے خواب میں یہ بشارت دیکھنے کے بعد کہ آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوں گے اور عمرہ کریں گے، آپ ﷺ نے اس بات کا اعلان مدینہ میں فرمادیا، اور ۱۴۰۰ یا ۱۵۰۰ کے قریب ساتھی رضا کارانہ طور پر جمع ہو گئے حالاں کہ بڑا خطرہ درپیش تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ قریش مکہ مخالفت کریں گے، مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور مکہ میں جانے کے لیے لڑائی لڑنا پڑے گی۔ اگر چہ حرام مہینے تھے اور ان میں عربوں کے نزدیک جنگ کرنا حرام تھی، بلکہ مسجدِ حرام سے کسی کا راستہ روکنا بھی بڑا زبردست غیر قانونی جرم تھا۔ پہلے سے، جو بنیادی حقوق اہلِ عرب کو حاصل تھے ان میں سے سب سے بڑا بنیادی حق حج کے مہینوں میں امن کے ساتھ عمرے اور حج کو ادا کرنے کا تھا لیکن قریش نے حدیبیہ آ کر آپ ﷺ کا راستہ روک لیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ رُک گئے۔ آپ کی اونٹنی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جب لوگوں نے کہا کہ ''آج تو قصویٰ آگے نہیں بڑھ رہی'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو اسی نے روک دیا، جس نے اصحابِ فیل کو روک دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ مکہ میں خوں ریزی نہیں چاہتا۔

پہلے پہل تو قریش نے بڑی اکڑفوں دکھائی، اس کے بعد صلح پر آمادہ ہو گئے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ لڑائی ہوئی تو وہ دفاع نہیں کر سکتے اور لڑائی کے بعد مکہ میں آپ ﷺ لازماً داخل ہو جائیں گے۔ پھر بھی انھوں نے اپنی آن بان کے لیے یہ شرط لگائی کہ اس سال آپ ﷺ عمرہ نہ کریں، اگلے سال آئیں۔ آپ ﷺ نے اس بات کو مان لیا۔ پھر انھوں نے یہ کہا کہ جو ہمارا آدمی آپ ﷺ کے پاس چلا جائے گا اسے آپ واپس کر دیں گے اور اگر آپ کا آدمی آئے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے۔ یہ شرط بھی آپؐ نے تسلیم کر لی۔ معاہدے کے اندر جب ''رسول اللہ'' کے الفاظ لکھے گئے تو اس پر انھوں نے اعتراض کیا۔ آپ ﷺ نے اس کو بھی محو کر دیا۔ دراصل آپؐ ہر قیمت پر صلح کرنا چاہتے تھے اور قریش بھی ہر قیمت پر صلح چاہتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کو سب سے زیادہ اس بات پر اعتراض تھا کہ ایسی صلح کیوں ہو رہی ہے اور لوگوں نے بڑے سخت الفاظ کہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو ایسے جملے کہے کہ ان کو اپنی وفات تک صدمہ رہا کہ انھوں نے ایسی باتیں کیوں کہیں کہ کیا ہم ذلیل ہیں؟ کیا ہم مغلوب ہیں؟ آپ ﷺ ان شرائط پر کیوں صلح کر رہے ہیں؟ جب آپ ﷺ نے صلح کر لی تو آپ ﷺ نے سب سے کہا کہ احرام کھول دو، سر مونڈ لو اور قربانی کے جانور قربان کر دو۔ اس پر ایک صحابیؓ بھی آپ ﷺ کی بات پر کھڑے نہیں

ہوئے۔آپ ﷺ اس پر بہت زیادہ رنجیدہ ہوئے۔حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ لوگوں کو اب تک امید ہے کہ آپ ﷺ اس صلح کو شاید اٹھا کر پھینک دیں گے۔آپ ﷺ اٹھیں اور خود قربانی کریں۔پھر لوگ بھی آپ ﷺ کی پیروی کریں گے۔چناں چہ آپ ﷺ نے احرام کھولا، قربانی کی اور سر منڈوایا، پھر سب نے ایسا کیا۔

یہ صلح حدیبیہ تھی۔قریش نے جھک کر یہ صلح کی۔جن کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر نکالا تھا ان کے ساتھ اس بات پر آمادہ ہوئے کہ اگلے سال آؤ اور عمرہ کرو، اور یہ بھی کہا کہ ہم تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیں گے۔یہ اس بات کی علامت تھی کہ انھوں نے مکہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔پھر انھوں نے یہ شرط رکھی کہ ۱۰ سال تک جنگ نہیں ہوگی۔گویا ان کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر جنگ ہوئی تو وہ ہار جائیں گے۔اس صلح کے نتیجے میں انھوں نے حضورؐ کو ایک مساوی قوت کی حیثیت سے بھی تسلیم کر لیا اور یہ کہا کہ جو آپ ﷺ کے حلیف قبائل آپ ﷺ سے معاہدہ کریں وہ آپ ﷺ کے حلیف ہیں، اور جو ہم سے معاہدہ کریں وہ ہمارے حلیف ہوں گے۔اس طرح برابری کی شرائط پر معاملہ ہوا۔چناں چہ جیسے ہی حضورؐ حدیبیہ سے واپس لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح نازل کی:

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ (الفتح:۱)

"اے نبیؐ، ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی۔"

جس صلح کو صحابہ کرامؓ اپنے لیے شکست اور ذلت کا سامان سمجھ بیٹھے تھے اس کو قرآن مجید نے فتحِ مبین قرار دیا اور بالآخر فتح مکہ کا راستہ وہیں سے ہموار ہوا۔

تھوڑی ہی دیر میں پورے عرب نے دیکھ لیا کہ قریش میں لڑنے کی سکت نہیں رہی اور اہلِ عرب ہی کا کیا کہنا تھا خود مکہ کے رہنے والوں نے جان لیا تھا کہ ہمارے اندر لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔چناں چہ ان کے بڑے بڑے سردار خالد بن ولید، عمرو بن العاص وغیرہ جو کہ بہت ذہین اور باصلاحیت تھے، سب ایک ایک کر کے مدینہ پہنچنا شروع ہو گئے اور ایمان لاتے چلے گئے۔چناں چہ دو سال میں یہ صورت حال ہو گئی کہ حضورؐ تشریف لائے تو ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آپ ﷺ مکہ میں داخل ہو گئے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اللہ کی مدد آئی اور فتح ہوئی۔" یہ دراصل بشارت ہے فتح مکہ کی۔پھر فتح مکہ کے نتیجے میں دیگر فتوحات کا دروازہ کھلا اور آپ ﷺ

تبوک تک گئے اور سلطنت روم کو چیلنج کیا اور لشکر تیار کیا، جسے ایران اور روم بھیجا۔

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد مصر، لیبیا، مراکش، تیونس اور ثمر قند و بخارا تک، ان سارے ممالک میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں صحابہ کرامؓ پہنچے۔ اسی دور میں افغانستان اور پورے علاقے کو وہ عبور کر گئے۔ تقریباً ۲۰ سال کے مختصر عرصے میں اتنی کثرت کے ساتھ فتوحات کا ہونا اور نصرت کا حصول، یہ دراصل خدا کے اس وعدے کی تکمیل تھی:

وَ لَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ؁ (الضحٰی:۵)

''عنقریب تمھارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔''

اور اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ (الکوثر:۱) یعنی دنیا و آخرت کی بے شمار بھلائیاں عطا کر دیں۔

خیرِ کثیر میں اس بات کی بھی بشارت دی گئی تھی کہ نبی کریمؐ کا دین کثرت سے پھیلے گا، غلبہ کثرت سے ہوگا، ساتھی کثرت کے ساتھ ملیں گے، دنیا کثرت کے ساتھ نصیب ہوگی اور آخرت میں حوضِ کوثر پر امت آئے گی۔ یہاں اس بات کی بشارت بھی دی گئی تھی کہ ایک وقت آئے گا کہ اللہ کی غیبی مدد سے اور اس کی نصرت سے آپ ﷺ کو فتح نصیب ہوگی، مکہ فتح ہوگا اور مکہ کے بعد سارا عالم فتح ہوگا اور لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوں گے۔ فتح مکہ کے بعد یہ منظر بھی پیش آیا اور ۹ ھ فتح مکہ کے بعد والا سال ہے اور ہمارے سیرت نگاروں کے مطابق یہ عام الوفود تھا، یعنی وفود کے آنے کا سال تھا۔ اس سال پورے عرب کے گوشے گوشے سے عیسائی، یہودی، کفار، مشرکین سب قبائل نے دین کو سمجھنے کے لیے اپنے وفد بھیجے۔ کہاں وہ وقت تھا کہ حج کے موقعے پر حضورؐ خود چل کر حجاج اور سرداروں کے پاس جاتے تھے اور ان کو دین کی دعوت قبول کرنے اور ساتھ دینے کے لیے کہتے تھے، ان سے پناہ طلب کرتے تھے تاکہ وہ اپنا کام آسانی سے کر سکیں لیکن وہ لوگ مان کر نہیں دیتے تھے، اور کہاں یہ عالم ہے کہ ہر قبیلے کا سردار وفد لیے چلا آرہا ہے۔ حضورؐ نے ان کی خوب مہمان نوازی کی۔ الگ سے ایک گھر بنایا جہاں ان کے لیے کھانے پکتے تھے اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کا معاملہ کیا اور اس حسن سلوک کے نتیجے میں ان کے سینے اسلام کے لیے کھل گئے۔ اس طرح بالآخر یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی کہ آپ ﷺ یہ دیکھیں گے کہ لوگ جوق در جوق، فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝ (النصر:۱)

''جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے۔''

سورۂ نصر قرآن مجید کی وہ سورۃ ہے، جس کے اندر یہ بشارت دی گئی ہے۔ اس کے اندر پہلی بات یہ ہے، جیسا کہ اللہ نے کہا ''جب مدد آ جائے اور فتح نصیب ہو جائے'' یعنی دونوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ یہ بات دراصل اس لیے فرمائی ہے کہ فتح اللہ کی نصرت کے بغیر نہیں آ سکتی۔ یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ اگر دین کے لیے کام کرنے والا کوئی داعی یا راہِ خدا میں جہاد کرنے والا کوئی مجاہد یہ خیال کرے کہ میری اصلاح اور تدبیر یا میری قوت اور ساز وسامان یا تعداد سے فتح نصیب ہوگی تو اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر فتح نصیب ہوگی تو اللہ کی نصرت سے ہوگی۔ ضرورت سب چیزوں کی ہوگی۔ تدبیر، سوجھ بوجھ، گفت وشنید، محنت، جدوجہد، لگن، شجاعت و بہادری اور اگر جنگ اور لڑائی کی ضرورت پڑی تو اس کی بھی لیکن یہ یقین اور ایمان ضروری ہے کہ فتح ونصرت ہمیشہ اللہ کے چاہنے سے ہوگی۔ اس کی مدد کے بغیر فتح و نصرت نہیں مل سکتی۔ یہی عقیدۂ توحید ہے۔

توحید کی روح یہ ہے کہ دنیا کے اندر اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ زمین وآسمان کی تدبیر اسی کی ہے اور اسی کا حکم چلتا ہے، پتا بھی اس کے علم اور حکم کے بغیر نہیں ہلتا ہے۔ خشکی اور تری میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کے علم سے باہر ہو۔ آسمان وزمین میں سب جگہ اسی کا راج ہے۔

الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (الفرقان:۲)

''وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے۔''

کوئی ایک انچ یا گوشہ آسمان وزمین میں انسان کی زندگی میں نہیں ہے، یا انسانی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ ایسا نہیں ہے، جو اس کے حکم، تدبیر اور مشیت کے بغیر ہو سکتا ہو۔ پھر جو شخص اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کام کر رہا ہو، جس طرح کہ حضورؐ کر رہے تھے، اس میں یہ ایمان اور یقین ضرور پایا جانا چاہیے کہ اللہ کی مدد آئے گی تو فتح نصیب ہوگی۔ اس ایمان ویقین اور اندازِ فکر کے نتیجے میں اگر اپنے اوپر کوئی غرّہ اور زعم ہو بھی تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔

مسلمان کس بے بسی کے عالم میں جدوجہد کر رہے تھے، اس کی مثال ہجرت کے موقعے پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جب غارِ ثور میں اللہ کے رسولؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ جب کہ

وہ صرف دو تھے اور دشمن کو سر پر دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ گھبرائے تو حضورؐ نے فرمایا تھا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا 'غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے'۔ اسی طرح جب ۴ھ میں غزوۂ احزاب ہوا اور مدینہ کے چاروں طرف ہزاروں کی تعداد میں دشمنانِ اسلام کی فوج جمع تھی اور ایک خندق کھود کر مدینہ کا دفاع کیا جا رہا تھا اور حضورؐ یہاں تک سوچ رہے تھے کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک حصہ دے کر اتنی بڑی تعداد میں آنے والے دشمنوں کو ٹالا جائے، اتنی نازک صورت حال تھی۔ لیکن خدا کی مدد جب شامل حال ہوئی تو پھر فتح و نصرت کی راہ بھی ہموار ہوتی چلی گئی۔ اس واقعے کے بعد آپؐ صلح حدیبیہ کے لیے مکے گئے اور اس کے دو سال بعد آپ ﷺ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہو گئے۔ یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد تھی کہ اتنا عظیم الشان کام انجام پایا۔ لہٰذا فتح، نصرت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اور اللہ کی نصرت ہوگی تو فتح آئے گی۔

فتح و نصرت کے حوالے سے یہ پہلو بھی واضح رہے کہ فتح اللہ کا عطیہ ہے۔ یہ توحید کی دعوت اور شرک سے اجتناب کی روش کو اپنانے کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ ہر دور میں مسلمانوں کو فتح و نصرت اسی دعوت کو اختیار کرنے کے نتیجے میں ملی۔ یہ بات قرآن مجید میں جگہ جگہ واضح کر دی گئی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی شرط یہ ہے:

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۹)

''تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔''

گویا اگر صحیح معنوں میں مومن ہو گے تو غلبہ پاؤ گے۔

دوسری جگہ فرمایا کہ جو لوگ صرف میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کریں گے، انھی سے میں نے زمین کی خلافت کا وعدہ کیا ہے۔ جو زمین میں حکومت پانے کے بعد نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ کی ادائیگی کا نظام قائم کریں گے، معروف اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ انھی کو زمین میں غلبہ اور حکومت دی جائے گی۔ یہ بات بھی اس سورۃ کے اندر واضح طور پر سامنے آتی ہے۔

وَ رَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (النصر: ۲، ۳)

''اور (اے نبیؐ) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو۔''

یہاں فرمایا گیا ہے کہ اے نبیؐ جب آپ ﷺ دیکھ لیں کہ لوگ فوج در فوج، بڑی تعداد میں اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے ہیں تو پھر یہ آپ ﷺ کے لیے بشارت ہے۔ چناں چہ آپ ﷺ کو چاہیے کہ آپ ﷺ اپنے رب کی حمد اور تسبیح کریں اور اس سے مغفرت مانگیں، جیسا کہ سورۂ کوثر میں آچکا ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ (الکوثر:۲)

''پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔''

اسی طرح یہاں پر بھی ف کا لفظ ''پھر'' کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو فتح اور نصرت کی، جو نعمت دی گئی ہے اس کا تقاضا اور حق یہ ہے کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو، اس کی تسبیح کرو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مغفرت چاہو۔ یہ دونوں باتیں بڑی اہم ہیں اور اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتح کا مژدہ اور بشارت سنانے کے بعد فرمایا کہ اپنے رب کی حمد اور تسبیح کرو۔

تسبیح کے معنی بنیادی طور پر کسی کام میں مشغول ہونے کے ہیں۔ اس کے ایک معنی پانی میں تیرنے کے، یا تیزی سے کسی شغل میں مشغول ہونے کے بھی ہیں۔ چناں چہ قرآن مجید میں چاند اور سورج کے بارے میں، جو اپنے مدار میں تیرتے رہتے ہیں، ان کے لیے بھی کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ (الانبیاء:۳۳) ''سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حضورؐ جو دن بھر دعوت کے کام میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے بارے میں قرآن پاک میں ہے:

اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (المزمل:۷)

''دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔''

گویا آپؐ کے لیے دن میں دعوت کے کام کا بڑا طویل شغل ہے۔ اسی طریقے سے بہت ساری جگہوں پر یہ لفظ کسی کام میں کثرت کے ساتھ مشغول ہونے کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ کی حمد کو کثرت کے ساتھ کرو۔ تسبیح کا لفظ اللہ کی پاکی بیان کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اللہ کی پاکی کے معنی ہیں کہ اللہ ہر عیب سے اور ہر برائی سے پاک ہے اور کوئی نقص اس کے اندر نہیں پایا جاتا۔ اگر تسبیح کے لفظ کو حمد کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو حمد کے اندر اللہ کی تسبیح خود بخود آجاتی ہے۔ اس لیے کہ حمد کے معنی ہیں کہ ہر خوبی اور ہر تعریف اپنے درجۂ کمال

میں صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور جس میں ہر خوبی اور ہر کمال درجۂ کمال میں ہو لازماً وہ ہر نقص سے پاک ہوگا۔ اسی لیے یہاں حمد کے ساتھ تسبیح کو جوڑ کر بیان فرمایا گیا ہے۔

اگر ان دونوں لفظوں کو ملا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی ساری صفات ان کے اندر جمع ہو جاتی ہیں اور اللہ کی تمام صفات پر ایمان ان کے اندر شامل ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ اللہ کی حمد و تسبیح زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دیتی ہے، یعنی پوری دنیا انھی دو تسبیحات سے بھری پڑی ہے اور یہ تسبیح میزان کو بھی بھر دیتی ہے۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ اللہ کی ساری صفات ان کے اندر جمع ہیں کہ وہ ہر نقص سے پاک ہے۔ ہر خوبی اور ہر کمال پورے کمال کے ساتھ، ایسے کمال کے ساتھ جو لامتناہی ہے، اسی کے لیے ہے۔ حمد اور تسبیح کا حکم اس لیے دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جس عظیم الشان انعام کا ذکر فرمایا ہے کہ فتح نصیب ہوگی اور لوگ جوق در جوق اس دین میں داخل ہوں گے، جس دین کو آپ ﷺ لے کر آئے تھے، جس کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ آپ ﷺ انجام دے رہے تھے، اس پر تو اللہ ہی شکر کا سزاوار ہے اور اسی لیے فرمایا گیا کہ اس کا شکر ادا کرو۔ اس نعمت کا حق یہ ہے کہ اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اس نعمت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بھی یہی ہے کہ آدمی اللہ کے ساتھ بندھا رہے، اسی کا شکر ادا کرے اور اسی پر بھروسا کرے۔

اس کے ساتھ پھر استغفار کا ذکر کیا کہ اللہ سے مغفرت مانگو اور جہاں صلح حدیبیہ کو فتحِ مبین قرار دیا گیا وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح ۴۸:۲)

”تاکہ اللہ تمھاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے۔“

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ، جو اتنی کثرت سے استغفار کرتے تھے، بعض روایات میں آتا ہے کہ عام حالات میں بھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں دن میں سو سو بار استغفار اور توبہ کرتا ہوں اور صحابہ کرامؓ نے کہا ہے کہ ہم نے ایک مجلس میں دیکھا ہے کہ ۷۰ مرتبہ آپؐ نے توبہ و استغفار کی، آخر کس چیز سے آپ ﷺ کو توبہ اور استغفار کی ہدایت کی گئی ہے؟ جب کہ آپؐ سے تو کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معصوم رکھا اور گناہوں کا سرزد ہونا آپ سے ثابت نہیں ہے۔ اس پر بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ صحیح بات ہے کہ حضورؐ سے کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں ہوا، جو گناہ کے معنوں میں گناہ ہو، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو یا جو آپ ﷺ نے خواہشِ نفس سے مغلوب ہو کر کیا ہو۔ لیکن جیسا کہ ہمارے علما کہتے ہیں کہ دعوت کے جوش اور

دعوت کو پہنچانے کے جوش میں آپ سے کچھ ایسی غلطیاں ہو جاتی تھیں، جو گناہ کی تعریف میں تو نہیں آتی تھیں لیکن آپ ﷺ کا، جو درجہ اور مقام تھا اس کے شایانِ شان نہیں تھیں۔

مثال کے طور پر منافقین آ کر آپ ﷺ پر جھوٹے اعتراضات کرتے تھے، جہاد سے بچنے کے لیے اور جہاد سے واپسی پر سب آ کر جھوٹے عذر اور بہانے تراش کر اجازت مانگتے تھے اور آپ ﷺ اتنے کریم النفس، حلیم اور رحمۃ للعالمین تھے کہ آپ ﷺ سب کو معاف کر دیتے تھے اور سب کے اعتراض (عذر) قبول کر لیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ‌ۚ لِمَ اَذِنۡتَ لَهُمۡ (التوبۃ: ۴۳)

''اے نبیؐ، اللہ تمھیں معاف کرے، تم نے کیوں انھیں رخصت دے دی؟''

آپ ﷺ ان کا عذر رد کر دیتے تاکہ ان کا پول کھل جاتا اور یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی کہ یہ جھوٹے بہانے بنا رہے ہیں اور جھوٹے اعتراض کر رہے ہیں۔ یہ آپ ﷺ کی رحمت اور کریم النفسی اور دعوتی حوالے سے یہ پہلو پیش نظر تھا کہ یہ لوگ ہاتھ سے نکل نہ جائیں۔ اسی لیے آپؐ نے یہ کام کیا کہ عبداللہ بن ابی، جیسے منافق کو جب موت آئی تو اس کے لیے اس کے بیٹے کو اپنا کرتا دیا، جو حضورؐ کے بڑے مخلص صحابی تھے اور آپ ﷺ نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے بھی کھڑے ہوئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو روکا کہ اس کی قبر پر آپ نہ کھڑے ہوں اور نہ ان کے لیے استغفار کریں۔

اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ‌ؕ (التوبۃ: ۸۰)

''اگر تم ستر مرتبہ بھی انھیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔''

لیکن یہ بھی کوئی گناہ نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ کی رحمت اور کریم النفسی کا تقاضا تھا کہ آپؐ مخالفین کو معاف کرتے تھے، ان کے ساتھ رحمت اور شفقت کا سلوک فرماتے تھے۔

غزوۂ بدر میں قیدی آئے، یہ بھی آپ ﷺ کی شفقت کا تقاضا تھا کہ آپ ﷺ نے فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا اور لوگوں نے جلدی قیدی بنا لیے حالاں کہ حکم یہ تھا کہ آج جتنے مخالفین ہیں انھیں قتل کیا جائے۔ اگر کوئی زلزلہ آتا ہے یا پہاڑ پھٹتا ہے تو وہ کوئی تفریق نہیں کرتا اور کسی کو نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح حکم تھا کہ اگر تمھاری تلواروں کے نیچے دشمن آ جائے تو انھیں نہ چھوڑو،

خوب خون بہاؤ لیکن لوگوں نے جلدی قیدی بنا لیے اس کو بھی ناپسند کیا گیا۔ اس قسم کی کئی چیزیں تھیں، جن کی وجہ سے آپ ﷺ کو استغفار کا حکم دیا گیا۔

دوسرے آپؐ کے درجات کی بلندی کی پیش گوئی بھی اس سورۃ میں ہے کہ آخرت میں آپ ﷺ سرخ رو ہوں گے کہ جو کارنامۂ نبوت تھا، اس پر کہیں سے بھی کوئی داغ اور دھبہ نہیں ہوگا۔ ۲۳ سال جس طرح آپؐ نے اس کام میں اپنی جان کھپا دی، جو اللہ نے آپؐ کے سپرد کیا تھا، یعنی دعوت اور دین کو غالب کرنے کا فریضہ، اس پورے کارنامے کے اندر کہیں کوئی انگلی رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔

فی الواقع ایسا ہوا بھی، اس لیے کہ آخری حج کے موقعے پر عرفات کے میدان میں تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا اور پورا عرب تقریباً حج کی ادائی کے لیے امڈ آیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان سب کے سامنے کھڑے ہو کر پوچھا کہ: اللہ جب قیامت کے روز میرے بارے میں پوچھے گا کہ کیا میں نے تم تک حق پہنچا دیا تو تم کیا جواب دو گے؟ سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ: ہم کہیں گے کہ آپؐ نے حق ادا کر دیا اور اپنی بات پہنچا دی اور ہم کو نصیحت کر دی اور ہمارا حق ادا کر دیا۔ روایت میں ہے کہ آپ ﷺ انگلی اوپر اٹھاتے تھے اور پھر مجمع کی طرف نیچے گراتے تھے اور کہتے تھے: اَللّٰھُمَّ اشھَد، اَللّٰھُمَّ اشھَدْ ''اے اللہ تو گواہ رہنا، اے اللہ تو گواہ رہنا۔'' اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس فریضے کو کس احسن طریقے سے انجام دیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہاں استغفار کا جو حکم دیا، آپ ﷺ نے اس کی پیروی کیسے کی، اس حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ اتنی کثرت کے ساتھ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ کہتے تھے کہ آتے جاتے، گھر سے نکلتے ہوئے، اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت اس کا ذکر کرتے تھے۔ میں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپؐ اتنی کثرت سے یہ پڑھتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ایک علامت ظاہر ہوگی اور جب یہ علامت ظاہر ہو جائے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو پھر کثرت کے ساتھ تسبیح کرنا اور حمد کرنا اور وہ علامت تھی: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ○ اس کے بعد آپؐ سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اور اس کے ساتھ استغفار اور توبہ کے مختلف الفاظ جو احادیث کے اندر روایت کیے گئے ہیں بطور حمد، تسبیح اور استغفار نمازوں میں، رکوع میں،

سجدوں میں، اٹھتے بیٹھتے بڑی کثرت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اس کے بعد رات کی نمازوں میں بھی ان اذکار کی بڑی زیادتی ہوگئی۔ حضرت عائشہؓ نے اس پر بھی سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ساری غلطیاں معاف فرما دیں تو پھر آپ ﷺ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ راتوں کو کھڑے رہتے ہیں، پاؤں سوج جاتے ہیں، اور نیند پوری نہیں کر پاتے؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: اَفَلاَ اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا کیا میں شکرگزار بندہ نہ بنوں! اب یہ عبادت شکرگزاری میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کام کو مکمل فرمایا اور اس مقام پر پہنچایا، جو مقام بندگی کا ہے، جس کے لیے تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اس سورۃ کے مخاطب صرف حضورؐ ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے مخاطب حضورؐ کے بعد پوری امت ہے، جس کو وہی مشن اور وہی کام سپرد کیا گیا ہے، جو حضورؐ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری امت کے لیے اور اس امت میں جو لوگ بھی اس کام کو کرنا چاہیں، یا کوئی جماعت یا گروہ کرنا چاہے یا کوئی لشکر یا ریاست کرنا چاہے، اس کام کو کرنے میں یہ دو بازو ہیں، جن سے اس کو پرواز کرنا چاہیے۔ ایک اللہ کا شکر اور اس کی تسبیح، اور دوسرا استغفار۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اللہ سے اپنا تعلق جوڑیں، اسی کا شکر ادا کریں، اپنے اوپر ناز نہ کریں بلکہ اللہ کے اوپر بھروسا کریں اور جو بھی کامیابی ملے اس کو اللہ ہی کی طرف سے سمجھیں، اور ساتھ ہی اپنا جائزہ بھی لیتے رہیں، اس لیے کہ غلطیاں تو ہوسکتی ہیں۔ حضورؐ سے تو گناہ سرزد نہیں ہوسکتا تھا لیکن آپؐ کے بعد آنے والا کوئی معصوم نہیں، کسی سے بھی گناہ اور غلطی ہوسکتی ہے، بڑے بڑے دین داروں اور صالحین سے بھی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اپنے اوپر نگاہ رکھنا اور جہاں غلطی ہو جائے وہاں فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کرنا اور اللہ سے معافی مانگنا، یہ ایک فرد کے لیے بھی اور اجتماعی سطح پر انسانوں، جماعتوں اور تنظیموں کے لیے بھی، ان کی زندگی کا نسخہ ہے۔

وہ قومیں اور جماعتیں، جو اپنی غلطیوں کو دبا جائیں، ان کا اعتراف نہ کریں، ان کی اصلاح نہ کریں بالآخر وہ دنیا کے اندر زوال کی طرف جاتی ہیں اور ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ قومیں، جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتی ہیں اور اصلاح کرتی ہیں وہ دنیا کے اندر ترقی اور عروج پاتی ہیں۔ استغفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اگر استغفار کرو گے تو اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا اور زمین سے کھیتی اُگائے گا اور مال و

دولت میں اور اولاد میں اضافہ فرمائے گا، اور قوت کے اندر اضافہ کرتا چلا جائے گا۔ یہ سارے وعدے استغفار کے ساتھ اس لیے ہیں کہ اپنے اوپر نگاہ رکھنا، اپنا جائزہ لینا، اپنا احتساب کرنا، اپنی غلطی کا اعتراف کرنا، اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا، اپنی انا اور ضد پر اڑ نہ جانا، اپنی اور قوم کی اصلاح کرنا، یہی دراصل دنیا کے اندر بھی ترقی کا نسخہ اور راز ہے۔ اسی لیے ان دونوں چیزوں کا حکم، یعنی اللہ کی حمد اور تسبیح اور گناہوں پر استغفار اور معافی، فتح کی خوش خبری اور بشارت کے بعد دیا گیا ہے۔

دین کی دعوت اور دین کے غلبے کا کام ایسا کام ہے کہ اس کے اندر ہر قسم کے انسانوں کے ساتھ واسطہ پیش آتا ہے اور خاص طور پر ایسے مرحلوں میں جب لوگ جوق در جوق آنا شروع ہو جائیں اور لوگوں کا اس طرف بڑے پیمانے پر رجحان ہو جائے۔ چناں چہ اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ لوگوں کے کاموں کے اندر مشغول ہو کر اللہ کے ساتھ تعلق میں کمی آ جائے۔ اس لیے بھی استغفار کی ضرورت ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ آدمی فتح کی خاطر کچھ غلطیاں کر بیٹھے، اس کے لیے بھی استغفار کی ضرورت ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ایک گروہ کا ذکر کیا ہے، جو خدا پرست لوگ تھے اور انھیں رِبِّيُّونَ کا خطاب دیا ہے اور کہا کہ اتنے "صابر" اور اتنی "استقامت" والے لوگ تھے کہ وہ انبیا کے ساتھ مل کر لڑے اور کوئی کمزوری نہیں دکھائی، کہیں ہلکے نہیں پڑے اور کہیں کوئی بزدلی نہیں دکھائی۔ ایسی حالت میں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے خود بڑی تعریف فرمائی، قصیدہ پڑھا ہے کہ یہ ایسے ربانی لوگ تھے، جنھوں نے صبر و استقامت اور جذبے و اخلاص میں کسی قسم کی کوئی کمزوری نہیں دکھائی مگر ان کے لبوں پر اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں تھی:

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ (آل عمران: ۱۴۷)

"ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔"

فریضۂ اقامت دین کی ادائی کے دوران اور عام لوگوں کو دین کے راستے پر ساتھ لے کر چلتے ہوئے استغفار کرنا چاہیے۔ یہ ساری غلطیاں ہو سکتی ہیں اور اس کے لیے چوکس اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، اپنے اوپر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے اور اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کوئی کام ایسا سرزد نہ ہو جائے، جو اللہ کے حکم اور اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ اس لیے کہ اصل کام تو نہ

لوگوں کی تعداد سے ہوتا ہے، نہ مال واسباب سے اور نہ ساز وسامان سے بلکہ نصرت وفتح سے ہوتا ہے اور جو اللہ کو ناراض کرے گا اس کے حصے میں نہ اس کی نصرت آسکتی ہے اور نہ فتح۔

وہ لوگ جوفوج درفوج آتے ہیں اور شامل ہوتے جاتے ہیں، انھی سے پھر وہ قوت بنتی ہے، جو دین کو غالب کرتی ہے۔ چناں چہ مدینہ کے آخری دنوں میں جب قبائل کا ہجوم ہوا، بڑے بڑے سردار آئے، وہ سردار آئے، جو آپ ﷺ کی مخالفت کررہے تھے، وہ لوگ آئے، جو مکہ میں آپؐ کے جانی دشمن تھے مگر آپ ﷺ نے سب کو معاف کردیا اور سب کو اپنے منصب کے اوپر بحال رکھا۔

ایک موقعے پر حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں خانہ کعبہ کے اندر جانا چاہتا ہوں لیکن خانہ کعبہ کا، جو کلید بردار خاندان تھا، اس نے دروازہ بند کردیا اور آپ ﷺ کو اندر نہیں جانے دیا۔ اس موقعے پر آپؐ نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن آئے گا کہ یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور جب مکہ فتح ہوا تو کنجی آپؐ کے ہاتھ میں آگئی مگر آپ ﷺ نے اسی خاندان کے سپرد کردی کہ تم ہی اس کو لے لو اور آج تک اسی خاندان میں چلی آتی ہے اور قیامت تک اسی خاندان میں رہے گی۔ اس طریقے سے، جو بھی قریش کے سردار آئے، طائف کے سردار آئے یا جو بھی قبائل کے سردار آئے، آپ ﷺ نے ان کے منصب پر انھیں بحال رکھا اور اس طرح سے پورا عرب ان کی قوت بن گیا اور پھر چند ہی برسوں کے اندر اندر ان لوگوں نے اسلام کو پوری دنیا کے اندر غالب کردیا۔

استغفار کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ بڑا اہم پہلو ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اس بات کا حکم دیا ہے کہ جو لوگ فاتح ہوں، اللہ کے نام پر تلوار لے کر لڑیں اور کسی بھی ذریعے سے غلبہ اور فتح حاصل کریں تو لوگوں کی گردنوں پر خدا بن کر نہ بیٹھ جائیں، ان کے آقا بن کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ اللہ کے غلام بن کر حکومت کریں۔ چناں چہ بنی اسرائیل کو اس نے ہدایت دی تھی:

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (البقرۃ:۵۸)

''بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا حِطَّةٌ حِطَّةٌ ہم تمھاری خطاؤں سے درگزر کریں گے۔''

گویا استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا اور اللہ سے معافی مانگتے ہوئے داخل ہونا۔ یہ نہیں کہ ظالم و جابر فرعونوں کی طرح خون بہاتے ہوئے، مال لوٹتے ہوئے، عورتوں کو لونڈیاں بناتے ہوئے،

ان کی عصمتیں پامال کرتے ہوئے داخل ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ عاجزی، انکسار اور خاکساری کے ساتھ فتح کرو اور ضرورت سے زائد خون نہ بہاؤ اور اس کے بعد خود بھی مغفرت مانگو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ مغفرت کا اعلان بھی کرو، یعنی عفو و درگزر کرو کہ ہم کسی کو ناجائز نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لیکن بنی اسرائیل کے بارے میں ہی قرآن پاک نے کہا:

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلاً غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ (البقرۃ:۵۹)

"مگر جو بات ان سے کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔"

وہ ظالم و جابر و فاتح حکمراں بن گئے اور جہاں داخل ہوتے تھے وہاں ظلم پھیلتا تھا تو اللہ نے ان کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔

حضورؐ کے بارے میں یہ روایت آتی ہے کہ جب آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو بغیر خوں ریزی کے داخل ہوئے اور امن و امان کی یقین دہانی کر کے داخل ہوئے۔ ابوسفیان عمر بھر آپؐ کی مخالفت کرتے رہے۔ فتح مکہ کے موقعے پر بھی انھوں نے یہی کہا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ ایک ہے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کو امان ہے۔ اس پر ابوسفیان نے کہا: میرے گھر میں کتنے لوگ آجائیں گے؟ آپ ﷺ نے کہا کہ جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کو بھی امان ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسجد حرام میں کتنے لوگ آجائیں گے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ جو اپنے ہتھیار ڈال دے اس کے لیے بھی امان ہے۔ انھوں نے کہا: یہ بھی کتنے لوگ ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کے لیے بھی امان ہے۔ اس طرح مکہ فتح ہو گیا اور ایک بھی قطرۂ خون نہیں بہا۔

تمام سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقعے پر آپ ﷺ کی گردن جھکتے ہوئے اور آپ ﷺ کی داڑھی مبارک اونٹ کے کوہان سے لگ گئی۔ آپ ﷺ سجدہ کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔ آپؐ کسی ظالم حکمراں کی طرح مکہ میں داخل نہیں ہوئے حالاں کہ وہاں سے آپؐ کو ظلم کر کے نکالا گیا تھا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ انتقام لینے کے لیے داخل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد مکہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اُمِّ ہانی کے گھر جا کر آٹھ رکعت نماز ادا کیا اور اس سے پہلے کوئی کام نہیں کیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ چاشت کی نماز تھی لیکن آپ ﷺ نے کبھی عمر بھر اس طرح نماز نہیں پڑھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فتح کے شکرانے کی نماز تھی۔ اس طریقے سے آپؐ مکہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد یہی مسلمانوں کی روش رہی جب تک وہ صالح رہے۔ دمشق فتح ہوا، بیت المقدس فتح ہوا، سب جگہ وہ اس سنت پر عمل پیرا رہے۔ جب بیت المقدس فتح ہوا تو حضرت عمرؓ مدینہ سے خود گئے۔ کتنی خوشی کا موقع تھا لیکن اس حال میں گئے کہ قبا میں پیوند لگے ہوئے تھے اور غلام ساتھ تھا۔ ایک دفعہ غلام اونٹ پر بیٹھتا تھا اور دوسری مرتبہ وقت کا حکمراں بیٹھتا تھا، جس کی سلطنت اب مصر اور شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ جا کر خود معاہدے پر دستخط کیے اور مسلمانوں کے طریقے سے لوگ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ عورتیں بن سنور کر کھڑی ہوئیں کہ فاتحین آ رہے ہیں مگر مسلمان پورے شہر سے گردن جھکا کر گزر گئے، آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس صلیبی جنگوں کے زمانے میں جب عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کیا تو پورے بیت المقدس میں اتنی لاشیں اور خون تھا کہ لوگ چل نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے بلا کسی تمیز کے مسلمان، یہودی، سب کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا۔ مسلمانوں میں اور غیر مسلموں میں دراصل یہی فرق تھا اور جو بہت نمایاں تھا۔ قرآن نے اسی لیے کہا کہ جب فتح آ جائے تو اللہ کی حمد کرو، تسبیح کرو، استغفار کرو اور خود بھی استغفار کرو اور لوگوں میں بھی عفو و درگزر کا اعلان کرو۔ یہ حضورؐ کے لیے بشارت کے ساتھ ساتھ ساری انسانیت کے لیے بھی رحمت اور عفو و درگزر کی بشارت ہے، جو اس سورۃ کے اندر موجود ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۝ (النصر: ۳)

”بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔“

یعنی وہ خود بھی بڑا رحم کرنے والا ہے اور جو غلطیاں بھی اس کے کام میں ہوں گی وہ معاف کرنے والا ہے۔ جو شخص بھی اخلاص کے ساتھ اور تن من دھن کے ساتھ اللہ کا کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی معاف فرمائے گا۔

یہ سورۃ دراصل حضور ﷺ کے لیے بھی بشارت و ہدایت ہے اور آپ کی پوری امت کے لیے بھی۔ اس میں راستا بھی بتایا گیا ہے اور کامیابی کا حق بھی اور کامیابی کو برقرار رکھنے کا نسخہ بھی اس میں درج کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆

سورۃ اللّھب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾ سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ۚ﴿ۖ۳﴾ وَّ امۡرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ ۚ﴿۴﴾ فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔
ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا، وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی، لگائی بجھائی کرنے والی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی۔

تشریح: یہ سورۃ، سورۂ نصر کے بعد آئی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ اور ان کے ساتھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کو اپنی طرف سے نصرت اور فتحِ مکہ کے بعد فتحِ عالم کی بشارت اور خوش خبری دی تھی۔ یہ حضور ﷺ کے چچا ابولہب کے بارے میں ہے۔ یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سورۃ یہاں پر کیوں درج کی گئی ہے؟

اس سورۃ کے زمانۂ نزول کے بارے میں تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی، لیکن مکے میں یہ کس وقت نازل ہوئی؟ اس سلسلے میں لوگوں کی مختلف آرا ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جب حضور ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر پہلی دفعہ قریش کو برملا اپنی دعوت کی طرف پکارا تو سارے قریش کے قبیلے آپ ﷺ کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور آپ ﷺ نے دعوت پیش کی۔

اس پر ابولہب نے کہا: ”تم برباد ہو، تمھارے ہاتھ ٹوٹ جائیں، کیا تم نے اسی لیے ہم کو بلایا تھا۔“ اس کے جواب میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔

ایک رائے یہ ہے کہ جب حضورؐ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر قریش کے مظالم اس حد تک بڑھ گئے کہ آپ ﷺ کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا گیا اور آپ ﷺ کا سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا، آپ ﷺ کو خرید و فروخت کرنے سے منع کر دیا گیا اور حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھی مرد، عورتیں اور بچے سب بھوک سے پریشان رہے تو اس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اس سوشل بائیکاٹ میں ابولہب کا بہت نمایاں حصہ تھا۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ دراصل ہجرت سے کچھ پہلے کی سورۃ ہے۔

اس سورہ میں اگرچہ ابولہب کا ذکر ہے لیکن فی الواقع یہ حضورؐ کے دشمنوں کی تباہی اور ہلاکت و بربادی کی بشارت ہے، جو حضورؐ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو دی گئی۔ اس لحاظ سے یہ سورۂ نصر کے بعد آئی ہے کہ نصرت اور فتح بھی نصیب ہوگی اور دشمن بھی ہلاک اور برباد ہوں گے۔ یہ اسی قسم کی بات ہے جیسے قرآن پاک میں ہے:

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ط (بنی اسرائیل:۸۱)

”حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔“

جَآءَ الْحَقُّ، حق آ گیا کی تفسیر تو سورۂ نصر ہے، اور زَهَقَ الْبَاطِلُ کہ باطل مٹ گیا کی تفسیر سورۂ لہب ہے۔

جب حضورؐ نے مکہ فتح کیا تو آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا، جس کے چند جملے بہت معروف ہیں، جو حج کے موقعے پر بھی بار بار پڑھے جاتے ہیں۔ جب حضورؐ صفا کی چوٹی پر چڑھے تو یقیناً آپؐ کے ذہن میں ۲۳ سال پہلے کا وہ منظر ضرور ہوگا کہ جب آپؐ یکہ و تنہا وہاں کھڑے تھے، آپ ﷺ کا مذاق اڑایا جا رہا تھا، کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا، سارے سردار آپؐ کی مخالفت پر کمربستہ تھے، جب کہ اب سب سرنگوں ہو چکے تھے۔ جب حجۃ الوداع کے موقعے پر آپ ﷺ کوہِ صفا پر چڑھے تو اس وقت بھی آپؐ نے یہی الفاظ دہرائے اور سارے حاجی جب کوہِ صفا پر چڑھتے ہیں تو یہی الفاظ دہراتے ہیں۔ ویسے بھی عرفات کے میدان میں اور منیٰ میں ان الفاظ کے ذکر کی تاکید کی گئی ہے اور سنت بھی یہی ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں:

لاَ اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْـدَہٗ صَدَقَ وَعْـدَہٗ وَ نَصَرَ عَبْـدَہٗ وَ هَـزَمَ الْاَحْزَابُ وَحْدَہٗ.

''اللہ کے علاوہ کوئی الہٰ نہیں۔ اس نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا اور اس نے اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اکیلے اس نے سارے مخالفین کو شکست دے دی اور تباہ و برباد کر دیا۔''

نَصَرَ عَبْدَہٗ یعنی اپنے بندے کی مدد کی دراصل سورۂ نصر میں اس کی بشارت تھی اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح مشرکین کو تباہ و برباد کیا یہ سورۂ لہب میں ہے۔ اس لحاظ سے یہ سورۃ، سورۂ نصر کے بعد آئی ہے، جو کہ فتح و نصرت کی بشارت تھی۔ یہ اسی کا ایک حصہ ہے، جس میں آپ ﷺ کے مخالفین کی تباہی اور بربادی کی بشارت آپؐ کو دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مکے کے سخت دور میں نازل ہوئی ہے یا ہجرت سے پہلے آئی ہے۔ اس بشارت کی تکمیل غزوۂ بدر کے موقعے پر بدر کے میدان میں ہوئی۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ○ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ○
(اللّھب:۱،۲)

''ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔''

تبًّا کا لفظ عربی میں کئی معنوں میں آتا ہے۔ ہلاکت، تباہی، نقصان اور گھاٹے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور ذلت و نامرادی کے معنوں میں بھی۔ چناں چہ اس آیت کا، جو دوسرا ٹکڑا ہے کہ اس کے ہاتھ ہی نہیں تبا کا شکار ہوئے، بلکہ وہ خود بھی 'تَبَّ' یعنی برباد ہو گیا۔ گویا وہ خود بھی ٹوٹ گیا، نقصان اور گھاٹے میں پڑا، ذلیل و رسوا ہوا اور بالآخر ہلاک ہو گیا۔

ہاتھ کا لفظ اردو میں بھی اور عربی میں بھی زور و قوت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ''میں نے زورِ بازو سے کام کیا'' یہ ہم محاورۃً استعمال کرتے ہیں اور بازو ٹوٹ جانا قوت ختم ہو جانے کے معنوں میں آتا ہے۔ اس طریقے سے ہاتھ کا لفظ مدد کرنے والوں اور اپنے دوستوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ میرا دستِ راست تھا۔ وہ میرا سیدھا ہاتھ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ میرا زبردست مدد کرنے والا تھا، میرا مشیر تھا اور میرے ساتھ کام کرنے والا تھا۔ اردو میں یہ محاورۃً استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو انصار، مدد کرنے والے، یا

مددگار اور دوست ہوں، وہ بھی ہاتھ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ عربی محاورے میں یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ ہاتھ ٹوٹ گئے۔ ہاتھ ہی آدمی کی قوت اور کام کی علامت ہیں۔ اگر دشمن سے مقابلے میں کہا جائے کہ ہاتھ ٹوٹ گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ مقابلے سے عاجز آ گیا اور مقابلہ نہ کر سکا۔ اس لیے وَتَبَّ کے معنی ہوئے کہ زور بھی ٹوٹ گیا اور اس کے جو ساتھی تھے وہ بھی ختم ہو گئے اور وہ خود بھی ہلاک و برباد ہو گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابولہب کا نام لے کر یہ بات کیوں کہی جا رہی ہے؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ دعا ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ٹوٹیں اس کے ہاتھ اور وہ برباد ہو جائے۔" یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ دراصل ابولہب کی مذمت اور تذلیل ہے لیکن قرآن مجید نے حضورؐ کے کسی بھی مخالف کا نام نہیں لیا اور کبھی نام لے کر مذمت نہیں کی یا بددعا نہیں دی۔ آخر ابولہب کا نام کیوں لیا گیا؟

بالعموم قرآن مجید نے ان لوگوں کے نام نہیں لیے، جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مخالف تھے، اگرچہ وہ سردار اور زور آور لوگ تھے۔ فرعون، قارون، ہامان، ابراہیم علیہ السلام کے والد آذر، یہ چند نام ہیں، جن کا تذکرہ ملتا ہے۔ البتہ حضورؐ کی پوری سیرت قرآن پاک کے اندر بیان کی گئی ہے اور بار بار آپؐ کے مخالفین کا ذکر آتا ہے، ان کے اعتراضات کا، ان کی تنقید کا، ان کی صفات کا، ان کی دنیا پرستی اور مخالفت وغیرہ سب کا ذکر آتا ہے۔ لیکن ان کا نام نہیں آتا۔ جیسا کہ میں نے سورۂ کافرون کی تشریح میں واضح کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے "اے کافرو!" کہہ کر کہیں بھی خطاب نہیں کیا سوائے اس ایک مقام کے۔ اسی طرح پورے قرآن میں کسی دشمنِ رسولؐ کا نام نہیں لیا گیا سوائے ابولہب کے اور وہ بھی اسی سورۃ کے اندر لیا گیا ہے۔

ابولہب حضورؐ کا چچا تھا اور بعض روایات کے مطابق وہ حقیقی چچا تھا، یعنی مائیں تو بہت تھیں لیکن یہ اسی ماں سے تھا، جس ماں سے حضورؐ کے والد عبداللہ تھے۔ اس لحاظ سے یہ حضورؐ کا حقیقی چچا تھا اور قریش میں اونچے منصب پر فائز تھا۔ قریش نے ایک نظام بنایا تھا، اس میں مختلف محکمے قائم کیے تھے اور مختلف لوگوں کو مختلف محکمے ملتے تھے۔ ایک شعبہ ندوہ تھا، جس کا شوریٰ یا پارلیمنٹ کی طرح ایک انچارج ہوتا تھا۔ ایک کے پاس جھنڈا رہتا تھا، ایک کھلانے پلانے کا انچارج تھا، جسے آج کی اصطلاح میں ہم وزیر خوراک کہہ لیں اور ایک کے پاس خزانے کی کنجی

ہوتی تھی۔ ابولہب کے پاس خزانے کی کنجی رہتی تھی۔ چناں چہ قریش کی جو بھی ریاست (City state) تھی وہ اس کا وزیر خزانہ تھا اور پورا خزانہ، جو خانہ کعبہ میں محفوظ تھا اس کی تحویل میں تھا۔ وہ اس کا متولی بھی تھا۔ متولی کا منصب، جسے ہم آج کی اصطلاح میں خادم الحرمین کے نام سے پکارتے ہیں، وہ بھی اس کو حاصل تھا۔ ویسے تو سارے قریش ہی متولی تھے لیکن اس کا خصوصی منصب تھا۔

ابولہب نے سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کی مخالفت کی۔ اگر چہ ابوجہل اور ابوسفیان نے بھی مخالفت کی اور ان کی مخالفت بھی کوئی کم نہیں تھی لیکن ابولہب کی مخالفت تو پہلے دن ہی سے شروع ہوگئی تھی جب حضورؐ نے کوہِ صفا میں کھڑے ہوکر لوگوں کو پکارا تھا۔ آپ ﷺ نے نعرہ لگایا: وَاصَبَاحَا اس کے معنی ہیں کہ صبح ہی صبح خطرہ درپیش ہوا۔ عرب میں ایک طریقہ تھا کہ آدمی اپنے کپڑے اتارتا تھا اور اونٹ کے کان کاٹ کر اونٹ کے اوپر کھڑے ہوکر یہ نعرہ لگاتا تھا۔ کیوں کہ صبح ہی صبح حملے ہوا کرتے تھے، گویا یہ دراصل اعلان تھا کہ صبح کو کسی حملے کا خطرہ ہے۔ چناں چہ آپؐ نے ایک ایک قبیلے کا نام لے کر پکارا اور سب جمع ہوگئے، کوئی پیچھے نہیں رہا۔ یہ آپؐ کی دیانت و امانت اور آپ ﷺ کا وقار اور عزت تھی کہ لوگ آپ ﷺ کی پکار پر دوڑے چلے آئے۔ پھر آپؐ نے کہا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر ہے، جو حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری بات کا یقین کروگے؟ لوگوں نے کہا کہ ضرور یقین کریں گے کیوں کہ ہم نے آپؐ کو ہمیشہ سچا پایا ہے۔ گویا آپؐ نے اپنی بلندیِ کردار اور صداقت دونوں کا داعی کے طور پر اعتراف کروالیا۔ پھر کہا کہ میں تمھیں ایک عذاب سے ڈراتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ نے تمھارے سر پر کھڑا کر رکھا ہے۔ اس پر سب سے آگے بڑھ کر ابولہب نے مخالفت کی اور کہا کہ آپ ﷺ برباد اور ہلاک ہوں۔ کیا ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا کہ ہمیں یہ بات کہو۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے مارنے کے لیے ایک پتھر بھی اٹھایا۔ پھر وہ ہمیشہ آپؐ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔

آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ مختلف قبیلوں کے میلے لگتے تھے، بازار لگتے تھے، حج ہوتا تھا اور پورے عرب سے قبیلے آتے تھے اور خیمے لگا کر قیام کرتے تھے تو آپ ایک ایک قبیلے کے سردار کے پاس خیموں کے اندر جاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں یہ پیغام لے کر آیا ہوں اور اس پیغام کو قبول کرلو اور میرا ساتھ دو۔ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ اور میری مدد کرو تاکہ اللہ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے وہ مکمل ہوسکے۔ یہ سعادت ان سرداروں کے حصے میں تو نہیں آئی، یہ یثرب

کے کسانوں کے حصے میں آئی، جنھوں نے حضورؐ کو سہارا دیا اور پناہ دی لیکن آپ ﷺ ہر ایک کے پاس جاتے تھے۔ نبوت کے تیسرے سال ہی سے آپؐ ہر ایک سے یہی کہتے تھے اور کھڑے ہو کر تقریر بھی کیا کرتے تھے۔

ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضورؐ نے یہ کہا تو ایک آدمی نے مٹی اٹھا کر آپ ﷺ پر پھینکی اور کہا کہ تو اس لیے آیا ہے کہ ہمارے معبودوں کو ہم سے برگشتہ کر دے۔ لوگو! اس کی بات نہ سنو اور نہ مانو۔ یہ صحابی اس وقت بچے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کھڑے ہو کر تقریر کر رہے تھے کہ قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ تُفْلِحُوْنَ ''تم لا الٰہ الا اللہ کہہ دو تو کامیاب ہو جاؤ گے۔'' وہاں بھی یہ آپ ﷺ کی تقریر کے دوران اسی طرح مٹی پھینک رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ پتھر مار رہا تھا اور آپ ﷺ کا خون آپؐ کی ایڑیوں تک پہنچ رہا تھا۔ یہ اس کی مخالفت کا عالم تھا۔

اس کے گھر کی دیوار حضورؐ کے گھر کی دیوار سے ملی ہوئی تھی۔ اس نے پڑوسی کی حیثیت سے بھی آپ ﷺ کو اذیت پہنچانے میں کبھی کوئی کمی نہ کی۔ کبھی آپ ﷺ کے گھر میں گندگی پھینک دی۔ اگر کھانا پک رہا ہے تو اس کے اوپر کچھ پھینک دیا۔ یہ حرکتیں بھی اس کے گھر سے جاری رہتی تھیں۔ اس کے دو بیٹے تھے عتبہ اور عتیبہ۔ ان دونوں کا نکاح حضورؐ کی صاحبزادیوں ام کلثوم اور رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہوا تھا۔ اس نے زبردستی دونوں بیٹوں سے طلاق دلوادی۔ یہ بھی عرب کے معاشرے میں رواج تھا، بلکہ ہر معاشرے میں توہین و تذلیل کے لیے کیا جاتا ہے۔ جب حضورؐ کے دوسرے بیٹے عبداللہ فوت ہوگئے تو چچا کی حیثیت سے بجائے اس کے کہ وہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہوتا، وہ خوشی کے مارے دوڑا دوڑا گیا کہ اب تو آپؐ کی نسل کٹ گئی اور اب کوئی آپ ﷺ کا نام لیوا باقی نہیں رہا۔ سورۂ کوثر میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے۔

حضورؐ سے دشمنی میں سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ جب قریش نے حضورؐ کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور معاہدہ لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا کہ کوئی آپؐ سے بات نہیں کرے گا، کوئی ان کے ہاتھ سودا نہیں بیچے گا اور نہ کوئی ان سے سودا خریدے گا، نہ کوئی کھانا دے گا اور نہ غلہ۔ آپؐ کا

مکمل سوشل بائیکاٹ یا مقاطعہ کیا گیا اور ہر طرح سے آپ ﷺ کو تنہا کر دیا لیکن بنو ہاشم پورے کے پورے حضوؐر کے ساتھ تھے اور اس طرح ساتھ تھے کہ جو ایمان نہیں لائے تھے وہ بھی ساتھ تھے۔ یہ عرب کی مضبوط روایت تھی۔ اب بھی قبیلوں اور برادریوں میں یہ روایت ہے۔ اس زمانے میں بھی یہ ایک مضبوط روایت تھی اور اس کا لوگ برا نہیں مانتے تھے کہ قبیلے والے اپنے قبیلے کی حمایت کریں۔ چناں چہ بنی ہاشم نے مخالفین کے بے شمار مطالبات کے باوجود حضوؐر کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ کسی نے اس کو برا نہیں سمجھا اور اپنے قبیلے کا مکمل ساتھ دیا۔ عربوں کی یہ روایت تھی کہ اپنے خاندان کے فرد کو عرب کا کوئی قبیلہ دشمن کے حوالے نہیں کرتا تھا۔ اس ظالمانہ معاہدے کو لکھنے میں صرف ایک آدمی شریک تھا اور وہ ابولہب تھا۔ اس نے اس پر دستخط بھی کیے اور وہ بائیکاٹ کے اندر شریک بھی رہا اور شریک ہی نہیں رہا بلکہ باہر سے جب قافلے اناج اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتے تھے تو ان سے کہتا تھا کہ ان سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ دے نہ سکیں۔ چناں چہ وہ لالچ میں آکر قیمتیں بڑھا دیتے تھے اور حضوؐر کے، جو ساتھی بھوکے پیاسے غلہ خریدنے کے لیے آتے تھے وہ بغیر کچھ خریدے واپس چلے جاتے تھے۔

یہ شخص حضوؐر سے دشمنی میں ہر موقعے پر پیش پیش رہا۔ یہاں تک کہ دارُ الندوہ میں شوریٰ کے اندر، جو آخری مشورہ ہوا تھا کہ آپ ﷺ کو قتل کر دیا جائے اس میں بھی یہ آگے آگے تھا۔ رات کے وقت جب حضوؐر کے گھر کو آپ ﷺ کو قتل کرنے کی غرض سے گھیر اڈالا گیا تو اس میں بھی یہ چچا ہونے کے باوجود شریک تھا۔

تمام مخالفین کی مخالفت کے مقابلے میں اس کی مخالفت کے کچھ پہلو ایسے تھے، جس کی وجہ سے اس کا خاص طور پر ذکر کیا گیا اور نام بھی لیا گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ وہ خزانے کا مالک تھا اور خورد برد کر کے بے ایمانی کر کے اپنے گھر کو بھرتا تھا۔ چناں چہ قریش کے، جو چار امیر ترین آدمی تھے، ایک روایت کے مطابق ان میں سے ایک ابولہب بھی تھا، اس کے پاس تقریباً ۸۰۰ تولے سونا تھا۔ ایک دفعہ خانہ کعبہ سے سونے کے ہرن چوری ہو گئے تو لوگوں نے اسی پر الزام لگایا تھا۔ حالاں کہ یہ انتہائی کمینگی تھی کہ اللہ کے گھر میں جو خزانہ ہے، اس میں سے کوئی چیز چوری ہو جائے، مگر لوگ اس کی زر پرستی اور دنیا پرستی کو جانتے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ حضوؐر جس فیاضی، غریب پروری اور صلہ رحمی کی تعلیم دیتے تھے اس کی زد بھی ابولہب پر پڑتی تھی۔

حضور ﷺ کے دعوت کے دو حصے تھے۔ایک یہ کہ اللہ کی خالص بندگی کرو اور اس میں کسی کو شریک نہ کرو۔ دوسرا حصہ فیاضی سے متعلق تھا۔ اللہ کی راہ میں دولت خرچ کرنا، اللہ کے بندوں کی اور غریبوں کی مدد کرنا، غلاموں کو آزاد کرنا، بھوکوں کو کھلانا، یتیموں کی پرورش کرنا ـــ یہ آپؐ کی دعوت کا دوسرا حصہ تھا۔یہی وہ حصہ تھا، جس کی زد ابولہب پر پڑتی تھی۔اس لیے کہ وہ انتہا درجے کا کنجوس تھا۔خانہ کعبہ کا متولی اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے اس نے جس طرح اپنا گھر بھرا تھا، اس کے اوپر بھی اس بات کی زد پڑتی تھی۔ یہ دو وجوہات تھیں، جس کی وجہ سے یہ سب سے بڑھ کر آپؐ کا مخالف تھا۔وہ قریبی رشتے داروں کے باوجود شدید دشمنی رکھتا تھا، جب کہ دوسری طرف عرب کی بڑی زبردست روایات تھیں، جس کی پاس داری اس کے دیگر رشتے داروں اور اہل قبیلہ نے کی۔

مشہور روایات کے مطابق آپؐ کے چچا ابوطالب آخری وقت تک ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہ حضور ﷺ پر قربان ہوتے رہے اور آپ ﷺ کا دفاع کیا۔حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی چچا تھے وہ بھی ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے۔ایک دفعہ ابوجہل نے حضور ﷺ سے زیادتی کی تو اس سے جا کر کہا کہ جاؤ میں ایمان لایا اور غیرت کے مارے حضورؐ کے پاس گئے۔حضرت عباسؓ نے ایمان کا اعلان نہیں کیا تھا اور وہ غزوۂ بدر میں لڑنے کے لیے بھی گئے تھے۔یہ گرفتار بھی ہوئے لیکن وہ دل کے صاف تھے اور بعض روایات کے مطابق حضورؐ نے خود ان سے کہا تھا کہ اپنا ایمان ظاہر نہ کریں۔مکہ ہی میں رہیں اور یہاں کی خبر رسانی کریں کہ مکہ میں کیا ہو رہا ہے؟ دشمنوں میں کیا مشورے ہو رہے ہیں؟ اس سے باخبر رکھیں۔حضورؐ کے تقریباً سب رشتہ داروں کا یہی حال تھا، سوائے اس ایک چچا کے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس کا نام لے کر اس کے بارے میں یہ بات کہی۔

یہ نہ بددعا ہے اور نہ مذمت۔ بلکہ یہ بشارت اور پیش گوئی ہے اور یہ سورۃ جو کہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی، یا جس وقت بھی نازل ہوئی، اس میں ابولہب کی ہلاکت اور تباہی کی پیش گوئی کی گئی ہے اور بشارت دی گئی کہ ابولہب اور آپ ﷺ کے سارے دشمن اس طریقے سے ہلاک ہوں گے۔اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ غزوۂ بدر میں پورا ہوا۔اس میں جو پیش گوئیاں کی گئیں ہیں، یہ دنیا میں ایک ایک کر کے پوری ہو گئیں اور جو پیش گوئیاں آخرت میں پوری ہونے والی ہیں، ان پر آدمی یقین کر سکتا ہے کہ وہ بھی ضرور پوری ہوں گی۔

اس میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ اس کا زور ٹوٹ جائے گا، وہ مقابلے سے بھی عاجز رہے گا اور حضورؐ کا مقابلہ بھی نہیں کر سکے گا۔ دوسری یہ کہ وہ خود بھی ہلاک اور برباد ہوگا۔ تیسری یہ کہ جس مال کی خاطر اس نے سب کچھ کیا، دشمنی کی ہے، مخالفت کی ہے، رذالت اور کمینگی کی حد تک دشمنی کی ہے، یہ مال بھی اس کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ وَمَا کَسَبَ یعنی اور جو اس نے کمایا، اس کے کیا معنی ہیں؟ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی اولاد ہے کہ اس کی اولاد بھی اس کے کام نہیں آئے گی۔ یہ دنیا کے بارے میں پیش گوئیاں ہیں، جو کہ قرآن مجید نے ہجرت اور غزوۂ بدر سے بھی بہت پہلے کر دی تھیں اور یہ سب کی سب حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں۔

بدر کے میدان میں جب قریش مقابلے کے لیے نکلے تو ہر سردار، جو آپؐ کا مخالف تھا مقابلے کے لیے نکلا اور کوئی پیچھے نہیں رہا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ معرکہ بڑا زبردست معرکہ ہے۔ ۱۳ برس سے وہ جس دین کی مخالفت کر رہے تھے، جس نبی کو جھوٹا کہہ رہے تھے، بے دین کہہ رہے تھے، باغی کہہ رہے تھے، اب اس دین کو کچلنے کا وقت آ گیا تھا۔ کوئی بھی پیچھے نہیں رہا حتیٰ کہ حضرت عباسؓ بھی نکل کھڑے ہوئے لیکن ابولہب اپنی بزدلی کی وجہ سے نہیں گیا۔ بزدلی بھی عرب میں بڑی برائی سمجھی جاتی تھی۔ کافر ہونے کے باوجود وہ شجاع اور بہادر تھے لیکن بزدلی کو ننگ انسانیت سمجھتے تھے، یہ ان کے لیے بے عزتی کی بات تھی۔

ایک شخص پر ابولہب کے ۴ ہزار قرض تھے۔ اس نے اس سے کہا کہ اگر تم میری جگہ لڑنے چلے جاؤ تو میں تمھارا یہ قرض معاف کر دوں گا۔ اس میں دولت کی بھی محبت تھی اور بزدلی بھی تھی کہ کسی کو اپنی جگہ جان دینے کے لیے بھیجا کہ تم میدانِ جنگ میں میری طرف سے لڑو اور خود بیٹھا رہا۔

یہاں یہ جو فرمایا گیا کہ اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور اس کے کام نہیں آئے، وہ بھی سچ ثابت ہوا کیوں کہ وہ حضورؐ کے خلاف پھر کبھی تلوار نہیں اٹھا سکا۔ دوسرے لوگوں نے تو تلوار اٹھائی اور مقابلہ کیا لیکن اس کے بازو ٹوٹ گئے۔ وہ بزدلی اور دولت کی محبت کی وجہ سے تلوار اٹھا کر مقابلہ بھی نہیں کر سکا۔ اس کے بعد حضورؐ کے جتنے سیاسی مخالف تھے، بڑے بڑے اور نامی گرامی سردار سوائے ابوسفیان کے تقریباً سب کے سب میدانِ بدر میں ہلاک ہوئے۔ حضورؐ نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے پیش گوئی فرما دی تھی کہ فلاں یہاں مرے گا اور فلاں یہاں مرے گا، وہ

سب وہیں مرے اور وہیں ان کی لاشیں پائی گئیں۔ ابوجہل کے بارے میں بھی پیش گوئی کی گئی تھی اور جب اس کے بارے میں خبر نہیں ملی اور اس کی لاش نہیں ملی تو آپ ﷺ نے بار بار لوگوں کو بھیجا کہ جا کر تلاش کرو اور وہیں اس کی لاش بھی پائی گئی۔ اس طرح اس کے جو اعوان و انصار تھے، جو مخالفت میں اس کے ساتھ ساتھ تھے، جو ابولہب کے دستِ راست تھے وہ سب بھی ہلاک ہو گئے اور اس کے وہ بازو ٹوٹ گئے۔ قرآن کی یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی۔

وہ خود بھی ہلاک ہوا۔ یہ پیش گوئی بھی اس طرح پوری ہوئی کہ بدر کے ساتویں دن جب یہ خبر آئی اور لوگ دوڑے دوڑے آئے کہ وہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہو گیا۔ ہم تو ایک ہزار کی تعداد میں پوری طاقت اور بڑے ساز و سامان کے ساتھ گئے تھے، لیکن وہاں ہمارے سب سردار قتل ہو گئے اور قریش کی پوری قوت ٹوٹ گئی تو اس کو بہت افسوس ہوا۔ اس کے بعد ساتویں دن اس کو چیچک نکلی اور چیچک کو عرب سمجھتے تھے کہ یہ پھیلنے والا مرض ہے اور ویسے بھی یہ متعدی مرض ہے، چناں چہ سب اس سے دور ہو گئے۔ اس کے بیوی، بچے، سب نے اس کو چھوڑ دیا۔ قرآن میں ہے کہ کوئی بھی اس کے کام نہ آیا۔ اس کا مال جسے وہ بچا بچا کر رکھتا تھا اور ۴ ہزار درہم کا قرضہ وصول کرنے کے لیے اپنی جگہ اس نے کسی اور کو لڑنے کے لیے بھیجا، وہ مال بھی کام نہ آیا اور جو مال گھر میں جمع تھا وہ بھی کام نہ آیا، اولاد بھی کام نہ آئی۔ غزوۂ بدر سے تو اس نے جان بچا لی لیکن موت اس کے لیے لکھی ہوئی تھی۔ چناں چہ تیسرے دن وہ چیچک سے مر گیا۔ جب بدبو پھیلنے لگی تو لوگوں نے اس کے بیٹوں کو شرم دلائی کہ تمھارا باپ مر گیا ہے، اس کی لاش سے بدبو آ رہی ہے۔ انھوں نے کچھ مزدوروں کی مدد سے اس کی لاش اٹھوا کر دور گڑھے میں پھنکوا دی اور پھر چوں کہ مٹی نہیں ڈال سکتے تھے، دور تھے، اس لیے پتھر مار کر اس گڑھے کو پر کیا گیا اور بہت ذلت آمیز موت اسے ملی۔ پتھر مارنا عرب کی لغت میں لعنت کی علامت تھی۔ گویا اسے سنگسار کر دیا گیا۔ اسی لیے زنا کی سزا بھی سنگسار کرنا ہے۔ اصحابِ فیل پر بھی پتھر پھینکے گئے تھے۔ اس لیے کہ یہ لعنت کی سزا ہے اور یہ سزا اس کو اس کے بیٹوں کے ہاتھوں ملی۔ اس طریقے سے نہ اس کا مال کام آیا، نہ اولاد کام آئی اور وہ خود بھی ذلت کی موت مارا گیا۔ اس کا زور بھی ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھی بھی سارے کے سارے ہلاک ہو گئے اور وہ خود بھی عبرت کا نشان بن گیا۔

قرآن پاک کی ساری پیش گوئیاں حرف بہ حرف لوگوں نے اپنی آنکھوں سے پوری

ہوتے دیکھیں۔ اگرچہ واقعاتی ترتیب کے لحاظ سے غزوۂ بدر پہلے ہوا ہے اور فتح مکہ بعد میں، لیکن فتح مکہ میں کوئی خون نہیں بہا اور نہ کوئی ہلاک ہوا۔ سب ہلاکتیں پہلے ہو چکی تھیں۔ لیکن ترتیب کے لحاظ سے پہلے فتح اور اس کے بعد ہلاکت ہوئی۔ اس لحاظ سے اسی ترتیب کے ساتھ سورۂ نصر کے بعد سورۂ لہب آئی:

سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ○ (اللّھب:۳)

''ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا۔''

لہب کے معنی شعلے کے ہیں اور ابولہب بڑا سرخ و سفید اور خوب صورت آدمی تھا اور اسی لیے اس کا یہ لقب پڑ گیا کہ یہ شعلہ رُو آدمی ہے۔ وہ مزاج کا بھی بڑا تیز تھا اور بڑا غصے والا تھا۔ غصہ بھی آگ سے تعبیر ہوتا ہے، جیسے غصے کی آگ۔ اپنے چہرے کے لحاظ سے اور اپنے سرخ و سفید رنگ کی وجہ سے بھی، وہ اسی لقب سے مشہور تھا۔ اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔ عزیٰ ایک دیوی کا نام تھا۔ گویا وہ عزیٰ کا بندہ تھا۔ یہ اس کا اصل نام تھا لیکن معروف نام ابولہب تھا۔

لوگوں نے سوال اٹھایا ہے کہ قرآن مجید نے ابولہب کا اصل نام کیوں نہیں لیا اور کنیت کو کیوں استعمال کیا ہے، جب کہ عرب میں رواج یہ ہے کہ کنیت عزت اور احترام کے لیے استعمال ہوتی ہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عبدالعزیٰ (دیوی کا بندہ) میں شرک پایا جاتا ہے۔ علما کی رائے میں قرآن مجید نے اس کو پسند نہیں کیا کہ ایک ایسا نام جس میں صاف اور واضح شرک موجود ہے، اس کو قرآن مجید میں اس طرح درج کیا جائے۔ دوسرے بات یہ ہے کہ ابولہب کا قافیہ ملتا ہے نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ سے۔ اس میں جو زور ہے اور منظر کشی ہوتی ہے وہ کسی دوسرے لفظ سے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بھی اس کی کنیت استعمال کی گئی ہے کہ یہ زبان و بیان اور بلاغت کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک جا کر اس کے آخرت کے انجام پر منتج ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا:

سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ○ وَّامْرَاَتُہٗ ط حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ○ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ○ (اللّھب:۴،۵)

''وہ شعلہ زن آخرت میں ضرور آگ میں ڈالا جائے گا۔ اور (اس کے ساتھ) اس کی جورُو بھی لگائی بجھائی کرنے والی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی۔''

یہاں ابولہب کی بیوی کا ذکر کیا گیا ہے وہ عرب کے انتہائی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی

تھی۔ قریش کے اہم اور فضیلت و برتری والے قبائل دو تھے۔ ایک بنو ہاشم تھا اور دوسرا بنو امیہ۔ بنو ہاشم سے حضورؐ کا تعلق تھا۔ وہ ہاشم کی اولاد میں سے تھے اور امیہ کی اولاد سے ابوسفیان اور ابوجہل تھے۔ ان کی رقابت اور آپس کی دشمنی پرانے وقتوں سے چلی آ رہی تھی۔ وہ بنو امیہ کے بڑے سردار حرب کی بیٹی تھی، جو ابوسفیان کا باپ تھا اور ادھر ابولہب عبدالمطلب کا بیٹا تھا۔ یہ دراصل دونوں خاندانوں کا جوڑ تھا کہ ایک طرف بنو امیہ کے خاندان کی بیٹی تھی اور دوسری طرف بنو ہاشم کے خاندان کے سردار کا بیٹا ابولہب تھا۔ اس کا نام ام جمیل تھا اور وہ اس ساری مخالفت میں اپنے شوہر کے ساتھ برابر کی شریک تھی اور سب معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔

جب حضورؐ کی بیٹیوں کو طلاق دلوائی گئی تو اس میں بھی وہ شریک تھی۔ آپؐ کی مخالفت کے اندر آپؐ کی مذمت کرنے میں، آپ کی ہجو کرنے میں، آپ کو گالیاں دینے میں، آپؐ کو برا بھلا کہنے میں، ان سب میں وہ بھی برابر کی شریک تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ کانٹے لا کر آپ کے گھر کے آگے ڈال دیتی تھی کہ جب آپ نماز کے لیے نکلیں، یا گھر سے باہر نکلیں تو پاؤں میں چبھیں اور آپؐ کو تکلیف ہو۔ اس کا گھر بالکل آپ کے پڑوس میں تھا۔ گویا وہ ہر قسم کی مخالفت پر کمر بستہ تھی۔ اس کے بارے میں بھی پیش گوئی ہوئی کہ یہ بھی آگ میں گرے گی۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ دنیا کے اندر بھی اسے سزا ملی اور اسی کی ایک رسی اس کے گلے میں پھندا بن کر پڑ گئی اور اس سے وہ مر گئی۔ لیکن قرآن مجید نے اس کے دنیاوی انجام کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی۔ صرف آخرت کے انجام کے بارے میں کہا ہے کہ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ آگ میں جائے گی۔ پھر دو باتیں کہیں:

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝ (اللھب: ۴، ۵)

”اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی لگائی بجھائی کرنے والی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی۔“

حطب وہ لکڑی ہے، جو ایندھن کے کام آتی ہے اور جس سے آگ جلائی جاتی ہے۔ حَمَّال کہتے ہیں، جو شخص سر پر بوجھ اٹھا کر اس کو کسی جگہ پہنچائے۔ اب بھی عرب میں بوجھ اٹھانے والے قلی کے لیے حمّال کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایندھن کا بوجھ اٹھانے والی اور اس کو ڈھونے والی کا یہاں کیا مطلب ہے؟ یہ بات دنیا کے بارے میں کہی جا رہی ہے یا آخرت کے بارے میں،

اس کو سمجھنے میں ہمارے مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ اس کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ دراصل دنیا میں وہ کانٹے ہیں، جو وہ پیٹھ پر لاد کر لاتی تھی اور حضور ﷺ کے گھر کے آگے بچھاتی تھی، اس کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ کنجوسی کے مارے اپنے گھر کی لکڑی بھی باہر سے کاٹ کر لاتی تھی۔ لیکن یہ بات زیادہ صحیح نہیں لگتی کیوں کہ قریش کے اعلیٰ خاندان کی عورتیں اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ جس طرح ہمارے ہاں اس بات کو عار سمجھا جاتا ہے کہ کوئی اونچے گھر کی عورت یا شریف زادی اپنے ہاتھ سے کام کرے۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہمارے ہاں بے عزتی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ قریش میں بھی یہی تصور پایا جاتا تھا۔ وہ اتنی آن بان والی تھیں کہ اپنے بچوں کو دودھ بھی خود نہیں پلاتی تھیں بلکہ مختلف عورتوں کو اس مقصد کے لیے حاصل کرتی تھیں اور ان کو پیسے دیتی تھیں۔ حضوؐر بھی اسی طریقے سے ایک قبیلے کے اندر دودھ پلانے کے لیے لے جائے گئے تھے۔ اس لیے کہ حضرت آمنہ بنو ہاشم کے سردار کے گھرانے کی بہو تھیں۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ مختلف قبیلوں سے عورتیں آتی تھیں اور بچوں کو لے جاتی تھیں اور دودھ پلا کر لے آتی تھیں۔

عرب کی عورتیں اپنے بچوں کو دودھ پلانا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں اور سارا وقت اپنی آرائش و زیبائش میں، زیورات، کپڑوں اور بننے سنورنے میں صرف کرتی تھیں۔ اسی طرح ہر جگہ ہوتا تھا۔ آج بھی دولت مند معاشرے میں جس طرح ہوتا ہے وہی حال اس کا بھی تھا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ ذرا مشکل تعبیر ہے تو عربی میں ایک محاورہ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ چغلیاں کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس کے ذریعے اس کی تعبیر کی گئی۔ کیوں کہ چغلی کھانے سے آپس کے تعلقات میں آگ لگتی ہے۔ اس لیے جو عورت چغلیاں کھاتی ہے وہ دراصل آگ جلانے کا ایندھن اپنی زبان کے ذریعے ادھر سے ادھر منتقل کرتی ہے۔

فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝ (اللھب:۵)
"اس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی۔"

یہ دوسرا منظر پیش کیا گیا ہے کہ اس کی گردن میں، جس طرح لونڈیوں اور غلاموں کے گلے میں یا جانوروں کے گلے میں موٹی اور مضبوط بُنی ہوئی رسّی ڈال دی جاتی ہے، اسی طرح اس کے گلے میں بھی رسّی پڑی ہوئی ہے۔ مَسَد کہتے ہیں مضبوط بُنی ہوئی رسّی کو۔ بعض لوگ کہتے ہیں

کہ یہ اونٹ کی کھال سے بنی جاتی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگور کی چھال سے بُنی جاتی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوہے کے تاروں سے بُنی جاتی تھی۔

قرآن مجید نے اس میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ گردن کے لیے عربی زبان میں بہت سارے الفاظ ہیں لیکن جید کا لفظ اس گردن کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ہار اور زیورات سے لدی ہوئی ہو۔ یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ اس کے گلے میں ہیروں کا ایک بڑا قیمتی ہار پڑا ہوتا تھا اور کہتی تھی کہ محمد کا راستہ روکنے کے لیے میں اس ہار کی پوری دولت خرچ کردوں گی اور ویسے بھی امیر زادی تھی اور اس کا شوہر بھی قریش کا دولت مند آدمی تھا۔ اُس لحاظ سے اس سے مراد زیورات سے لدی پھدی گردن ہے، جس میں قیمتی ہار یا نکلس پڑے تھے۔ اس کا انجام بالآخر یہ ہے کہ عذاب کی رسّی اس کے گلے کے اندر پڑی ہوئی ہے اور وہ لونڈیوں کی طرح گھومتی پھرتی ہے۔ اپنا ایندھن خود ڈھو کر لاتی ہے اور اپنے اعمال کے ایندھن میں خود ہی جل رہی ہے۔ یہ اس کی بیوی کا انجام تھا، جو قرآن مجید نے یہاں بیان کیا ہے۔

یہ سورۃ جو شروع سے آخر تک دراصل ابولہب کا بیان ہے، دعوتِ حق کے مخالفین کے بارے میں اس کا کوئی نہ کوئی حصہ صحیح آتا ہے، اور ان سب کو اس بات کی تنبیہ ہے، جب کہ حضورؐ اور مسلمانوں کے لیے اس میں بشارت اور خوش خبری ہے۔ یہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی اور اس کے اندر اس بات کی پیش گوئی ماضی کے صیغے میں کی گئی ہے کہ یہ ہو چکا، یعنی اس کا ہونا یقینی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ یہ برباد ہو جائے گا، ہلاک ہو جائے گا یا اس کا زور ٹوٹ جائے گا، جب کہ آخرت کے بارے میں کہا کہ یہ آگ میں گرے گا، یہاں مستقبل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں ف کا حرف استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ عنقریب اور جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب وہ آگ میں جا کر گرے گا۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے انجام کے حوالے سے مستقبل کا صیغہ استعمال نہیں کیا بلکہ یہ تو مسلمانوں کے لیے ایسی پیش گوئی اور بشارت ہے کہ گویا یہ سمجھو کہ یہ واقع ہو چکی ہے اور لوگوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ مخالفت کرنے میں مرد اور عورت دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مرد تو اس مخالفت میں شریک تھا ہی بلکہ آگے آگے تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی بھی برابر کی شریک تھی۔ گویا اپنے اعمال کے وبال سے کوئی نہیں بچ سکتا خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔

یہاں یہ جو فرمایا گیا کہ اس کا مال اور اس کی اولاد کچھ اس کے کام نہ آیا، یہ بھی ایک عبرت ناک منظر ہے۔ ابولہب کے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹے عتیبہ نے تو دشمنی میں آکر حضورؐ کی بیٹی کو طلاق دی تھی۔ اسی نے جا کر حضورؐ کی تضحیک بھی کی تھی، گالیاں بھی دیں تھیں اور بیٹی کو طلاق بھی دے کر آیا تھا۔ اس کے بارے میں روایات آتی ہیں کہ اس کو حضورؐ نے بد دعا دی تھی۔ وہ ایک قافلے میں جا رہا تھا کہ اس کو ایک شیر نے آکر پھاڑ کر ہلاک کر دیا۔ اس کے مقابلے میں ابولہب کا بڑا بیٹا عتبہ دل سے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس پر باپ کا زور تھا، ماں کا زور تھا، گھر، خاندان اور برادری کا دباؤ تھا کہ ایسا کرو۔ اس نے اس دباؤ میں آکر طلاق تو دے دی لیکن دل میں ہمیشہ شرمندہ رہا۔ وہ فتح مکہ کے موقعے پر آیا، حضورؐ سے معافی مانگی، اپنے کیے پر نادم ہوا اور اسلام قبول کرلیا۔

ابولہب کی ایک بیٹی بھی تھی، جس کا نام درہ تھا۔ وہ فتح مکہ سے قبل مدینہ چلی آئی اور اس نے آکر اسلام قبول کرلیا۔ اس کا ایک تیسرا بیٹا بھی تھا وہ بھی فتح مکہ کے موقعے پر ایمان لے آیا۔ اس طرح اس کے تینوں بچوں نے اسلام قبول کرلیا۔ گویا نہ اس کا مال اس کے کچھ کام آیا اور نہ اس کی اولاد ہی کام آئی بلکہ اولاد تو اس کے ساتھ جا کر مل گئی، جس کی مخالفت میں وہ سرگرم تھا اور تمام عمر دشمنی کرتا رہا۔

اس سورۃ میں ایک اور اشارہ بھی ہے، جو بڑا اہم ہے، جس کی وجہ سے اس سورۃ میں ابولہب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں رشتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ وہ پیغمبر کا باپ ہو، یا پیغمبر کا بیٹا یا پیغمبر کا چچا، اگر وہ شرک اور کفر کی راہ پر ہوں گے تو وہ اللہ کی عدالت سے سزا سے نہ بچ سکیں گے:

یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ۝ (الشعراء:۸۸)

''اس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔''

دنیا میں بھی ایسا ہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اللہ کے نبی تھے لیکن جب طوفان آیا اور وہ ڈوبنے لگے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ تو نے تو وعدہ کیا تھا کہ میرے سارے گھر والے بچ جائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ تمھارے گھر والوں میں سے نہیں ہے:

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود:۴۶)

''وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔''

میرا وعدہ ان کے لیے نہیں تھا وہ تو صرف صالحین کے لیے تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ہجرت کی اور گھر سے نکلے تو باپ سے کہا کہ میں آپ کے لیے استغفار کی دعا کروں گا اور انھوں نے استغفار بھی کیا۔ وہ بہت رحم دل تھے۔ قرآن نے ان کی اس حوالے سے بڑی تعریف کی ہے کہ وہ حلیم تھے، آہ وزاری کرنے والے تھے، بڑے نرم دل، بردبار اور شفقت کرنے والے انسان تھے۔ باپ کے ساتھ تعلق فطری تھا، اس لیے ان کے لیے دعا بھی کی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا کہ مجھ سے اس کے لیے دعا نہ کرو۔ اس لیے کہ اب یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ دشمن خدا تھا۔ چناں چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کرنا چھوڑ دی۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں تھیں۔ ان کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ وہ پیغمبر ہونے کے باوجود اپنی بیویوں کے کچھ کام نہ آسکے، جب انھوں نے اللہ کا انکار کیا۔ اسی طرح حضورؐ کے چچا کے بارے میں اس سورۃ میں واضح کر دیا گیا ہے۔

یہاں یہ اصول بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ سب سے بڑھ کر محبت اللہ سے ہونی چاہیے۔ اللہ کے راستے میں کوئی رشتہ حائل نہیں ہوسکتا۔ یہ بالکل وہی بات ہے، جو قرآن مجید نے سورۂ توبہ میں کہی ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ، اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۝ (التوبۃ:۲۴)

''اے نبیؐ، کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے عزیز و اقارب اور تمھارے وہ مال، جو تم کماتے ہو، اور تمھارے وہ کاروبار، جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمھارے وہ گھر، جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔''

توحید کا تقاضا یہ ہے کہ ہر رشتے اور تعلق پر اللہ کی محبت غالب ہو، باپ، بیٹا، بہن، بھائی، اہل قبیلہ، مال و دولت، ہر جسمانی، خونی، نسلی، لسانی، رنگ، زبان، نسل۔ ہر قسم کے تعلق پر اللہ کی محبت اور عقیدے کی محبت غالب ہونی چاہیے۔ توحید کے مختلف پہلوؤں میں سے یہ پہلو بہت اہم ہے۔ آگے سورۂ اخلاص آرہی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ سورۃ اس نکتے کو نہایت موقعے پر واضح کر رہی ہے۔

یہ سورۃ جو اپنے اندر فتح و نصرت کی بشارت لے کر آئی اور دشمنوں کی ہلاکت کی پیش گوئیاں لے کر آئی، جن میں سے ایک ایک پیش گوئی پوری ہوگئی اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے انھیں پورا ہوتے دیکھا اور ان کے دلوں کے اندر یقیناً دراڑ پڑ گئی ہوگی کہ اب سارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ یہ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ جو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرے گا، اللہ کے لیے مخلص ہو جائے گا، اللہ ہی کا بن جائے گا اور اسی کے لیے کھڑا ہو جائے گا تو اللہ کی نصرت بھی اس کے ساتھ ہوگی اور فتح بھی اس کا مقدر ہوگی، اور دشمنوں کے حصے میں تباہی، ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہ آئے گا۔

یہ صرف اسی زمانے کے لیے پیش گوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضورؐ نے تو دعوت کا حق ادا کر دیا، جیسا کہ سورۂ کافرون کے بیان میں یہ واضح کر دیا گیا ہے، جس نے حضورؐ کا انکار کر دیا تھا اب اس کے پاس کوئی عذر نہ تھا، جسے وہ پیش کر سکے۔ اس لیے آپؐ مکہ چھوڑ کر چلے گئے اور تلوار کے ذریعے آپؐ کے دشمن تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم جب دعوت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں تو وہ شرائط پوری نہیں کر پاتے اور مایوس ہونے لگتے ہیں کہ یہ فریضہ کیسے سرانجام پائے گا، دشمن تو غالب آتا جا رہا ہے۔ درحقیقت مایوسی کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ کا وعدہ اپنی جگہ موجود ہے کہ صرف میری بندگی کرو، کسی کو شریک نہ کرو، میرے لیے خالص ہو جاؤ اور سب سے بڑھ کر ہر چیز سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرو۔ جب ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے اور دعوت کا کام کریں گے، اور حق کو واضح کریں گے اور اس دعوت کو لوگوں تک پہنچائیں گے تو پھر فرمایا:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○ (آل عمران ۳: ۱۳۹)

”دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“

یہ بشارت ہر زمانے کے لیے ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی حصہ ہر وقت پورا ہو سکتا ہے۔ صرف ضرورت ان لوگوں کی ہے، جو آگے بڑھ کر اس فریضے کو انجام دے سکیں اور جو حقیقی معنوں میں مومن ہوں۔

اب قرآن مجید ختم ہونے کو ہے۔ آگے آخری سورتیں آرہی ہیں۔ اس موقعے پر اس سورۃ کا آنا اس بات کی تعلیم ہے کہ توحید اس حد تک ہونا چاہیے کہ آدمی اللہ کی خاطر سب کچھ چھوڑ دے، سب محبتوں پر اللہ کی محبت غالب ہو اور اللہ کے اس وعدے پر یقین رکھے کہ اہلِ ایمان ہی غالب آئیں گے۔ جس نے اس طرح سے اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ جوڑ لیا تو یقیناً اللہ بھی اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ دنیا میں اس کے دشمنوں کو تباہ و برباد کردے گا اور بالآخر حق کو غالب کرے گا۔

☆☆

سورۃ الاخلاص

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ﴿۳﴾ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔
کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

تشریح: یہ سورۃ قرآن مجید کے آخر میں آرہی ہے۔ اگر سورۂ فاتحہ قرآن مجید کا دیباچہ اور مقدمہ ہے اور سورۂ فلق اور سورۂ ناس اس کا تتمہ، جس میں صراطِ مستقیم پر چلنے میں، جو خطرات درپیش ہیں ان سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے، تو اس لحاظ سے سورۂ اخلاص قرآن مجید کی آخری سورۃ ہوئی۔

اس کا نام سورۂ اخلاص ہے اور اس کو سورۂ توحید بھی کہتے ہیں۔ اس کے بہت سے نام ہیں، جو بعض احادیث سے اور بعض عارفین، مفسرین اور محدثین نے نقل کیے ہیں اور اس کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے کہ وہ کیا ہے؟ اسی لیے اس کو سورۂ توحید اور سورۂ اخلاص بھی کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی ابتدا سے لے کر آخر تک ساری تعلیم اور دعوت کا خلاصہ اگر ہم چند لفظوں

میں بیان کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ قرآن مجید اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ہم صرف اللہ کی بندگی کریں، صرف اسی سے محبت کریں اور اس کے علاوہ نہ کسی کی بندگی کریں اور نہ اس سے بڑھ کر کسی سے محبت کریں۔ یہ قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ ہے، جو پورے قرآن مجید پر محیط ہے۔

یہ بندگی اور محبت اس طرح مطلوب ہیں کہ ان میں ذرّہ برابر بھی جھوٹ کی ملاوٹ نہ ہو اور دل و جان سے، عقل اور عمل سے، صرف اسی سے محبت اور اسی کی بندگی اختیار کی جائے۔ پرانے صحیفوں میں بھی دین کی تعلیمات کا خلاصہ اسی طرح بیان ہوا ہے، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے توراۃ میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں سوالوں کے جواب میں یہی کہا کہ دل و جان اور عقل، یہ صرف اللہ کے لیے ہوں۔ چناں چہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سب کچھ اس کی نذر کر دیں، دل بھی، جان بھی اور عقل بھی۔ سب کچھ اس کی غلامی میں دے دیا جائے۔ یہی اخلاص کے معنی ہیں۔

اخلاص کے معنی ہیں خالص کر دینے کے، یعنی کوئی چیز کسی اور کے لیے باقی نہ رہے۔ اخلاص کی ایک شرح یہ ہے کہ ہر چیز اللہ کی ہو جائے۔ اخلاص کے ایک دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے بڑھ کر کوئی عزیز نہ ہو۔ ایک طرف یہ دعویٰ ہو کہ سب کچھ اس کے لیے ہے لیکن اس کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک کر لیا جائے، کسی اور سے بھی کچھ مانگ لیں اور اس کو بھی شریک کر لیں، اس سے بھی تھوڑی سی محبت کر لیں، اس کو بھی رب مان لیں، یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے۔ گویا قرآن مجید کی دعوت یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی بندگی کر اور اس کے ساتھ محبت کرو۔ چوں کہ یہ سورہ اللہ کے بارے میں ہے اور اس میں اخلاص کی دعوت بھی ہے، اس لیے اس کا نام سورۂ اخلاص اور سورۂ توحید بھی پڑا۔

ایمان اس چیز کا نام نہیں، جسے آدمی آنکھ سے دیکھ لے، جس کو آنکھ سے دیکھ لیا جائے اس کے لیے کسی دعویٰ، دلیل اور ایمان کی ضرورت نہیں رہتی۔ کوئی ٹھوس حقیقت ہو، جیسے آسمان پر چمکتا سورج، یہ ایمان کا موضوع نہیں ہے، یہ تو آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ کہیں حسن نظر آتا ہے، تو آدمی کو محبت ہو جاتی ہے، یہ بھی ایمان کا موضوع نہیں۔ اس لیے کہ آنکھوں سے دیکھ کر پسند کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ گھر میں والدین کھلاتے پلاتے ہیں، انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس لیے محبت ہو جاتی ہے۔ لیکن جو فی الواقع کھلانے پلانے والا ہے، پرورش کرنے والا ہے،

جو اپنی ذات میں کمال اور جمال میں اپنی انتہا پر ہے، وہ حسن ازلی جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے، قرآن مجید اس ذات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ عقل سے پہچان کر وہ علم حاصل کر کے، جو انبیاء کرام لے کر آئے ہیں، جو کائنات میں جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے، اس کی بندگی اختیار کرو اور سب سے بڑھ کر اسی سے محبت کرو۔ اس کے لیے علم ضروری ہے۔ آنکھوں سے دیکھ کر ہی آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا چیز ہے۔ اگر آنکھوں ہی سے اوجھل ہو تو حقیقت کا پتا نہیں چلتا۔ لہٰذا آدمی جس کی بندگی کرے، جس سے محبت کرے، سب سے پہلے تو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ ذات ہے کون؟ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کون ہے اور اس کے بارے میں علم ہی نہ ہو تو کوئی اس سے محبت کیسے کر سکتا ہے؟ اس کی بندگی کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اپنا سب کچھ لے جا کر اس کے قدموں میں کیسے ڈھیر کر سکتا ہے؟

علم دراصل ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر یہ علم حاصل ہو جائے تو قرآن مجید کی رو سے ایمان پیدا ہو جائے گا اور عمل کے لیے یہ کافی ہے۔ قرآن مجید نے جہاں بھی ایمان کا ذکر کیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ عمل کو قرار دیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ عمل کا بیان الگ سے ضروری ہے بلکہ وہ تو اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ لہٰذا اس ذات کے بارے میں جہاں جاننا ضروری ہے وہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ اس سے محبت کیوں کی جائے۔

قرآن مجید کی ساری تعلیم تو یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل ہو۔ انسان کو یہ علم ہو کہ اُسے اللہ کی بندگی کیوں کرنی چاہیے؟ اس کی بندگی کا راستا کیا ہے؟ وہ ہم سے کس طرح کی محبت کا طالب ہے اور ہم سے محبت کے لیے کیا طلب کرتا ہے؟ اعمال صالحہ، جنت کی طلب، جہاد، نماز، مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک، ان سب کی اس نے بار بار تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ ہماری محبت کی نشانیاں ہیں۔ نماز اس لیے پڑھو کہ اپنے معبود کو یاد رکھو اور مخلوق کو مال بھی اللہ کی محبت میں دو۔

— اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ لا وَ السَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ج (البقرۃ:۱۷۷)

”اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرو۔“

پھر دین کے لیے جدوجہد بھی اس لیے ہو کہ اللہ سب سے بڑھ کر معبود ہے۔ یہ ساری

باتیں قرآن مجید میں کھول کھول کر بیان کردی گئی ہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہستی کون ہے اور کیوں سب سے بڑھ کر اس سے محبت ضروری ہے؟ اگر یہ علم ہو، اس کی سمجھ ہو اور اس پر ایمان ہو تو اللہ سے محبت بھی پیدا ہوگی اور اس کی بندگی کا سلیقہ بھی آئے گا۔

سورۂ اخلاص دراصل قرآن مجید کی توحید کی تعلیم کا خلاصہ ہے، جس طرح سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی ساری تعلیمات کا خلاصہ ہے، اسی طرح سورۂ اخلاص، جو سب سے آخر میں آئی ہے وہ قرآن کی تعلیمِ توحید کا خلاصہ ہے۔ چناں چہ حدیث میں آتا ہے کہ سورۂ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ ہمارے علمائے کرام نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کے تین اجزا ہیں۔ ایک، اللہ کے بارے میں ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کی محبت کا راستہ کیا ہے؟ کون اللہ کو محبوب ہے اور کون نامحبوب؟ تیسرا یہ کہ آخرت میں ان کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ قرآن نے خود کہا ہے:

اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‌ؕ (آل عمران: ۳۱)

”اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔“

نبی کریمؐ نے علم، اخلاق، سیاست، معیشت، غرض زندگی کے ہر شعبے سے متعلق رہ نمائی دی ہے۔ چناں چہ قرآن مجید کی ہر آیت اور ہر علم کو ان تین باتوں میں سمیٹا جاسکتا ہے کہ اللہ کون ہے؟ اس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟ اور اچھے اور برے اعمال کا کیا نتیجہ ہے؟ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، افراد کے حق میں بھی اور قوموں کے حق میں بھی۔ اس لحاظ سے ہمارے علما نے کہا ہے کہ اگر سورۂ اخلاص کو قرآن مجید کا ایک تہائی کہا گیا ہے تو، اس کا ایک تہائی حصہ توحید ہے۔ یہ اللہ کی محبت کا بھی سبق دیتی ہے۔ یہ بھی قرآن کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس لیے یہ بھی ایک تہائی ہے، اور تیسرا موضوع آخرت ہے۔ اللہ کو یہ سورۃ بھی بہت محبوب ہے اور اس کا پڑھنا بھی بہت محبوب ہے اور پڑھنے والوں نے بھی اس کو اس وجہ سے بڑی کثرت کے ساتھ پڑھا ہے کہ ان کو اللہ سے محبت ہے۔

سورۂ اخلاص کے مضمون پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ کس

طرح یہ اللہ تعالیٰ کا تعارف کراتی ہے، اس کی معرفت عطا کرتی ہے، اس کا شعور دیتی ہے اور کس طرح اخلاص پیدا کرتی ہے۔ محبت میں بھی اخلاص اور بندگی میں بھی اخلاص اور اطاعت میں بھی اخلاص۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (الاخلاص:۱)

''کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔''

عربی زبان کے لحاظ سے اس کا دو طرح سے ترجمہ ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ ہے، وہ اکیلا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اللہ اکیلا ہے۔ اس طرح دو ترجمے ہو سکتے ہیں اور دونوں کے اندر بہت زیادہ جوہری فرق نہیں ہے۔ البتہ سمجھنے کے لیے میں ان دونوں کو الگ الگ ہی سمجھتا ہوں۔ اس لیے الگ الگ ہی بیان کروں گا۔

فرمایا گیا کہ وہ اللہ ہے اور اکیلا ہے۔ دوسری دفعہ ھُوَ کے ساتھ اللہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تیسری دفعہ پھر اللہ کا لفظ دہرایا گیا ہے۔ دوسری آیت میں یہ بات جب قرآن کہتا ہے کہ وہ اللہ ہے تو یہ بات بھی ایسے ہی نہیں کہہ دی گئی، بلکہ اس کے اندر بھی اگر غور کیا جائے تو ایک اللہ کا تعارف موجود ہے، اس کی معرفت موجود ہے۔ جو لوگ مختلف خداؤں کو ماننے والے تھے وہ بھی اللہ کو مانتے تھے اور قرآن مجید نے اس کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے۔ کہیں فرمایا کہ ان مشرکین سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیے ہیں؟ تو کہیں گے اللہ نے۔ ان سے پوچھو کہ رزق کون دیتا ہے؟ تو یہ کہیں گے کہ اللہ دیتا ہے۔ بصیرت اور سماعت کس کے قبضے میں ہیں؟ تو کہیں گے اللہ کے۔ یہ سب سوالات قرآن مجید جگہ جگہ اٹھاتا ہے۔ کہیں وہ خود جواب دیتا ہے اور کہیں دوسروں پر چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ کو عیسائی بھی مانتے ہیں، یہودی بھی مانتے ہیں اور شاید دنیا کے سارے مذاہب کے اندر ایک ایسے خالق اور برتر خدا کا تصور موجود ہے کہ وہی اکیلا خالق ہے اور وہ سب سے بڑا خدا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں برہما پیدا کرنے والا، ایشور کا تصور موجود ہے۔ اہل قریش بت پرستی کے اندر مبتلا تھے لیکن ان کے ہاں بھی ایک اعلیٰ آسمانی خدا کا تصور پایا جاتا تھا۔

اللہ، اس کا اسم ذات یا ذاتی نام ہے۔ اس لیے جب اللہ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ہے جو پیدا کرتا ہے، پرورش کرتا ہے، پانی برساتا ہے، رزق دیتا ہے، دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے، حاجتیں بھی پوری کرتا ہے اور مدد کو بھی آتا ہے۔ یہ اللہ کا ایک تعارف ہے۔ پورا قرآن مجید ایسے بیانات سے بھرا ہوا ہے کہ اللہ وہ نہیں ہے، جو دوسرے ماننے والوں کے ذہن میں ہے بلکہ

اللہ تو وہ ہے، جس کا بیان قرآن مجید میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ آیت الکرسی میں آتا ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۵ (البقرۃ:۲۵۵)

''اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔''

آیت الکرسی کے اندر اللہ کی ساری صفات بیان ہوگئی ہیں اور اس کی معرفت بیان ہوئی ہے۔ جگہ جگہ اس کی صفات اللہ کہہ کر بیان کردی گئی ہیں:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَۚ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِۚ (الحشر:۲۲)

''وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا۔''

اس طرح ایک طرف اللہ کی صفات بیان کی گئی ہیں تو دوسری طرف ہستی باری تعالیٰ کے حق میں دلائل بھی دیے گئے ہیں۔ اللہ کے لفظ سے ہی ان لوگوں کو، جو ناقص طریقے سے اللہ کو مانتے ہیں، شرک کے ساتھ مانتے ہیں، ان کی اصلاح کے لیے بھی صحیح رویے کی طرف اشارہ ہوگیا ہے۔ خدا کی صفات اور اس کی معرفت پوری طرح حاصل ہوسکتی ہے اگر پورا قرآن مجید سامنے ہو۔ چوں کہ اس سورۃ میں اختصار پیش نظر ہے اور دریا کو کوزے میں بند کرنا مقصود ہے۔ اس لیے معرفت کا پورا سمندر صرف چار آیات اور ۱۵ کلمات کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھ میں دے دیا ہے تاکہ ہم صبح شام اسے پڑھیں، نمازوں میں پڑھیں اور کثرت سے پڑھیں۔

پھر فرمایا اَحَدٌ، وہ اکیلا ہے۔ احد گنتی کے اندر ایک کو بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ وہ گنتی کا ایک ہو۔ اس کے شمار کے لیے تو کوئی عدد ہی نہیں ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں کسی کی بھی صفت کے لیے استعمال نہیں ہوتا اور قرآن مجید نے اس کو اللہ تعالیٰ کی صفت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ بالکل سب سے الگ اور سب سے منفرد، یکتا اور اکیلا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ یہ سب سے پہلی چیز ہے، جو اللہ نے اپنی معرفت کے لیے بندوں کو عطا فرمائی ہے۔ وہ اکیلا ہے تو اس کے معانی ہوں گے کہ ہمیشہ سے وہی ہے۔ جب کوئی نہیں تھا تو وہ تھا۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُۚ (الحدید:۳)

''وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی اور مخفی بھی۔''

اگر وہ تھا اور کوئی اور ہستی بھی تھی، تو وہ اکیلا نہیں رہا۔ کوئی اور بھی ہمیشہ سے ہو اور اللہ تعالیٰ بھی ہمیشہ سے ہو، یہ ہو نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ سے ہے، جب کوئی چیز نہیں تھی تب بھی وہ ہمیشہ سے موجود تھا۔

یہ ایک الگ بات ہے کہ دنیا کے اندر بہت سے غلط عقائد پائے جاتے ہیں۔ اللہ کی صفات، دنیا، کائنات، روح وغیرہ کے متعلق ہندوؤں، عیسائیوں اور فلسفیوں میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک لفظ میں اللہ تعالیٰ نے سب غلط عقیدوں کی تردید بھی فرمادی اور اللہ کے بارے میں صحیح تصور، عقیدہ اور اس کی معرفت بھی عطا فرمادی کہ اس جیسا اور کوئی نہیں۔ وہ اکیلا ہے اور منفرد ہے۔ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے لیکن ایک اللہ لفظ کہنے سے بھی آدمی پہچان لے گا کہ وہ کون ہے؟ گویا جیسے کسی نے انگلی رکھ کر کہہ دیا ہو کہ یہ ہے اللہ!

اس کی مزید تشریح و توضیح میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ اکیلا ہے، تنہا ہے اور اس کو کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ انسان کا دنیوی وجود بھی اسی کا عطا کردہ ہے اور جو کچھ بھی کسی کو ملا ہے سب اس کی وجہ سے ملا ہے اور جو چیز قائم ہے اسی کی توجہ اور ارادے سے قائم ہے۔ زمین اور آسمانوں میں اور کائنات میں یہ سب چلتی پھرتی چیزیں جو نظر آتی ہیں، اس کے کلمے سے وجود میں آئی ہیں۔ اس کی نظر اور توجہ سے قائم ہیں، وہی ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔ جیسے ہی وہ ان کو چھوڑ دے گا زمین اور آسمان اور کائنات کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ایک اللہ کے تصور کے ساتھ ہی یہ تمام باتیں خود بخود ذہن میں آجاتی ہیں۔

دراصل تخلیق کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے۔ انسان کے لیے اس کا سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس نے تخلیق کا یہ عمل نہیں دیکھا ہے، صرف مخلوق کو دیکھا ہے اور نہ خالق کو دیکھا ہے اور نہ خالق کو تخلیق کرتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی وضاحت کی کوشش کی ہے لیکن وہ بھی اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لے ایک ناقص مثال دی جاسکتی ہے، جس سے آدمی اس تصور کے قریب قریب پہنچ سکتا ہے۔

اس کی مثال ایسے ہے، جیسے انسان اپنے ذہن میں کسی چیز کا تصور کرتا ہے۔ وہ ایک طرح سے اس کا خالق ہوتا ہے۔ آپ آنکھیں بند کر کے ایک پوری مسجد کو اپنے ذہن میں قائم کر لیں اور یہ کہیں کہ میں اس کا خالق ہوں، گو میں نے اپنے ذہن میں اسے بنانے کے لیے کوئی

میٹریل استعمال نہیں کیا، پوری تصویر کو ذہن میں لانے کے لیے صرف ایک میرا ارادہ ہی کافی ہوگیا۔ جب تک توجہ رہے گی وہ قائم رہے گی اور جیسے ہی آپ نے توجہ ہٹائی تو وہ تصویر ذہن سے اوجھل ہو جائے گی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اللہ تعالیٰ کی مثال کسی چیز سے دی جاسکتی ہے۔

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ (الشوریٰ:۱۱)

''کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں۔''

وہ تو ایسا خالق ہے کہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ یہ مثال صرف سمجھنے کے لیے ہے۔ یہ ایسے ہی جیسے کوئی مصوّر تصویر بناتا ہے۔ اس کے لیے اسے کاغذ، قلم اور رنگ چاہیے پھر وہ تصویر بنا پاتا ہے۔ اگرچہ تصویر تو آدمی ہی بناتا ہے لیکن وہ اس کی تخلیق نہیں ہوتی۔ آدمی شعر کہتا ہے لیکن وہ اس کی تخلیق نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے لیے زبان اور الفاظ چاہئیں۔ کاغذ، قلم اور ذہن چاہیے۔ تحریر لکھنا بھی تخلیق نہیں ہے۔ قریب ترین یہ ہے کہ آدمی جب اپنے ذہن میں خیال قائم کرتا ہے، وہ اس کی تخلیق ہے اس کا دماغ اس کا اپنا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس مثال سے بات کو مکمل طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ تخلیق کے عمل کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت تخلیق کا عمل صرف وہی کرسکتا ہے، جو ہمیشہ سے ہو۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ (الاخلاص:۲)

''اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔''

صمد کے معنی بنیادی طور پر اور لغوی لحاظ سے ایک ایسی ذات کے ہیں، جو سب سے بالا ہو، سب سے برتر ہو، ہر ایک کی پناہ گاہ ہو اور ہر ایک اپنی حاجات اور مشکل کشائی کے لیے اسی کی طرف جائے اور رجوع کرے۔ چناں چہ صمد کے بے شمار معنی صحابہ کرامؓ اور تابعین سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان سب کے اندر یہ پہلو مضمر ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے، جو سب کی مراد اور آقا ہو، سب کی حاجت روا اور مشکل کشا ہو، ہر ضرورت کو پورا کرتی ہو مگر خود کسی کی محتاج نہ ہو۔

اس مفہوم کے پیشِ نظر سب لوگوں نے یہی کہا کہ وہ سب سے بے نیاز اور سب اس کے نیاز مند ہیں۔ اس کی کسی کی ضرورت نہیں ہے، نہ نیکی کی ضرورت ہے، نہ بدی کی اور نہ انسانوں کی ہی ضرورت ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ اس حدیث میں بھی کیا گیا ہے، جس کے مطابق اگر سارے انسان نیک بن جائیں، جتنے نیک وہ بن سکتے ہیں، اس کی سلطنت میں کوئی

اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر سارے انسان بدکار، گناہ گار اور فاسق بن جائیں، جتنا بدتر آدمی ہوسکتا ہے، تو اس کی سلطنت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ گویا اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بالکل بے نیاز ہے۔

اس سے قبل میں نے تخلیق کے عمل کی ایک مثال پیش کی تھی۔ اس کے مطابق جو تصویر ذہن میں ہو وہ بڑی توجہ کی محتاج ہے۔ ذرا توجہ ہٹی، یا اونگھ آگئی تو تصویر ذہن سے اوجھل ہوگئی، تخلیق ختم ہوگئی۔ جس طرح آدمی غافل ہوجائے تو ذہن کی تصویر خود بخود مٹ جاتی ہے۔ لیکن اس نے جو کائنات بنائی ہے وہ مٹ نہیں سکتی کیوں کہ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ ذہن کی تصویر سراسر آدمی کی محتاج ہے اور جو چیز خود محتاج ہو وہ کسی کی حاجت روائی نہیں کرسکتی۔ کوئی چیز بھی اس لائق نہیں ہوسکتی کہ اللہ کے ساتھ اس کی ذات میں، اس کے کسی اختیار میں، صفات میں شریک ہوسکے۔ کوئی چیز جو مخلوق ہے وہ خالق کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتی۔ اس لیے جس کی بھی آدمی نے پوجا کی ہے، چاہے وہ پتھر کے دیوتا ہوں، فرشتے ہوں، جن ہوں یا گائے وغیرہ کوئی بھی انھیں خالق نہ کہتا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ مخلوق ہے۔ یہی کہتے ہیں کہ یہ ہمارا کام بنا سکتے ہیں، اس لیے ہم ان کو مانتے ہیں، ان کا احسان ہے، ان کا ہم پر حق ہے، اس لیے ہم ان کو خدا مانتے ہیں۔ البتہ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ان میں سے کوئی حاجت روا ہے۔

مخلوق اپنی ہر حاجت، ہر خوبی اور اپنے ہر اختیار کے لیے اسی کی محتاج ہے۔ جب کہ خدا اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے نہ کسی مادی سہارے کا اور نہ کسی احتیاج کا محتاج ہے۔ کسی کام کے ہونے کے لیے بس اس کا ارادہ اور حکم ہی کافی ہے۔ وہ جو ارادہ کرلے، وہ ہوجائے گا۔ وہ نہیں چاہے گا، تو نہیں ہوگا۔ اگر وہ چاہے تو ایک لمحے میں زمین و آسمان پھٹ پڑیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں اور یہ دنیا اور پوری کائنات فنا ہوجائے، اور اگر وہ نہ چاہے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو کچھ بھی اختیار رکھتی ہو۔ لہٰذا کوئی مخلوق اس قابل نہیں ہے کہ اسے اس کے ساتھ شریک کیا جائے۔

خدا تو وہ ہے، جس کو دنیا کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو دنیا والوں سے بے نیاز ہے، جس کو نیکوں کی بھی کوئی پروا نہیں ہے اور بروں کی بھی کوئی پروا نہیں، جسے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ خدا نہیں ہوسکتا، جس سے نہ انسان محبت کرسکتا ہو، نہ بندگی کرسکتا ہو، یا جس سے

تعلق قائم نہ کرسکتا ہو۔ ایسا خدا صرف فلسفے کا خدا ہے، جس نے پیدا کیا اور پھر پیدا کر کے بے نیاز ہو گیا۔ سائنس بھی خدا کو ان معنوں میں مانتی ہے کہ وہ فطرت (Nature) اور قانونِ فطرت (Law of nature) ہے۔ اس نے قانون بنا دیا، اب دنیا سے اسے کوئی مطلب نہیں رہا۔ سائنس اور فلسفے کا خدا وہ خدا نہیں ہے، جس کی خبر انبیاے کرام نے دی ہے۔

گویا صمد سے مراد وہ ذات ہے، جس کے سب محتاج ہیں اور وہ سب کا حاجت روا ہے۔ اس لیے صرف سبحان اللہ کہنے سے اللہ کی تعریف مکمل نہیں ہوتی، بلکہ الحمد للہ کہنے سے اللہ کی تعریف مکمل ہوتی ہے۔ وہ ہر نقص، سے پاک ہے۔ کمال اس کے لیے ہے، سب کچھ اس سے مل سکتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ مانگنے کی خواہش بھی وہی دیتا ہے، اور مانگنے کے الفاظ بھی وہی سکھاتا ہے اور مانگنے کی توفیق بھی وہی عطا فرماتا ہے۔ جب بخشتا ہے تو بغیر مانگے بھی دے دیتا ہے۔ لیکن جہاں قبول کرنے والا کوئی نہ ہو وہاں وہ نہیں دیتا۔ قبول کرنے والے کو جھولی پھیلانا پڑے گی، جو لینے کے لیے تیار نہ ہو، اس کے لیے نہیں ہے۔ اس کے لیے تو ہدایت بھی نہیں ہے۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بیٹا بن کر آیا اور اس کو اپنی مخلوق سے اتنی محبت تھی کہ اس نے قربانی دے دی اور صلیب پر چڑھ گیا تاکہ باقی سارے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے بے معنی اور لغو بات کوئی نہیں ہو سکتی۔ آخر اس کو کیا ضرورت ہے کہ بیٹا بن کر آئے اور پھر صلیب پر چڑھے اور انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے اور دوسروں کے لیے خود ساری نیکیاں کرے۔ وہ نیکیاں کرنے کے لیے نہیں ہے، نیکیاں کرنے کے لیے اس نے بندے کو پیدا کیا ہے۔ اس طرح سے اس باطل عقیدے کی بھی نفی ہو گئی۔

دوسری بات اس نے یہ کہی کہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ اللہ سب سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، سب اس کے محتاج ہیں۔ کسی کا محتاج ہونا، یہ مخلوق کی خاصیت ہے، جو کسی کا محتاج نہ ہو وہ مخلوق نہیں ہو سکتا۔ مخلوق تو لازماً اپنے خالق کی محتاج ہے۔ سب کچھ اسی سے ملے گا اور وہی دینے والا ہے۔ جب ہر چیز اس سے ملے گی تو لازماً مخلوق اس سے محبت بھی کرے گی۔ اسی کی پرستش کرے گی۔ وہی بات جو سورۂ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کی صورت میں کہی گئی تھی کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تجھ سے ہی محبت کرتے ہیں اور تیرے ہی محتاج ہیں، وہی بات یہاں پر ذرا سیدھے الفاظ میں اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہہ کر بیان

ہوئی ہے۔ یہ اللہ کی دوسری صفت ہے اور یہاں اس کی یہ معرفت اور پہچان عطا کی گئی ہے کہ وہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔

لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ (الاخلاص:۳)

''نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔ مفسرین نے یہاں یہ بیان کیا ہے کہ ہر مذہب کے اندر اولاد کا ایک سلسلہ ہے، یعنی دیو، دیویاں اور دیوتا وغیرہ اور ان کی شادیاں اور اولاد وغیرہ۔ قرآن مجید نے اس آیت کے اندر کہ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا کہہ کر ان سب نظریات کی تردید فرما دی۔ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن میرے خیال میں یہاں خاص طور پر عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بیٹا ہونے کا جو عقیدہ ہے اس کی تردید کے لیے یہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ عیسائی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سورۃ کے اندر ان کے پورے عقیدے کی نفی موجود ہے۔ اس لیے عیسائیوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی مسلمان عیسائی بنتا تھا تو اس سے وہ مطالبہ کرتے تھے کہ تم خدا کو پہلے لعنت کرو کہ جس کا ذکر سورۂ اخلاص میں ہے (نعوذ باللہ) جنھیں وہ عیسائی بناتے تھے ان کو اپنے عقیدے کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ، ان سے یہ مطالبہ بھی کرتے تھے۔

قرآن مجید نے عیسائیوں کے عقیدے کا کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، اور جہاں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے اس کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں:

وَ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ (الکہف:۴،۵)

''اور ان لوگوں کو ڈرادے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اس بات کا انھیں علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا۔ بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔''

سورۂ مریم میں ہے کہ ''کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سخت بے ہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا! رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ

وہ کسی کو بیٹا بنائے۔'' (مریم:۸۸-۹۲) میرے خیال میں اتنی سخت زبان اللہ نے کسی اور شرک کے لیے استعمال نہیں کی، جتنی سخت زبان اس نے عیسائیوں کے عقیدے کے لیے استعمال کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ شرک کی بدترین صورت ہے۔ ہندو، سکھ اور دیگر ادیان میں بھی شرک پایا جاتا ہے، خدا کے ساتھ دوسری ہستیوں کو شریک کیا جاتا ہے، لیکن سب جانتے ہیں کہ خالق ایک ہی ہے، دیوی، اوتار وغیرہ دراصل اس کے بعض اختیار رکھتے ہیں اور جن سے ہمارا کام بن جاتا ہے۔

یہاں ولد کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا معنی ہیں جنا ہوا۔ اس لیے ہمارے سارے ترجمہ کرنے والوں نے جننے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس طرح گائے کے پیٹ سے گائے کا بچہ پیدا ہوتا ہے اور انسان کے پیٹ سے انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح ولد کا لفظ ولادت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں بن کا لفظ تو ہے ہی بیٹے کے لیے۔ یہ ان معنوں میں ہے کہ میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ ان معنوں میں تو سب مذاہب میں بیٹے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے عقیدے میں لکھا ہوا ہے کہ The only begotten son کہ عیسیٰ خدا کا ایک ہی اکلوتا بیٹا ہے، جو خدا نے پیدا کیا ہے۔ یہ صرف عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

اس میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جو خالق کا بیٹا ہوگا وہ خود بھی خالق ہوگا، جیسے انسان کا بیٹا انسان ہوگا، گھوڑے کا بچہ گھوڑا ہوگا۔ اسی طرح خدا کا بیٹا خدا ہوگا اور اسی کے درجے کا خدا ہوگا، اس سے الگ نہیں ہوسکتا۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے، تاہم عیسائیوں میں علم بشریات (Anthropology) کی بڑی بڑی بحثیں ہیں کہ دونوں کی ایک ہی Substance ہے۔ دونوں کی ذات اور ماہیت ایک ہے۔ یہ عقیدہ نہ یہودی رکھتے ہیں نہ مسلمان۔ ہندو بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ یہ گائے اور بت وغیرہ خالق ہیں اور یہ خدا کی ذات کا حصہ ہیں اور خدا بھی اس کے اندر شریک ہوگیا ہے۔ وہ بھی یہ نہیں مانتے۔

قرآن مجید نے کہا کہ یہ عقیدہ اتنی بڑی بات منہ سے نکالنا ہے اور اتنی بڑی بات کسی اور نے منہ سے نہیں نکالی کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائے، زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں کہ یہ رحمٰن کے لیے کہتے ہیں کہ اس کا ایک بیٹا ہے، جو اس نے جنا ہے (only begotten son)۔ قرآن مجید نے دراصل اس لیے اس کی تردید کی ہے کہ قرآن مجید کے نزول

کے بعد ساری کش مکش قرآن کی توحید اور عیسائیوں کی تثلیث کے درمیان ہونے والی تھی اور اب تک ہو رہی ہے۔ دنیا کے اندر جو کش مکش ہوئی وہ عیسائیوں کے ساتھ ہوئی ہے۔ عیسائیوں کو ہی اسلام نے بے دخل کیا، اور سب علاقے خالی کرا لیے۔ پھر یورپ اور مغربی تہذیب جو عیسائیوں کی پیداوار ہے، اس نے آ کر مسلمانوں کو بے دخل کر دیا ہے اور یہ کش مکش بڑھتی جا رہی ہے۔

عیسائیت کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے تھے۔ انہی سے دعا مانگی جاتی ہے کہ حاجت روائی وہی کرتے ہیں۔ خدا سے دعا نہیں مانگی جاتی بلکہ عموماً حضرت عیسیٰؑ سے دعا مانگی جاتی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ دنیا میں تشریف لائے، خدا خود تشریف لایا اپنے بیٹے کی شکل میں، اور صلیب پر چڑھ گیا اور صلیب پر چڑھ کر اس نے ساری انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

یہاں سے بھی عیسائیوں کا دوسرا عقیدہ پیدا ہوا کہ شریعت اور قانون کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ سارے کے سارے گناہوں کا کفارہ ادا ہو گیا۔ لہٰذا شریعت کی کیا ضرورت ہے؟ چناں چہ سور کو حلال کیا گیا اور شراب کو جائز قرار دیا گیا۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہ سب چیزیں حرام تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک یہودی پیغمبر تھے۔ انھوں نے ساری شریعت کو بحال رکھا تھا۔ یہ ایک آیت موجود ہے کہ میں (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا ایک شوشہ اور نقطہ بھی بدلنے کے لیے نہیں آیا، میں تو اس کے احیا کے لیے آیا ہوں۔ لیکن عیسائیوں نے سب کچھ بدل ڈالا۔ یہ سب ایک شخص سینٹ پال کے ہاتھوں ہوا، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا اور عیسائیوں کا سخت دشمن تھا۔ اچانک اس کو ایک مکاشفہ ہوا، اس نے کہا کہ میں تو عیسائی ہوں اور عیسائیوں میں شامل ہو کر اس نے سارے عقائد بدل ڈالے۔ عیسائی خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک مشہور جرمن فلسفی لکھتا ہے کہ سینٹ پال نے دراصل عیسائیت کی بنیاد رکھی۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام والی عیسائیت نہیں ہے۔ اسی وقت سے چرچ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک چرچ یروشلم، بیت المقدس کا چرچ تھا۔ وہ ان ساری چیزوں کو نہیں مانتے تھے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تھے، صحیح بات جانتے تھے۔ دوسرا چرچ زار کے علاقے میں تھا۔ انھوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنانے کے نتیجے میں تباہیاں آئیں، سائنس سے

تصادم ہوا، اس کے ردِعمل کے طور پر لادینیت آئی، سیکولرزم آیا۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں اور یورپ کے بہت سے فلسفی بھی یہی کہتے ہیں کہ سیکولرزم کا تمام تر انحصار اسی عقیدے پر ہے۔ جب انھوں نے یہ تسلیم کرلیا کہ اللہ کا ایک بیٹا ہے، وہ دنیا میں آیا اور صلیب پر چڑھ گیا اور تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر گیا ہے، لہٰذا اب کسی شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہم اپنا نظام خود بنائیں گے اور قانون سازی کریں گے۔ انسان خود ہی خودمختار (sovereign) ہے، اس لیے ان کے ہاں، جو تقریب ہوئی ہے اسے supper کہتے ہیں، عشائیہ ربانی۔ عیسیٰ علیہ السلام کا خون اور انھی کا گوشت ہوتا ہے۔ دراصل مادّی چیزوں کو خدا کہنے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ مادیت خدا بنتی چلی گئی۔

اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ دنیا اس کے ہاتھوں میں کھیلتے کھیلتے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس نے اتنی تباہ کن چیزیں جمع کرلی ہیں کہ واقعی آسمان پھٹ پڑے گا، پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، زمین ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی۔ اگر آج سارے ایٹم بم چل جائیں تو یہی منظر ہوگا کہ آسمان پھٹتا ہوا نظر آئے گا، سارے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی۔ قرآن مجید نے کہا کہ وہ اتنا بڑا کلمہ بولتے ہیں کہ یہ کائنات تباہ و برباد ہوجائے۔ قریب ہے کہ ایسا ہوجائے اور اس کے لیے سامان تیار ہوگیا ہے۔

نبی کریمؐ نے جتنی احادیث بھی دجال کے حوالے سے آخری دور کے بارے میں بیان فرمائی ہیں، ان میں دو باتیں ہمیشہ کہی ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام آئیں گے اور صلیب کو توڑ دیں گے اور سور کو حرام کریں گے۔ میری فہم کی حد تک یہ دراصل ان دو باتوں کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے کا صلیب کا وہ عقیدہ ختم کردیں گے۔ ساری چیزیں اور شریعت کو بحال کریں گے۔ اس کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ سور کو حرام کردیں گے اور پھر سے قانونِ شریعت کی حکمرانی قائم کریں گے۔ اس لیے قرآن مجید نے بہت تفصیل کے ساتھ اس عقیدے کی گرفت کی ہے اور جو بڑی مختصر سورۃ ہے اس کے اندر بھی ایک آیت اس عقیدے کے لیے وقف کردی ہے، کہ نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ اس میں مشرک قبائل کی بھی تردید ہوگئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اصل ہدف عیسائیت کے عقائد ہیں۔ اسی لیے عیسائی تلوار کے زور پر مسلمان سے عیسائی بناتے وقت اس کو یہ کہتے تھے کہ تم لعنت کرو اس خدا پر، جس کا ذکر اس سورۃ میں ہے۔ (نعوذ باللہ)

وَ لَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۠ (الاخلاص:۴)

''اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔''

کفو کا لفظ ہمارے ہاں شادی بیاہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس سے ہم نکاح کریں وہ برابری کا جوڑ ہو، نسب میں، ذات میں، برادری میں، مال میں ہم پلہ ہو۔ یہاں کفو کے ذریعے فرمایا کہ کوئی اس کی برابری کا، جوڑ کا نہیں ہے۔ کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔ کسی کا اس کی ذات میں علاقہ نہیں ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

دراصل ان چار آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے پانچ باتیں بیان کی ہیں اور اپنی معرفت بیان فرمائی ہے۔ توحید کا پورا علم مکمل کرنے کے لیے پورے قرآن میں توحید بیان ہوئی ہے۔ یہاں دریا کو کوزے میں بند کر کے ہمارے حوالے کر دیا گیا ہے کہ اس کو یاد رکھو، اس کو بار بار پڑھو، سنتوں میں پڑھو، فرض نماز میں پڑھو، سوتے ہوئے پڑھو، اٹھ کے پڑھو، اٹھتے بیٹھتے پڑھو۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی معرفت موجود ہے۔ ایک تہائی قرآن مجید اس کے اندر موجود ہے۔ چار آیات میں سمیٹ کر بیان کر دیا گیا ہے۔ شرک کی کوئی قسم باقی نہیں رہ گئی، جس کی جڑ اس میں نہیں کاٹی گئی۔ اللہ کی کوئی صفت ایسی نہیں ہے، جو اس میں مختصراً بیان نہ کی گئی ہو، جن کی تفصیل سورۂ حشر میں، سورۂ فاتحہ میں آئی ہے۔ وہ سب اس میں بیان ہوگئی ہیں کہ وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور سب کا وہی خالق ہے۔ کوئی اور خالق نہیں ہے، نہ ہوسکتا ہے، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خالق کے درجے پر پہنچ سکتے ہیں، نہ کوئی اور ہستی۔ سب نعمتیں اس کی دی ہوئی ہیں۔ اس لیے وہ سب سے بڑھ کر محبوب ہونا چاہیے۔ اسی کی غلامی اختیار کرنی چاہیے اور وہ غلامی میں لینے کو تیار ہے۔ ایسا نہیں کہ اس کو ہمارے ساتھ دلچسپی نہیں ہے، اگرچہ وہ خود بے نیاز ہے، ہماری محبت، ہماری عبادت اور ہماری اطاعت کی اسے کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن وہ ہماری حاجت روائی کرتا ہے۔ ہم نے اس سے دعا مانگی تھی اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (ہمیں سیدھا راستہ دکھا)، اس نے ہم کو سیدھا راستہ دکھا دیا۔ یہ ہے وہ سیدھا راستہ۔

گویا یہاں خدا خود یہ فرما رہا ہے کہ یہ میں ہوں۔ اگر مجھ تک پہنچنا ہے تو مجھے ایسا مانو، مجھ پر ایمان رکھو، مجھ سے محبت رکھو، میری بندگی کرو اور اخلاص کے ساتھ کرو۔ کوئی میرا شریک نہیں ہے، جو کچھ تمھارے پاس ہے میرا ہے۔ میری بندگی میں کوئی جھوٹ کی آمیزش یا ملاوٹ

نہیں ہونی چاہیے۔ میں تمھاری ہر طرح کی حاجت روائی کے لیے موجود ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں، تمھارا ہاتھ پکڑوں گا، ہر چیز کھلاؤں گا، منہ میں نوالہ ڈالوں گا، پانی دوں گا اور جو چیز تمھیں چاہیے وہ دوں گا۔ اگر سیلاب آرہا ہو تو آدمی چٹان پر چڑھ جاتا ہے تاکہ اپنے آپ کو اس سے بچا سکے۔ خدا ہی وہ چٹان ہے، جو تمھیں خطرات سے بچا سکتی ہے، وہ تمھارا سردار ہے، تمھارا حاکم ہے، تمھاری خبر گیری کر رہا ہے۔ نہ کوئی اس کا بیٹا ہے، نہ کوئی اس کا باپ اور نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے، صفات میں بھی اور ذات میں بھی۔ یہ تو انسان ہیں، جنھوں نے اس کی صفات میں دوسروں کو شریک کر لیا ہے۔ وہ تو ان سب سے بے نیاز ہے۔ ذات میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے کہ اس کی ذات سے کوئی دوسری ذات پیدا ہوگئی ہو، یا وہ خود کسی ذات کا نتیجہ ہو۔ کوئی اس کے برابر اور ہمسر نہیں ہے۔

حضور نبی کریمؐ نے یہ سورۃ پڑھنے کی بہت تاکید فرمائی ہے اور اس کا بڑا اجر بیان فرمایا ہے۔ آپؐ رات کو سوتے ہوئے یہ تینوں سورتیں ہاتھوں پر پھونک کر پورے جسم پر ملتے تھے: سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس۔ فجر کی سنتوں میں بھی آپؐ یہ سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ پڑھنا آپؐ کا معمول تھا۔ مغرب کی سنتوں میں بھی یہ سورتیں پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ کے سامنے ایک صحابیؓ کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ کسی سفر پر گئے اور ہر رکعت کے اندر قرأت ختم کرتے تو سورۂ اخلاص پڑھتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ اس کا اس میں بیان ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تیری یہ محبت تجھے جنت میں داخل کر دے گی۔ ایک اور صحابیؓ کے پاس صحابہؓ آئے۔ انھوں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ صحابی ایک چھوٹی سی سورۃ کیوں بار بار پڑھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ یہ سورۃ مجھے بڑی محبوب ہے۔ اس میں میرے محبوب کی صفات بیان ہوئی ہیں، اس کی تصویر اس کے اندر ہے، جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے ان کو بھی بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرتا ہے، جو اس کے ساتھ محبت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا۔

قرآن مجید کی ایک تہائی تعلیم توحید کی تعلیم ہے۔ وہ پوری تعلیم اس سورۃ کے اندر جمع کر دی گئی ہے۔ یہ قرآن مجید کی آخری سورتیں ہیں۔ ان میں قرآن کی تعلیمات جامع طور پر بیان کی گئی ہیں اور چوں کہ عقیدۂ توحید بنیاد ہے، جس نے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑا، اس نے اللہ کو پا لیا:

وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○ (آل عمران:۱۰۱)

''جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہِ راست پالے گا۔''

چوں کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کی بندگی کرنا چاہیے، اس سے محبت کرنی چاہیے اور کیوں کرنی چاہیے، اور سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہیے، لہٰذا یہ جاننا چاہیے کہ وہ محبوب کیسا ہے؟ چار آیات کی اس مختصر سورۃ کے اندر اس کا بیان ہے کہ اللہ کون ہے، کیسا ہے اور اس سے محبت کیوں کی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ وہی واحد خدا ہے، خالق ہے، رب، پالنہار، مشکل کشا اور مدبر کائنات ہے۔ یہاں اللہ کی معرفت نہایت اختصار، جامعیت اور دل نشیں انداز میں اس طرح بیان کردی گئی ہے کہ انسان اسے حرزِ جان بنالے اور اس کے دل کی دوا بن جائے۔

اللہ ہمیں صحیح معنوں میں اپنا بندہ بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆

سورۃ الفلق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنۡ
شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۙ﴿۴﴾
وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔
کہو، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی، ہر اس چیز کے شر سے، جو اس نے پیدا کی ہے اور رات کی تاریکی کے شر سے، جب کہ وہ چھا جائے اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے اور حاسد کے شر سے، جب کہ وہ حسد کرے۔

تشریح: یہ آخری دو سورتیں، جو کہ معوّذتین (پناہ میں لانے والی سورتیں) کہلاتی ہیں۔ ان پر قرآن مجید کو ختم کیا گیا ہے۔ نبی کریمؐ کی ہدایت کے مطابق انہیں قرآن مجید کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔ یہ دراصل اس راستے پر چلنے کے لیے، جس پر چلانے کے لیے قرآن مجید آیا، جس کی دعا ہم نے سورۂ فاتحہ میں کی تھی: اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ○ (ہمیں سیدھے راستے پر چلا) اور اس راستے کے سارے نقوش قرآن مجید نے واضح فرما دیے، اس راستے پر چلنے میں جو خطرات، اندیشے اور نقصانات پہنچ سکتے ہیں اور ویسے بھی مجموعی طور پر زندگی میں ہمیں جن خطرات، اندیشوں، مصائب اور رنج والم سے سابقہ درپیش رہتا ہے، ان سب سے اللہ کی پناہ میں آنے اور

اللہ کی پناہ مانگنے کے لیے، یہ دو سورتیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کے آخر میں درج فرمائیں۔

اَعُوْذُ کے معنی ہیں ''میں پناہ مانگتا ہوں'' یا ''پناہ میں آتا ہوں۔'' پناہ مانگنے والا شخص ہر اس چیز سے پناہ مانگتا ہے، جس کو وہ اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے یا وہ خیال کرتا ہے کہ اس سے اسے ضرر یا نقصان پہنچے گا یا جس سے رنج و غم اور مصیبت اس کے حصے میں آئے گی۔ وہ اسی سے پناہ مانگتا ہے یا اس کی پناہ میں آتا ہے، جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہو کہ وہ اس کو بچا سکتا ہے اور اس کو پناہ دے سکتا ہے۔ دنیا کے اندر یہ عام مشاہدہ ہے کہ اگر باہر کوئی خطرہ ہوتا ہے تو ہم گھر کے اندر داخل ہو جاتے ہیں، دشمن حملہ کرتا ہے تو قلعے کے اندر پناہ لے لیتے ہیں، گولہ باری ہوتی ہے تو خندق میں چھپ جاتے ہیں اور اگر کوئی بیماری حملہ آور ہوتی ہے تو ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں۔ غرض جہاں بھی کسی ایسی مشکل یا مصیبت سے سابقہ پیش آ جائے، جس کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خود اس پر قابو نہیں پا سکتے تو پھر ہم اس کے لیے کوئی سہارا تلاش کرتے ہیں۔ یہ سہارا ظاہری مادّی سہارا بھی ہو سکتا ہے، جیسے قلعہ، ڈاکٹر اور اس کی دوا، اور یہ غیر مادّی سہارا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر محلے میں چور ڈاکو کا خطرہ ہو تو ہم دروازے بناتے ہیں، تالے ڈالتے ہیں اور چوکیدار رکھتے ہیں۔ یہ بھی دراصل ایک قسم کی اس خطرے سے پناہ کی طلب ہے اور خطرے سے پناہ میں آنا ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہے اور اس سے پناہ مانگتا ہے تو یہاں پر بھی سب سے پہلے اس بات کا اقرار کرتا ہے اور اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ وہ خود ان خطرات کے مقابلے میں کچھ نہیں کر سکتا اور صرف خدا ہی کی ذات ایسی ہے، جو اسے پناہ دے سکتی ہے۔

زندگی میں انسان کے ساتھ خطرات اور مصیبتیں لگی ہوئی ہیں بلکہ اگر ہم یوں کہیں کہ ساری زندگی آدمی جو کچھ بھی سوچتا اور کرتا ہے، اچھا یا برا، یا جو عمل بھی کرتا ہے وہ دراصل دو وجوہات سے کرتا ہے۔ ایک تو کسی ضرر، مصیبت اور نقصان سے بچنے کے لیے اور دوسرا کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے۔ اگر غور کیا جائے تو ہر عمل کا محرک ان میں سے کوئی ایک پہلو ہوتا ہے۔ اسی کو فلسفے کی زبان میں دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت (ضرر اور نقصان پہنچانے والی چیز کو دفع کرنا اور جس میں فائدہ اور نفع نظر آئے اسے حاصل کرنا) کہتے ہیں۔ یہی دو چیزیں ہیں، جن کے گرد انسان کی ساری زندگی کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ آدمی جو کام بھی کرتا ہے وہ یا تو کسی نقصان سے بچنے کے لیے ہوتا ہے یا کسی نفع کو حاصل کرنے کے لیے۔ دراصل نقصان سے بچنا خود بہت بڑا نفع

ہے۔ اگر بیماری ختم ہو جائے اور صحت مل جائے تو یہ فائدے اور نفع کی چیز ہے۔ اگر دشمن سر پہ کھڑا ہے اور اس سے جان بچ جائے تو یہ بھی فائدے اور نفع کی چیز ہے۔ اگر چور یا ڈاکو کا ڈر ہو اور اس سے پناہ مل جائے تو یہ بھی نفع اور فائدے کی بات ہے۔ لہٰذا پناہ مانگنے کے حوالے سے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ نقصان سے بچا جائے اور یہی سب سے اہم پہلو ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسی بات کے پیشِ نظر یہاں اُن چیزوں سے پناہ مانگنے اور اپنی پناہ میں آنے کی تعلیم دی ہے اور اس کا راستا بتایا ہے، جن سے ساری زندگی انسان کا واسطہ رہتا ہے۔ یہ دونوں سورتیں بڑی جامع دعائیں ہیں۔ خاص طور پر صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے بہت مفید ہیں، جس پر کہ بہت سے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو صراط مستقیم پر چلنے کے لیے پیدا کیا تو دشمن (ابلیس) نے کہا کہ میں اس راستے پر ڈاکہ مارنے کے لیے گھات لگا کر تاک میں بیٹھوں گا تا کہ انسان اس سے نکلنے نہ پائے۔ دائیں سے آؤں گا، بائیں سے آؤں گا، سامنے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، اوپر سے آؤں گا اور نیچے سے آؤں گا، غرض ہر طرف سے حملہ آور ہوں گا۔ ہر قسم کی قوتوں کو اس کے مقابل لے کر آؤں گا، پیدل بھی اور سوار بھی۔ پیدل اور سوار کا تصور تو اس زمانے میں جنگ کے ساتھ وابستہ تھا کہ جنگ کے اندر یا تو پیدل سپاہی، یعنی انفنٹری ہوتی تھی، یا سوار، یعنی کیولری ہوتی تھی۔ قرآن کے یہ الفاظ کہ شیطان نے کہا کہ میں پیادے بھی لے کر آؤں گا اور سوار بھی، اس کے معنی یہ تھے کہ دشمن پر حملہ آور ہونے کے لیے، اس کی گھات میں بیٹھنے اور اس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے، جو بھی میرے پاس ممکن ہتھیار ہوں گے، انھیں آزماؤں گا۔ یہ دراصل انسان کے لیے صراطِ مستقیم پر خطرات ہیں، اس کے دشمن ہیں، جو بٹھا دیے گئے ہیں اور یہی اس کی آزمایش ہے۔

آزمایش بلندی درجات کا باعث بھی ہے۔ اگر انسان کو کوئی خطرہ نہ ہوتا اور نہ کوئی اس کا دشمن ہی ہوتا اور اس کی کسی قسم کی کوئی آزمایش ہوتی تو پھر اس کے لیے اجر کا دروازہ بھی نہ کھلتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزمایش میں ڈالا ہے۔ اس راہ میں خطرات بھی پوشیدہ ہیں اور شیطان کی گمراہ کرنے کی کھلی کھلی دھمکی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت کہا تھا کہ جو میرے خالص بندے ہوں گے وہ ان سارے ہتھکنڈوں کے باوجود میری ہدایات پر چلیں گے اور تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا وعدہ فرمایا ہے کہ اگر بندہ اخلاص کے ساتھ اور اس کی

ہدایت، یعنی انبیا کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوگا تو شیطان اسے گمراہ نہ کر سکے گا، جب کہ دوسری چیز ہدایت ہے۔

لٰہذا پہلی چیز اخلاص ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ہی سورۂ اخلاص پہ قرآن مجید کا خاتمہ کیا گیا، جس میں اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے۔ گویا اخلاص ہی قرآن مجید کی پوری تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ یہاں سورۂ فلق میں سب سے پہلے انسان کی اپنی محتاجی کا اقرار ہے کہ اے اللہ میں خود اپنے آپ کو شیطان کے شر سے نہیں بچا سکتا۔ اگر اپنی محتاجی کا یہ اقرار اور احساس نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ تعلق قائم نہیں ہوسکتا، جس کی ضرورت ہے اور اس کی پناہ بھی نہیں مل سکتی۔ سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک صفت صمد کا ذکر کیا ہے اور صمد کے معنی ہیں، جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اس کے پوری طرح محتاج ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو بندے اور رب کے درمیان رشتہ ہی دراصل یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے آگے حقیر سمجھے اور ہر چیز میں ہر معاملے میں اپنے آپ کو محتاج جانے۔

دوسری چیز ہدایت ہے۔ یہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ انسان کو، جو مختصر سی زندگی ملی ہے، اس کو وہ کیسے گزارے، جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کا نفع حاصل کر سکے۔ یہ اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگرچہ تجارت، اچھی صحت، بال بچوں کی خبر گیری اور حصولِ علم اپنی جگہ اہم ہیں لیکن سب سے بڑھ کر نفع یہ ہے کہ وہ راستا معلوم ہو جائے، جس راستے پر چل کر زندگی کام میں لگ جائے اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جب ہم کہتے ہیں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہر چیز میں ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں تو فوراً ہی سب سے بڑھ کر، جو ضرورت تھی جس کے لیے قرآن مجید نازل ہوا وہ ہدایت ہے، اسے اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کی صورت میں اللہ کے حضور پیش کرتے ہیں۔ سورۂ فلق میں بھی اس بات کا اظہار ہے کہ انسان اللہ کا محتاج ہے۔ شیطان کے شر سے بچنا اور ہدایت کے راستے پر چلنا، اللہ کی مدد، حفاظت اور پناہ کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ اللہ کی کرم نوازی ہے کہ وہ ہماری ہر احتیاج پوری کرتا ہے۔ وہ چیزیں، جو بظاہر اسباب سے پوری ہوتی ہیں، جیسے دوا کھانے سے مرض دور ہو جاتا ہے یا کسی بڑے طاقت ور آدمی کی پناہ لینے سے کسی دشمن سے نجات مل جاتی ہے، یا پولیس گارڈ تعین کرنے سے دشمن سے تحفظ مل

جاتا ہے یا چوکیدار رکھنے سے چوری سے اطمینان ہو جاتا ہے لیکن قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ ان ظاہری اسباب کے پیچھے اصل میں اللہ کا ارادہ اور مشیت کارفرما ہے۔ اگر سارے جن وانس جمع ہو جائیں اور انسان کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے الاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے اور اگر سارے جن و انس جمع ہو جائیں اور کوئی نقصان پہچانا چاہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے الاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی اجازت ہو۔

اسی طرح جہاں بظاہر اسباب کارفرما نہیں ہوتے وہاں آدمی یہ کہتا ہے کہ اب خدا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب دوا کام نہیں کرتی اس وقت بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اب سوائے اللہ کے کوئی چارۂ کار نہیں۔ حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پہلے بھی خدا کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوا تو ایک ظاہری سبب ہے، جو اللہ نے پیدا کر دیا ہے۔ حالاں کہ اگر فائدہ ہوتا ہے تو اللہ ہی کی مرضی واذن سے ہوتا ہے۔ یہ جملہ خود اپنی جگہ کوئی صحیح جملہ نہیں ہے، جو ہم عموماً بولتے ہیں کہ ''اب اللہ کے علاوہ کوئی سہارا نہیں۔'' گویا پہلے اللہ کے علاوہ کوئی اور سہارا تھا۔ حالاں کہ کبھی بھی اللہ کے علاوہ کوئی اور سہارا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا پناہ کے لیے اپنی محتاجی کا احساس پہلی چیز ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ جس سے پناہ طلب کی جائے اس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ اس کی پناہ میں آنے سے تحفظ ملے گا۔ اگر یہ یقین نہ ہو تو آدمی استعانت طلب نہیں کرتا، پناہ نہیں مانگتا اور نہ ہدایت ہی پہ چلتا ہے۔ اگر کسی ڈاکٹر کے بارے میں آدمی کو یہ یقین نہ ہو کہ اس سے مجھے فائدہ ہوگا تو وہ اس کے پاس علاج کی غرض سے نہ جائے گا۔ وہ اس حکمراں کے پاس بھی نہ جائے گا، جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ یہ میری کوئی مدد نہیں کر سکے گا اور وہ کسی ایسے طاقت ور آدمی کے پاس بھی نہیں جائے گا، جس کے بارے میں اسے معلوم ہو کہ اس کی طاقت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

بعض معاملات ظاہری اسباب کے تحت ہوتے ہیں اور بعض پوشیدہ اسباب کے تحت۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ آدمی بالعموم انہی چیزوں کے لیے اللہ پر پورا بھروسا کرتا ہے، جن کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں اسباب سے بالاتر ہیں اور وہ اللہ کے دست قدرت میں ہیں۔ حالاں کہ یہ ایمان اور عقیدہ ہونا چاہیے کہ سارے اسباب خواہ ظاہری ہوں یا پوشیدہ اور

سارے وسائل اور ساری قوتیں اللہ کی مٹھی میں ہیں۔ اگر وہ نہ چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ ایمان اور یقین بھی اس دعا کے پیچھے ہے، جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے سورۂ فلق میں دی ہے کہ اس کو آدمی مانگے۔ اس کی کتنی تاکید آئی ہے اور حضوؐر نے اس کی کیا فضیلت بیان فرمائی ہے، اس کا تذکرہ آگے آیا ہے:

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ (الفلق:۱)

''کہو، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی۔''

قُلۡ کا خطاب بظاہر حضوؐر سے ہے کہ ''تم کہو'' لیکن اس کے مخاطب جیسا کہ قرآن مجید میں ہر جگہ آیا ہے کہ اگر کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، جس میں اس طرف اشارہ ہو کہ یہ حضوؐر کے لیے مخصوص ہے تو آپؐ کا ہر امتی اس کا مخاطب ہے۔ پھر فرمایا کہ ''میں پناہ میں آیا فلق کے رب کی۔'' فلق کے دو ترجمے اردو ترجموں میں ملیں گے۔ ایک یہ کہ ''میں صبح کے رب سے، وہ جو اندھیروں سے صبح کی روشنی نمودار کرتا ہے، اس کی پناہ میں آیا'' اور دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ ''ہر مخلوق کے رب کی پناہ میں آیا۔'' وجہ یہ ہے کہ فلق کے اصل معنی کسی چیز کو پھاڑنا اور اس میں سے کوئی چیز نکالنا ہے۔ یہ اس کے لغوی معنی ہیں کیوں کہ صبح رات کے اندھیروں کی پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ تاریکی کا پردہ چاک ہوتا ہے، اندھیرا چھٹنا شروع ہوتا ہے اور صبح کی سفیدی نمودار ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے صبح کے لیے بھی ''فالق'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ''پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔'' لیکن یہ لفظ اور چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰی (الانعام:۹۵) ''دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔'' یوں اگر غور کریں تو جو لوگ ساری کی ساری مخلوق کے رب کے معنوں میں اس کا مفہوم لیتے ہیں وہ اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی چیز کو پھاڑ کر نکلتی ہے۔ جتنی بھی نباتات اگتی ہیں وہ بیج کو پھاڑ کر نکلتی ہیں۔ پودا گٹھلی سے نکلتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہر چیز کی پیدائش اسی طریقے سے کسی نہ کسی چیز سے اس کا نکال کر یا پھاڑ کر کرتا ہے۔ چناں چہ لفظ فلق میں ساری مخلوق لازماً شامل ہو جائے گی۔

یہاں ''رب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ رب کے معنی پرورش کرنے کے ہیں اور پرورش سے اور بہت سے معنی اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ پرورش تو وہ کر سکتا ہے، جو بالاتر ہستی

ہو، جس کے پاس پرورش کرنے کے اختیار اور وسائل ہوں، جو ساری کائنات میں ہر چیز کی پرورش کرنے والا ہو، جو رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہو۔ اس کے معنی ہیں کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اس کے اختیار میں ہو۔ اس لیے رب کے معنی ہیں وہ بااختیار سردار، آقا اور مالک ہر چیز جس کی مٹھی میں ہو۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔ روٹی گیہوں کے دانوں سے بنتی ہے، اس کو آدمی کے منہ تک پہنچانے کے لیے کتنی ہی قوتیں ہیں، جو سرگرمِ عمل ہوتی ہیں۔ سمندر اپنا پانی دیتا ہے۔ سورج چمکتا ہے تو پانی کو بھاپ بنا کر اڑا لے جاتا ہے۔ ہوائیں اس کو اپنے کندھوں پر سوار کرتی ہیں اور جہاں پہنچانا ہوتا ہے وہاں پر اس کو پہنچاتی ہیں۔ پھر آب و ہوا ہے اور پہاڑ ہیں، جن کی وجہ سے بارش برستی ہے اور زمین اس کو اپنے سینے میں اور وادیوں میں محفوظ کر کے ندی، نالوں، چشموں اور دریاؤں کے ذریعے کھیتوں تک پہنچاتی ہے۔ اس کے علاوہ کھیتی کے حصول کے لیے زمین کی زرخیزی، موسم اور مختلف قوتوں کا عمل دخل ہے اور کائنات کی بے شمار قوتیں ہیں، جو اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔ تب جا کر کہیں ایک خوشۂ گندم تیار ہوتا ہے، جس کی مٹھی میں یہ سب قوتیں ہوں گی وہی گیہوں کا ایک دانہ پیدا کر سکتا ہے اور انسان کی بھوک مٹانے کے لیے اس کے منہ تک پہنچا سکتا ہے۔ اگر انسان کی ساری ضروریات اور تمام مخلوق کی ضروریات کو دیکھا جائے تو اس لحاظ سے اس ہستی کو ساری کائنات پر حاوی بھی ہونا چاہیے اور وہی حقیقی معنوں میں رب کہلانے کی مستحق ٹھیرتی ہے۔

''رب'' کے معنی لغت کے ماہرین نے یہ بھی کیے ہیں کہ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت تک لے جانا، یہاں تک کہ وہ اپنے کمال درجہ اور انتہا پر پہنچ جائے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ رب کو اپنی مخلوق کی ہر حالت سے واقف بھی ہونا چاہیے اور مخلوق کسی بھی حالت میں اس سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ آدمی کا محتاج ہونا اور رب کا حاجت روا ہونا، یہ معنی بھی رب کے لفظ کے اندر پائے جاتے ہیں۔ گویا مخلوق اپنی تربیت کے لیے، پرورش کے لیے، ضروریات و حاجات کی تکمیل کے لیے بھوک و پیاس کے لیے، صحت کے لیے، ہر قسم کی ہدایت، یعنی جسمانی، روحانی اور اخلاقی ہدایت کے لیے، غرض ہر چیز کے لیے اسی کی محتاج ہے۔ لہٰذا صرف اللہ ہی حاجت روائی کرنے والا اور ساری مخلوق کا رب ہے۔

یہاں فرمایا گیا ہے کہ کہو میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی۔ گویا میں اس رب کی پناہ

مانگتا ہوں، جو کسی بھی قسم کے اندھیروں کو دور کر کے اُجالا کرتا ہے، خواہ وہ رات کی تاریکی ہو، جس سے صبح نمودار ہوتی ہے۔ جب صبح ہوتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک دنیا جاگ اُٹھی ہو۔ سورج نکلتا ہے تو کاروبارِ زندگی شروع ہوتا ہے۔ سورج کی گرمی سے ہی کھیتی پھلتی پھولتی ہے اور بہت سارے کام ہیں جو صبح سے وابستہ ہیں۔ اگر صبح نہ ہو یا رات طویل ہو جائے، یا تاریک ہو جائے، یا رات نہ جائے تو انسان کی زندگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا یہ ہدایت کی گئی کہ تم صبح کے رب اور ہر مخلوق کے رب کی پناہ میں آؤ اور کہو کہ میں اس کی پناہ میں آتا ہوں۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ○ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ○ (الفلق: ۲، ۳)

"ہر اس چیز کے شر سے، جو اس نے پیدا کی ہے، اور رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے۔"

غور کیا جائے تو یہی ایک جملہ پچھلی آیت کے ساتھ مل کر بالکل کافی ہے خواہ اس کے بعد مزید کوئی بات نہ بھی کہی جاتی۔ کیوں کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز مخلوق ہے اور اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ یہ بات ہم سورۂ اخلاص میں جان چکے ہیں کہ وہی خالق اور یکتا ہے۔ اللہ احد وہی ایک خالق ہے۔ تخلیق میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ یہاں یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ تخلیق میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ یہاں یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ زمین و آسمان میں سے، جس چیز سے بھی انسان کو شر یا نقصان پہنچ سکتا ہے، اس کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ گویا یہ ایک جامع پناہ ہو گئی، جو آدمی کو حاصل ہو گئی۔ اس میں ایک طرف مادی چیزیں آ گئیں، جیسے بیماری، دشمن کا ڈر، نقصان وغیرہ اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی چیزیں اور جو بھی مصیبتیں اس تک پہنچ سکتی ہیں، ان سب سے بھی پناہ حاصل ہو گئی۔ پھر اس میں ان چیزوں سے بھی پناہ شامل ہے، جن سے انسان واقف ہے اور جن سے وہ واقف نہیں ہوتا یا جن کا اسے علم نہیں۔ انسان کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ آگے چل کر اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، کس چیز سے اس کا واسطہ پڑے گا اور کیا بھلائی یا برائی پیش آنے والی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ ایک کام اس کے لیے اچھا ہے لیکن آگے چل کر وہ برا ثابت ہوتا ہے اور جسے وہ بظاہر برا سمجھتا ہے وہ اچھا ثابت ہوتا ہے۔ چوں کہ انسان مستقبل کا علم نہیں رکھتا اور وہ نہیں

جاننا کہ آنے والے لمحے میں اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے، لہٰذا اسے ہر چیز کے شر سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

یہ دعا اتنی جامع ہے کہ ہر وہ چیز، جو اللہ نے پیدا کی اور اس کی ہر برائی سے خواہ وہ ہمارے علم میں ہو یا نہ ہو، وہ آج واقع ہو جائے یا کل، وہ مادی ہو یا روحانی و اخلاقی، وہ زندگی بسر کرتے ہوئے یا صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے کوئی مرحلہ ہو، سب کچھ اس میں آ جاتا ہے۔ اس طرح ہر چیز سے خدا کی پناہ میں انسان آ جاتا ہے۔ یہ اتنی جامع بات ہے کہ اگر اس کے علاوہ مزید کوئی آیت نہ بھی اترتی تو بھی یہ کافی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں چار چیزوں کی طرف خاص طور پر اشارہ فرمایا ہے۔ ان میں سے تین کا تذکرہ تو اسی سورہ (سورۂ فلق) میں ہو گیا ہے اور ایک پہلو جس کا تعلق خاص طور پر صراطِ مستقیم سے ہے، جس کا تعلق انسان کے نفس سے ہے اور جس کی وجہ سے وہ صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے خطرے میں مبتلا ہو سکتا ہے، اس کے لیے پوری اگلی سورۃ (سورۃ الناس) مخصوص فرمائی ہے۔

یہاں صرف تین صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے:

وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ (الفلق: ۳)

''اور رات کی تاریکی کے شر سے، جب کہ وہ چھا جائے۔''

اندھیرے میں پہلی چیز رات ہے اور رات کی برائی اور شر سے یہاں خاص طور پر پناہ مانگی گئی ہے۔ اگرچہ اندھیرے کا لفظ بڑا وسیع ہے اور ہمارے مفسرین نے اس میں ہر قسم کا اندھیرا اور ہر طرح کی تاریکی شامل کی ہے۔ اس سے مراد وہ تاریکی بھی ہے، جو رات کے وقت طاری ہوتی ہے اور وہ تاریکی بھی جو دنیا کے اندر گمراہی کی تاریکی ہے اور وہ تاریکی بھی جو گناہ کی تاریکی ہوتی ہے، جس سے دل پر سیاہ داغ لگ جاتا ہے۔ زندگی کے اندر بھی اندھیرا ہوتا ہے، یہاں اس سے وہ اندھیرا بھی مراد ہے۔ گویا ہر قسم کی تاریکی اس کے اندر شامل ہے۔

عام طور پر ہمارے مشاہدے میں، جو تاریکی آتی ہے وہ رات کی تاریکی ہے، جب کہ وہ چھا جائے، اس کے شر سے اس لیے پناہ مانگی گئی ہے کہ رات کے اندر بے شمار خطرات لاحق ہوتے ہیں اور بے شمار فتنے ہیں جو اس میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ چوری بھی رات کو ہوتی ہے، ڈاکے بھی رات کو پڑتے ہیں اور گناہ کے بے شمار کاروبار ہیں، جو رات کو ہی ہوتے ہیں۔ اندھیرا تو خود اپنی

جگہ برائی کی علامت ہے۔ اسی لیے برائی کے لیے، ظلمات کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور روشنی کے لیے ''نور'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اندھیرا ظلم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ظلمات کا لفظ اسی سے بنا ہے۔ ظلم خود ایک اندھیرا اور تاریکی ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے اندھیرے اور تاریکی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہاں رات کا ذکر خاص طور پر اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ رات کے اندر ہر قسم کے خطرات پوشیدہ ہوتے ہیں اور وہ تمام چیزیں، جو رات میں انسان کو پیش آ سکتی ہیں وہ سب یہاں مراد ہیں۔

رات کے بارے میں یہ عمومی تاثر ہے کہ رات کی تاریکی بہت سے خدشوں کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ رات کو دیر تک باہر نہ نکلو، اندھیرے میں نہ جاؤ کہیں کوئی جانور نہ کاٹ لے، کوئی سانپ نہ نکل آئے یا کوئی بچھو نہ ہو یا تاریکی کی وجہ سے کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے، کوئی راستے میں لوٹ نہ لے وغیرہ وغیرہ۔ اندھیرا ہوگا تو چور گھر میں گھس سکتا ہے لیکن دن کے اُجالے میں اس کے لیے گھر میں گھسنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ ساری چیزیں ہم جانتے پہچانتے ہیں۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ یہاں خاص طور پر رات کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ رات میں یہ سارے خطرات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ خطرات اخلاق و اقدار کے لیے بھی ہیں اور جسم و جان کے لیے بھی۔

اندھیرے کا لفظ وسیع لفظ ہے اور اس کے اندر وہ ساری چیزیں شامل ہیں، جو آدمی کے اوپر طاری ہو جائیں۔ اس سے مراد گم راہی کے اندھیرے بھی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے گم راہی کے اندھیروں کو دور کر کے اپنی وحی اور ہدایت کے نور سے انسان کو روشنی دکھائی ہے۔ اس لیے یہاں یہ دعا سکھائی گئی ہے اور گم راہی اور بھٹکنے کے اندھیرے سے پناہ مانگی گئی ہے۔ گناہوں کا اندھیرا بھی ہوتا ہے، جو دل پر چھا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے۔ یہ تاریکی کا وہ نشان ہے، جو اس کے دل کے اوپر چھا جاتا ہے۔ ان ساری چیزوں سے یہاں پناہ طلب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے خاص طور پر انسان کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ وہ رات کے شر سے پناہ مانگے کہ میں اللہ کی پناہ میں آیا۔

وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝ (الفلق: ۴)

''اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے۔''

اس سے مراد وہ مرد و خواتین ہیں جو کہ گرہوں، یعنی دھاگے پر یا کسی چیز پر گرہیں باندھ کر پھونکتے ہیں۔

یہاں پر نَفّٰثٰتِ کا لفظ آیا ہے۔ اس کا واحد نَفَّاثَہ ہے اور نفاثہ پھونکنے والی بھی ہو سکتا ہے، یعنی کوئی عورت، اور نفث بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ عربی کے قاعدے کے مطابق نفاثہ مرد کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ علامہ کا لفظ، یعنی بہت اچھا جاننے والا یا علم رکھنے والے کی طرح بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا جو بہت مہارت کے ساتھ پھونکنے والا ہو اور کثرت کے ساتھ پھونکنے والا ہو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ دراصل ان سورتوں کے شانِ نزول کے بارے میں، جو روایت ہے اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے اس کا ترجمہ عورتوں تک محدود کیا ہے۔ لیکن بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس میں وہ تمام گروہ اور جماعتیں شامل ہیں خواہ وہ شیطانوں کی ہوں یا انسانوں کی، جو یہ پھونکتی ہیں۔ اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں گرہیں باندھ کر پھونکنے کا لفظ کیوں استعمال ہوا ہے؟

جادو کے تصور سے ہم کچھ نہ کچھ آشنا ہیں لیکن انسان جیسے جیسے ماڈرن ہوتا جا رہا ہے اور یہ اعتراض اٹھاتا ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں اور اگر جادو ہے تو وہ کہاں ہے؟ اس لیے کہ ہم نے تو آنکھوں سے نہیں دیکھا حالاں کہ باندھ کر پھونکنے کے جس طریقے کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے پہلے بھی رائج تھا اور اب بھی رائج ہے تاہم جادو کے بارے میں بہت تفصیلی بحث کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

پہلی بات، جو قرآن نے جادو کے حوالے سے واضح کی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا ایک جسم ہے اور اس کے اندر کی دنیا ہے، جس میں اس کا نفس ہے اور نفس کے اوپر مختلف اثرات پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی پر خوف طاری ہو جائے تو اس کے نفس کے اوپر جو اثرات پڑتے ہیں اس کے نتیجے میں جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ ٹینشن اور ذہنی دباؤ ہو تو کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے۔ دل کی بیماریوں اور بلڈ پریشر کا سرچشمہ یہی ذہنی دباؤ ہے۔ معدے کی بیماریاں اور بہت سی دیگر بیماریاں بلڈ پریشر اور اعصابی کھنچاؤ سے ہی ہوتی ہیں۔ گویا نفس کا اثر جسم پر اور جسم کا اثر نفس پر ہوتا ہے۔ اگر جسم مطمئن ہو، پرسکون ہو تو اس سے دل، نفس اور جسم پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا دونوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کوئی دوسرا نفس بھی انسان پر اثر انداز ہو سکتا ہے اگر

کوئی گھور کر یا غصے سے دیکھتا ہے تو فوراً آدمی کے اوپر اثر پڑتا ہے، نفس کے اوپر بھی پڑتا ہے اور جسم پر بھی۔ نگاہ کا اثر بہت معروف ہے۔ محبت کی نگاہ کا اثر کچھ اور ہوتا ہے اور نفرت کی نگاہ کا اثر کچھ اور۔ غصے کی نگاہ کا اثر آدمی پر کچھ اور پڑتا ہے اور اگر کوئی آدمی ہمدردی کرنا چاہے اور وہ محبت بھری نظر سے دیکھے تو اس کا اثر کچھ اور ہوتا ہے۔ گویا یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ نگاہ کا اثر اور بہت سی چیزوں کا اثر ہوتا ہے۔

جادو کے بارے میں قرآن مجید کا کہنا ہے کہ وہ کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچا سکتا، جس کی اللہ نے پہلے سے اجازت نہ دی ہو ''اِلاَّ بِاِذْنِ اللّٰہِ'' یہ بات ہر چیز کے ساتھ ہے۔ کوئی چیز نفع نقصان نہیں پہنچا سکتی اور نہ جادو ہی نقصان پہنچا سکتا ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان کے تخیل پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ چناں چہ اگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جادوگروں کا واقعہ پیش آیا، جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ جادوگروں نے اپنی رسیاں پھینکیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسا لگا کہ گویا یہ سانپ بن گئی ہیں۔ حالاں کہ فی الواقعہ وہ سانپ نہیں بنی تھیں اور نہ حقیقت میں بدلی تھیں۔ البتہ ان کو ایسا لگا جس سے وہ خوف زدہ ہو گئے، ڈر گئے اور خوف ان پر طاری ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، تم اپنا عصا پھینک دو۔ جب انہوں نے اپنا عصا پھینکا تو وہ اژدہا بن گیا۔ یہ نہیں کہ اس کی کوئی شکل نظر آنے لگی بلکہ واقعی وہ اژدہا بن گیا۔ اس نے رسی کے سانپ نگلنے شروع کر دیے۔ جادوگر تو خوب واقف تھے کہ رسی کی ماہیت نہیں بدلی بلکہ ہم نے تو رسی کو سانپ بنا کر دکھایا ہے لیکن جب اژدھے نے انہیں نگلنا شروع کر دیا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ تو ایک حقیقت ہے اور یہ واقعی ایک اژدہا نمودار ہو گیا۔ گویا ان پر سحر طاری ہو گیا ہو چناں چہ انہوں نے فوراً کہا:

اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ رَبِّ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ ○ (الاعراف: ۱۲۱، ۱۲۲)

''کہنے لگے ہم نے مان لیا رب العالمین کو، اس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ مانتے ہیں۔''

ان سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ جادو اور حقیقت میں کیا فرق ہے۔ جب وہ حقیقت کو جان گئے کیوں کہ جادو کوئی حقیقی چیز نہیں ہوتی تو وہ اللہ پر فوراً ایمان لے آئے۔ جادو کی یہ حقیقت قرآن مجید نے بیان کی ہے۔ حضورؐ پر جادو کی بارے میں روایت ساری تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے اور کئی سندوں سے بیان کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ

یہ صحیح نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ مستند ذرائع سے بیان ہوا ہے اور اس کے صحیح ہونے میں مجھے کوئی حرج بھی محسوس نہیں ہوتا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ یہودیوں کی کچھ لڑکیوں نے آپؐ پر جادو کیا۔ انھوں نے رسیوں اور بالوں پر گرہیں دے کر، پھونک کر انہیں کنوئیں میں ڈال دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آپ ﷺ کوئی کام نہیں کرتے تھے لیکن خیال ہوتا تھا کہ آپ ﷺ نے یہ کام کرلیا ہے، اور اگر کوئی کام کرتے تھے تو سمجھتے تھے کہ نہیں کیا۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ تو انبیا کی شان کے خلاف ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ آپ ﷺ کوئی اسی بات بھی کہہ جاتے ہوں گے، جو وحی کے خلاف ہوتی ہوگی۔

یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ رسولؐ بھی تھے اور انسان بھی۔ آپ ﷺ بیمار بھی ہوتے تھے، آپؐ پر غشی بھی طاری ہوتی تھی اور آپ ﷺ نماز پڑھتے ہوئے بھولتے بھی تھے۔ بہت سی روایات ہیں کہ آپ ﷺ رکعتوں کی تعداد بھول گئے، سجدہ سہو کیا، کوئی اور غلطی ہوگئی تو پھر سجدہ سہو کیا۔ دراصل انسان کی حیثیت سے یہ چیزیں آپ کے اوپر اثر انداز ہوتی تھیں لیکن رسالت کی حیثیت میں نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے حفاظت کا جو وعدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ فریضۂ رسالت کی ادائی میں آپ ﷺ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپؐ کی حفاظت فرمائے گا۔ اگر جادو کا اثر آپ ﷺ پر پڑا بھی تو اللہ تعالیٰ نے اس جادو سے اور مرض اور نسیان کے اثر سے فریضۂ رسالت کی ادائی میں کوئی خلل نہیں پڑنے دیا۔ ہمارے سب علما نے اس چیز کو بیان کیا ہے اور میں بھی سمجھتا ہوں کہ خواہ مخواہ یہ اس کی تاویل ہے کہ حضورؐ پر یہ اثر ہوا ہوگا اور ماننا پڑے گا کہ آپؐ سے غلطی ہوئی ہوگی اور رسالت کے فریضے کی ادائی میں فرق پڑ جائے گا۔ لیکن ان سورتوں کا تعلق خاص طور پر اس واقعے سے نہیں ہے۔

بڑے بڑے مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں اور میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ سورۂ فاتحہ اور یہ آخری دو سورتیں مکہ کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔ اس لیے کہ ایمان کے راستے پر گامزن ہوتے ہی ان دونوں چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک طرف سورۂ فاتحہ ہے کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی تھی۔ نماز تو شروع ہی سے مسلمان پڑھتے تھے۔ اس میں ساری تعلیمات کا خلاصہ موجود تھا اور سورۂ فاتحہ ہی وہ جامع چیز تھی، جو مسلمان بار بار پڑھ کر اپنا ایمان تازہ کرتے تھے۔ دوسری طرف یہ دو سورتیں تھیں۔ مکہ کے اندر جو خطرات اور

آزمائشیں تھیں، دشمن سر کے اوپر تھا، جسمانی آزمائشیں بھی تھیں، وسوسے بھی تھے، پروپیگنڈے کے طوفان بھی اٹھ رہے تھے اور ہر قسم کی اذیتوں سے مسلمان دوچار تھے۔ اس لیے ان سے بچنے کے لیے مکی زندگی میں شروع ہی سے ان کی ضرورت تھی۔ چناں چہ ابن عباسؓ، مجاہد اور بڑے بڑے مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں۔ ان کا تعلق محض اس واقعے سے نہیں ہے۔ جب وہ واقعہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے علاج کے لیے آپ ﷺ کو ان سورتوں کے پڑھنے کی تعلیم دی۔ اس لیے یہاں پھونکنے والیوں سے مراد جادو کرنے والی وہ یہودی لڑکیاں ہوسکتی ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو پھونکنے کا لفظ ہماری زبان میں بھی اور بہت سارے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جیسے پتا نہیں وہ کان میں کیا پھونک گیا کہ دل پر یہ اثر ہوا؟ وسوسے ڈالنے اور جھوٹے پروپیگنڈے کے لیے کان میں پھونکنے کا لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی نے کوئی غلط بات کان میں ڈال دی، جس سے کسی خدشے یا اندیشے کے اندر آدمی مبتلا ہوگیا، اس کے لیے پھونکنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مفسرین نے بھی اس کو وسیع معنوں میں لیا ہے۔ پھونکنا ایک تو جادو کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن وہ چیزیں پھیلانا، جن کی کوئی بنیاد نہ ہو اور ان چیزوں کا کان میں ڈالنا، جن چیزوں سے خواہ مخواہ انسان وسوسے میں مبتلا ہوتا ہے، ان کے لیے بھی یہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی کے کان میں پھونکنا کہ فلاں آدمی آپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا۔ یہ ہے بات کان میں ڈال دینا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ دشمنی اور غصے کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے کہ میرے بارے میں یہ بات کیوں کہی گئی ہے۔ لوگ اس طرح کی باتیں کان میں ڈالتے رہتے ہیں جو باعث شر و فساد ہوتی ہیں۔ ان سب کے شر سے پناہ مانگنے کی ہدایت بھی اس آیت کے اندر کی گئی ہے:

وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۝ (الفلق:۵)

''اور حاسد کے شر سے، جب کہ وہ حسد کرے۔''

حسد کی تعریف یہ ہے کہ کسی دوسرے کے بارے میں دل میں جلن ہو کہ یہ چیز اس کو کیوں ملی۔ اگرچہ کسی حد تک یہ چیز ہو کہ اس کو یہ چیز کیوں ملی تو یہ حسد کی تعریف میں نہیں آتا لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ یہ اس سے چھن جائے تو پھر یہ حسد کی مکمل تعریف بن جاتی ہے۔ یہ

آرزو کہ کسی دوسرے کو کوئی نعمت، کوئی فضیلت، شکل وصورت، مال ودولت، عزت ورتبہ، ہدایت و مقام جو کچھ بھی ہو، یہ کیوں ملا اور پھر یہ خواہش ہو کہ یہ اس سے چھن جائے، یہ بھی حسد ہے۔

حسد اگر دل تک محدود رہے تو اس سے بظاہر نقصان نہیں پہنچتا لیکن بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دل میں بھی کسی کے خلاف حسد ہو تو اس کا اثر بھی پہنچتا ہے۔ یہ ایک بالکل دوسری دنیا ہے جہاں ٹیلی پیتھی بھی ہے، مسمریزم بھی ہے اور ہپناٹزم بھی چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ چیزیں وجود رکھتی ہیں۔ آدمی نگاہ ڈال کر دوسرے کو بے ہوش بھی کر سکتا ہے۔ وہ اس سے اپنا کوئی کام کروا سکتا ہے، اس کے دل میں خیال ڈال سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے، جو آج کی سائنس کے اندر بھی موجود ہے اور ماضی میں بھی اس کا وجود تھا۔ اس لیے یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے دل پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ ایک الگ پہلو ہے۔ البتہ زیادہ تر مفسرین نے یہ معنی اختیار کیے ہیں کہ جب بات دل سے نکل کر زبان یا عملی طور پر کسی اقدام کی طرف بڑھ جائے اور حسد یہاں پہنچ جائے تو یہ آدمی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

حضورؐ کی دعوت میں بھی اور صراطِ مستقیم میں بھی حسد سب سے بڑا فتنہ تھا، جو آپ ﷺ کو درپیش تھا۔ آپ ﷺ کے مخالفین میں سے اکثر کی مخالفت حسد کی وجہ سے تھی۔ ابوجہل تو صاف کہتا تھا کہ بنو ہاشم سے ہمارا ہر چیز میں مقابلہ تھا۔ انہوں نے عزت حاصل کی ہم نے بھی عزت حاصل کی، ان کے پاس دولت تھی ہم نے بھی دولت حاصل کی، ان کا مقام معاشرے میں بلند تھا ہمارا مقام بھی معاشرے میں بلند تھا۔ اب انھوں نے کہا ہے کہ ہمارے پاس نبی بھی ہے لیکن ہم مقابلے میں نبی کہاں سے لائیں۔ دراصل یہ حسد تھا کہ بنو ہاشم میں نبی کیوں آیا۔ یہودیوں کو بھی اسی بات کا حسد تھا کہ ان میں سے نبی کیوں نہ آیا۔ قرآن پاک نے بار بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو توقع تھی کہ جس نبی کی پیش گوئی تورات میں موجود تھی وہ ان کے ہاں ہی آئے گا، لیکن جب وہ نبی بنی اسمٰعیل میں آ گیا تو انہیں یہ حسد ہوتا تھا کہ یہ نبی بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسمٰعیل میں کیوں آ گیا؟ لہٰذا حسد صراطِ مستقیم میں بھی تھا اور ویسے بھی انسان کو حسد سے نقصان پہنچتا ہے اگر اس سے سابقہ پیش آئے۔ لہٰذا یہ تین چیزیں ہیں، جن کا یہاں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور ان سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے، یعنی شر، رات کی تاریکی اور حسد۔

اصل راستا جس کے لیے یہ تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی مادی مصیبتیں، شر،

مصائب، آلام، ان سب سے، ہر چیز سے آدمی اللہ کی پناہ مانگے۔ یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی چاہیے تو اللہ ہی سے مانگو۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا نقصان پہنچنے والا ہو یا برائی پہنچنے والی ہو، آدمی اللہ کی پناہ مانگے۔ اللہ اور بندے کا یہی تعلق ہے، جس کو قائم کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا اور حضورؐ تشریف لائے کہ بندہ سرتاسر اللہ کا محتاج بن جائے اور ہر چیز اس سے طلب کرے۔ ہدایت اور اخلاق، سیاست اور معیشت، بیماری سے شفا، کھانا اور غذا، غرض جو چیز بھی ہو، بڑی سے بڑی چیز ہو یا چھوٹی سے چھوٹی، اسی سے مانگے۔

دراصل اصل مسئلہ صراطِ مستقیم کا حصول اور اس پر استقامت کے ساتھ چلنا ہے، جس کے لیے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہی وہ راستا ہے، جس پر چل کر دنیا کی یہ زندگی کسی کام آسکتی ہے ورنہ ضائع ہو جائے گی۔ اگر زندگی کے دس بیس یا پچاس ساٹھ سال صراطِ مستقیم پر نہیں گزرتے تو یہ ضائع اور اکارت گئی بلکہ اس کے عوض ہمیشہ کی تکلیف اور عذاب کا سامنا ہوگا اور یہ سب سے بڑا خسارہ ہے۔ اسی لیے صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا قرآن پاک کے شروع میں آئی اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے دوران جو خطرات ہیں، ان کا ذکر یہاں پر آیا ہے۔ ابھی شیاطین کا ذکر نہیں آیا وہ اگلی سورۃ میں آئے گا لیکن مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں وہ سارے شیاطین شامل ہیں خواہ وہ جن ہوں یا انسان یا خود اپنا نفس، جو چھپا ہوا شیطان ہے، جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں۔

تاریکی اور اندھیرا جب چھا جائے، یہ بھی اپنی جگہ وہ گم راہی ہے، جو شیطان کی طرف سے آتی ہے۔ اسی طرح کان میں پھونکنے والی بات بھی وسوسوں کی ایک صورت ہے، اس کا بھی اس سورہ کے اندر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگلی سورۃ میں اس بات کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ یہ شیطان کے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار ہے۔ جب وہ دل میں کوئی بات ڈال دے، کان میں کوئی بات پھونک دے، یا کوئی خیال ڈال دے تو انسان گم راہی کا شکار ہو جاتا ہے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے۔ شیطان ہاتھ پکڑ کر کوئی کام نہیں کرواتا، وہ حرام کا لقمہ منہ میں نہیں ڈال سکتا اور نہ حرام کا پیسہ زبردستی جیب میں ڈال سکتا ہے۔ آدمی اپنے ہاتھ سے اگر حرام کمائے گا تو شیطانی فعل کا مرتکب ہوگا، اگر خود گناہ کرے گا تو گناہ سرزد ہوگا۔ شیطان تو بس دل میں خیال ڈال سکتا ہے اور یہی اس کا اختیار ہے۔ دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو کان میں پھونکنا اور دل میں وسوسہ ڈالنا یہ بہت بڑا اختیار ہے۔ اس لیے کہ آدمی اس کا شکار ہو کر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے یہاں شیطانی وسوسوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

نَفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ میں بھی شیاطین شامل ہیں اور حسد تو ہے ہی شیطان کا ہتھیار۔ حسد کی بنیاد ہی پر شیطان کی دشمنی شروع ہوئی کہ اے اللہ! مجھے تو تو نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر مجھ سے کہتا ہے کہ میں اس کو سجدہ کروں۔ یہیں سے اس کو حسد شروع ہوا۔ قرآن مجید نے شیطان کے اسی حسد کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دین کی راہ پر چلتے ہوئے بھی بہت سے خدشے اور خطرات ہیں، جن کا انسان کو سامنا ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حضورؐ کو جن مسائل اور خطرات سے سابقہ درپیش تھا، ان میں جھوٹا پروپیگنڈا بھی تھا اور کان میں پھونکنے کا مسئلہ بھی۔ ابولہب کے قصے میں اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ چلتا تھا اور جو شخص بھی مکہ میں آتا، یہ اس کے کان میں پھونکتا تھا کہ آج کل ہمارے ہاں یہ فتنہ کھڑا ہو گیا ہے کہ ایک نبی آیا ہے اور کہتا ہے کہ میں اللہ کی طرف سے بول رہا ہوں۔ تم اس سے بچ کر رہنا۔ ابولہب بھی یہ کام کرتا تھا اور دوسرے دشمنانِ رسول بھی یہ کام بڑھ چڑھ کر کرتے تھے۔ کانوں میں پھونکنے کا یہ شر بھی جاری تھا اور آپ ﷺ سے حسد بھی تھا۔ یہ تمام مسائل راہِ خدا پر چلنے کی وجہ سے پیش آئے۔ اس لیے ان کا سامنا کرنے کے لیے خدا کی پناہ کی ہدایت کی گئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ دو سورتیں (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) ایسی ہیں کہ ان کی مثل کسی اور الہامی کتاب میں نازل نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ تورات اور انجیل میں بھی نہیں۔

ایک بار حضرت عقبہ بن عامرؓ کے ساتھ آپ کسی سفر میں تھے۔ غالباً جہاد کے لیے کہیں جا رہے تھے۔ اس زمانے میں جیسا کہ قاعدہ تھا کہ جب سواریاں کم ہوتی تھیں تو کبھی ایک آدمی سوار ہوتا اور دوسرا پیدل چلتا تھا اور پھر دوسرا سوار ہوتا تو پہلا پیدل چلتا تھا۔ حضورؐ بھی اسی طریقے پر عمل کیا کرتے تھے۔ کبھی آپ ﷺ پیدل چلتے تھے اور کبھی وہ۔ اس خیال سے کہ حضورؐ کو پیدل نہ چلنا پڑے وہ اپنی باری نہیں لے رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کیوں اپنی باری پر نہیں بیٹھتے، جیسا کہ تم سے کہہ رہا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ اس ڈر سے کہ کہیں آپ ﷺ کی نافرمانی نہ ہو جائے اونٹ پر بیٹھ گیا اور آپؐ پیدل چلنے لگے اور تھوڑی دور جا کر میں نے آپؐ سے کہا کہ آپؐ بیٹھ جائیے۔ تب آپ ﷺ نے مجھے ان دو سورتوں کی تعلیم دی اور کہا کہ یہ ایسی سورتیں ہیں کہ ان کو تم ہر وقت پڑھا کرو، رات کو سوتے وقت بھی اور صبح بھی۔ یہ سورتیں جادو سے تمہاری حفاظت کریں گی، فتنوں سے، برائیوں سے، مرض سے، غرض کہ ہر چیز سے۔

اس بات کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے کہ حضورؐ کا یہ طریقہ تھا کہ رات کو سوتے وقت بعض روایات میں ہے کہ یہ دونوں سورتیں اور بعض روایات میں ہے کہ سورۂ اخلاص بھی پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر پھونکتے اور سر سے پاؤں تک جہاں جہاں ہاتھ پہنچتا ملا کرتے تھے اور مسح کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ بیمار پڑ گئے، بخار میں کمزور ہو گئے، خود نہیں کر سکتے تھے تو حضرت عائشہؓ اپنے ہاتھوں پر پھونک کر آپ ﷺ کے پورے جسم پر اس کا مسح کرتی تھیں۔ اس عمل کی اہمیت کے پیشِ نظر آپؐ خود بھی اس پر عمل پیرا تھے اور شیطانی وسوسوں اور خطراب سے بچنے کے لیے یہ قیمتی نسخہ ہمیں بھی عطا کیا ہے اور اس کی تعلیم دی ہے۔ امام ابن قیمؒ کے الفاظ ہیں کہ ''کوئی مسلمان اپنی کسی ضرورت میں ان دو سورتوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔''

سورۂ فلق ایک مختصر مگر جامع سورۃ ہے۔ قرآن پاک کا یہی اعجاز اور بلاغت ہے کہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس سورۃ میں ہر فتنے، ہر مصیبت اور ہر خرابی کا علاج مضمر ہے۔ اس میں بندے اور رب کا حقیقی تعلق واضح کیا گیا ہے کہ صرف وہی ہے، جو حاجتیں پوری کر سکتا ہے۔ کوئی نقصان اس کے اذن کے بغیر نہیں پہنچ سکتا اور نہ کوئی فائدہ اس کے اذن کے بغیر مل سکتا ہے۔ اس لیے پورے صبر سے اور استقامت سے اس کی راہ پر کھڑے رہنا چاہیے۔

اگر زندگی میں کبھی کوئی مشکل پیش آئے، فتنے نظر آئیں، مصیبتیں آ جائیں، الجھنیں اور پریشانیاں ہوں تو صبر کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ وہ حفاظت کرنے والا ہے۔ وہ ساتھ ہے۔ وہ رَبُّ الْفَلَق ہے۔ اگر زندگی میں اندھیرے ہوں گے تو وہ اچانک روشنی لا سکتا ہے، جس سے اندھیرے چھٹ جائیں گے اور صبح ہو جائے گی۔ بڑے بڑے فتنہ پرداز لوگ ہوں گے، جو محض اللہ کے نام لیوا ہونے کی بنا پر، اس کی راہ میں ڈٹ جانے کی بنا پر اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کی راہ میں طرح طرح سے مخالفتیں کریں گے، مصیبت کھڑی کریں گے، روڑے اٹکائیں گے لیکن اللہ کی پناہ میں آنے کی صورت میں وہ ان سب فتنوں کو زائل کر دے گا۔ اسی طرح اگر کچھ بڑے بڑے حاسد ہوں گے، اور دشمن ہوں گے جو نقصان پہنچانا چاہیں گے، اللہ ان سے حفاظت فرمائے گا اور اپنی پناہ میں لے لے گا۔

معوّذتین (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی امت کی حفاظت کے لیے اور اس کو راہِ خدا میں آنے والے خطرات سے بچانے کے لیے یہ بیش قیمت اور نادر نسخہ عطا فرمایا ہے۔ تاکہ اہل ایمان راہِ خدا میں استقامت دکھا سکیں اور خدا کے ہاں بالآخر سرخ رو اور کامیاب ٹھہریں۔ یقیناً یہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ اس کا اہتمام سنت بھی ہے اور شیطان اور اس کے حربوں سے بچاؤ کا ایک ہتھیار بھی۔

☆☆

سورۃ الناس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾
مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ
صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾ ع ۶ / ۳۹

اللہ کے نام سے، جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔
کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود کی، اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے، جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

تشریح: سورۂ ناس قرآن مجید کی آخری سورۃ ہے اور سورۂ فلق سے، جو سلسلۂ کلام چل رہا ہے اسی کا حصہ ہے۔ یہ سورۃ قرآن مجید کے آخر میں درج کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتمامِ نعمت کا، جو وعدہ کیا تھا، وہ قرآن مجید کی صورت میں پورا ہوا۔ بندے نے، جو دعا کی تھی کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ مجھے سیدھا راستا دکھادے اور مجھے سیدھے راستے پر چلادے، وہ صراطِ مستقیم کی دولت اسے عطا کردی گئی، ایمان کی راہ اس کے لیے کھول دی گئی۔ جب اتنی بڑی نعمت سے نواز دیا گیا اور اللہ نے اتنی بڑی دولت عطا کردی اور اتمام نعمت ہوگیا تو اب آخری ضرورت، جو رہ جاتی ہے، وہ اس کی حفاظت ہے۔ کہیں کوئی چور، کوئی ڈاکو، کوئی دشمن، اس کو اچک کر نہ لے جائے، یا یہ نعمت چھن نہ جائے اور جو راستا اس نے کھول دیا ہے اور جس پر اس نے چلادیا ہے کہیں اس سے آدمی

پھسل کر یا منحرف ہو کر ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ اس حفاظت کے مقصد کے پیشِ نظر یہ آخری دو سورتیں نازل کی گئی ہیں اور ان کا سلسلۂ کلام بھی ایک ہی ہے۔

یہ دونوں سورتیں پناہ دینے والی یا حفاظت کرنے والی ہیں۔ اگر چہ ایک ہی سلسلہ ہے، ایک ہی کلام ہے، ایک ہی بات ہے اور ایک لحاظ سے دونوں کو ایک ہی کہا جاسکتا ہے، لیکن پہلی سورۃ میں ان خطرات، مصیبتوں اور آفات سے پناہ مانگی گئی ہے جو کہ جسم و جان کو لاحق ہو سکتی ہیں، جو ظاہری خطرات ہیں۔ جب کہ دوسری سورۃ میں خاص طور پر شیطانی وسوسوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

اللہ کی بندگی کے حوالے سے ہر مسلمان پر دو طرح کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ایک خود اللہ کی راہ پر چلنا اور دوسرے لوگوں کو راہِ ہدایت کی طرف بلانا۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ خود بھی خدا کی ہدایت پر چلے اور جتنی اس کی استطاعت ہو، جتنے لوگوں سے اس کا تعلق ہو، ان کو بھی نیکی کی طرف بلائے اور بھلائی کی تعلیم دے اور برائی سے روکے اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دے۔ چناں چہ خود چلنے کے لیے اور دوسروں کو چلانے کے لیے جو خطرات باہر سے پیش آسکتے ہیں، ان خطرات کا ذکر سورۂ فلق میں کیا گیا ہے اور جو خطرات انسان کو اندر سے پیش آسکتے ہیں، ان کا تذکرہ سورۂ ناس میں کر دیا گیا ہے۔ سورۂ فلق میں مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے جملے میں ہر قسم کی آفت، مصیبت اور خطرات کو جو بھی اللہ نے پیدا کیے ہیں، سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس میں آدمی کا اپنا نفس بھی شامل ہے، شیطان بھی شامل ہے اور باہر کے خطرات بھی شامل ہیں۔ چوں کہ سب مخلوق ہیں اور اس کے علاوہ کوئی خالق نہیں، اس لیے مخلوق کے دائرے میں تمام پہلو آجاتے ہیں۔ کوئی بلا آسمان سے نازل ہو یا زمین سے نکلے یا انسانوں کی طرف سے آئے، زلزلوں یا آتش فشاں کی صورت میں آئے، سب ایک جملے مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ میں سمٹ جاتے ہیں۔ یہاں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ آدمی دعا کرے کہ اے اللہ جو برائی مجھے پہنچتی ہو اس سے مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ اس کے بعد تین چیزوں کو تفصیل سے اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے اور ایک چوتھی چیز کو اس سورۃ میں مخصوص کر دیا گیا ہے۔

یہ سورتیں جن میں پناہ کی تعلیم دی گئی ہے، ان کے ایک ظاہری اور محدود معنی ہیں اور دوسرے وسیع معنی بھی ہیں۔ ظاہری اور محدود معنی تو یہ ہیں کہ جب تاریکی چھا جائے اور اندھیرا

ہو جائے تو تاریکی کے اندر پائے جانے والے خدشے، چور، ڈاکو کا خطرہ، کسی جانور کے کاٹ کھانے یا نقصان پہنچانے کا خدشہ اور اسی طرح غلط خیالات، نفسانی خواہشیں وغیرہ، ان سب سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جو گرہوں میں پھونکیں اور گانٹھیں باندھ کر جادو کریں، اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔ پھر حسد کرنے والے جب اپنے حسد کی بنا پر کوئی کارروائی کریں، اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اگر ہم اس کے وسیع معنی لیں تو اس کے اندر اور بہت سے پہلو آجاتے ہیں۔ تاریکی کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک رات کی سیاہی ہے اور دوسری ذہن کی تاریکی، غفلت کی تاریکی اور جہالت کی تاریکی ہوتی ہے۔ اسی طرح پھونکنے کا عمل بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ کوئی کان میں پھونک جاتا ہے، کوئی باہر سے وسوسے ڈالتا ہے، یہ ساری چیزیں اس میں آتی ہیں۔ پھر حسد کرنے والے کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے اور سب سے بڑا حسد کرنے والا تو شیطان ہے۔

سورۂ فلق کی آخری آیت بڑی جامع ہے۔ وہ اجمال اور عنوان ہے کہ شیطان نے حسد کے مارے آدم سے دشمنی اختیار کی اور حسد کے مارے اسے سیدھے راستے سے ہٹانے کے درپے ہوا۔ اس میں ہر قسم کا حسد شامل ہے۔ خاص طور پر شیطان کا حسد۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ کے وسیع معنی ہیں اور اس میں شیطان کے حسد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ پہلی سورۃ (سورۂ فاتحہ) کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی تین صفتیں رب، رحمٰن اور رحیم بیان کی ہیں۔ جب کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ پوری کائنات پر حاوی ہے۔ کیوں کہ فلق میں ہر قسم کی مخلوق آجاتی ہے۔ کوئی چیز فلق سے خالی نہیں ہے۔ وہی نمودار کرتا ہے، زندگی بخشتا ہے، وجود میں لاتا ہے، یہ سب اس میں شامل ہے۔ گویا اس کا بہت وسیع مفہوم ہے۔

سورۂ ناس میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات بیان کی گئی ہیں اور تینوں کا تعلق بعد میں انسانوں کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ ساری مخلوق کے ساتھ تعلق نہیں جوڑا گیا بلکہ انسانوں کا رب، انسانوں کا بادشاہ اور انسانوں کا معبود کہا گیا ہے۔ ان تین صفات کے سہارے اور واسطے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل زندگی میں، جو سب سے قیمتی چیز ہے وہ ایمان کی دولت ہے۔ یہ وہ نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ صراطِ مستقیم وہ راہ ہے، جو اس نے کھولی ہے اور باقی سارے اعمال اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت اور وقعت نہیں

رکھتے۔ اگر آدمی اس راستے سے ہٹ جائے یا راستہ کھودے اور اس سے بھٹک جائے تو یہ نا قابل تلافی نقصان ہے۔ اس نقصان کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے ایک سورۃ کو انسان کے دشمن کے لیے مخصوص کیا ہے، جو اسے اس راستے سے ہٹانے والا ہے۔ پھر اس بات کی وضاحت کی کہ اس کے کیا طریقے ہیں، وہ کس طرح حملے کرتا ہے اور اللہ نے اسے کیا اختیار دیا ہے، سب کو مختصراً یہاں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے اور تینوں کا تعلق انسانوں سے ہے۔ انسان کہتا ہے کہ میرا رب، میرا بادشاہ اور میرا معبود! ہر انسان ''ناس'' میں شامل ہے۔ گویا اس میں ذاتی قرب کا تعلق بھی قائم ہو گیا۔ پہلے اگر ذرا فاصلے سے بات ہو رہی تھی تو اب یہاں رب کا تعلق انسان سے جوڑ دیا گیا ہے۔ وہ میرا رب ہے، میرا بادشاہ ہے، میرا مالک، میرا معبود ہے کہہ کر آدمی اس کی پناہ میں آ جاتا ہے۔ اس طرح اللہ کا قرب بھی حاصل ہو جاتا ہے اور آدمی اس کی رحمت کا مستحق بھی ٹھہرتا ہے۔

ان تینوں صفات کا اگلے مضمون سے تعلق سمجھنے میں اس طرح آسانی ہوگی کہ پہلی آیت کا دوسرا حصہ لیں۔ اس میں دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز سے پناہ مانگنے اور پناہ میں آنے کی تعلیم دی ہے اور پھر جن صفات کا ذکر کیا ہے ان کا اس سے کیا تعلق ہے۔ یہاں فرمایا کہ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے میں پناہ مانگتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس آزمائش میں ڈالا ہے کہ صراطِ مستقیم پر اپنے ارادے سے چلے اور اپنے ارادے سے برائی سے بچے۔ ارادہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو باہر پایا جاتا ہو۔ یہ انسان کے جسم میں بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ تو وہاں پایا جاتا ہے، جسے سینہ، دل، دماغ یا قلب کہا جاتا ہے۔ یہی انسان کی شخصیت کا مرکز ہے۔ جہاں سے وہ ارادہ کرتا ہے کہ مجھے اب یہ کام کرنا ہے۔ اسی پر اس کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔ اسے اختیار حاصل ہے چاہے تو نیکی کا ارادہ کرے اور چاہے تو برائی کا۔ اس کے علاوہ جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں سے کسی کو ارادے پر اختیار نہیں ہے۔ فرشتوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے، یہ آسمان و زمین، چاند، ستارے، ہوا، بادل، سمندر، کسی کو بھی اپنے ارادے پر اختیار نہیں ہے۔ صرف انسان کو اپنے ارادے پر اختیار ہے۔ گویا اس کا جو منبع (source) ہے وہ تو اس کا ارادہ اور اس کا خیال ہے کہ مجھے کام کرنا ہے۔ اگر وہ ارادہ نہ باندھے، خیال نہ کرے تو کام نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر کہیں سب سے پہلے خرابی ہوگی تو یہیں سے ہوگی۔ وہاں جو خیال آدمی کے ذہن میں آئے یا

کوئی ڈالے یا پیدا ہو، اس سے وہ برائی کے راستے پر جائے گا یا نیکی کے راستے سے ہٹے گا، وہ خیال یا ارادہ وسوسہ ہے۔

وسواس کے معنی وسوسہ ڈالنے والے کے نہیں بلکہ اس کے معنی وسوسہ بھی ہیں اور اگر اس کو وسواس کہیں تو اس کے معنی وسوسہ ڈالنا بھی ہے۔ یہاں ایسا اسم استعمال ہوا ہے، جس طرح آپ کہتے ہیں کہ وہ آدمی سراپا رحم ہے، سراپا انصاف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا انصاف پسند ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ انصاف ہے، وہ سراپا رحم ہے، رحم کرنے والا ہے۔ یہ وسوسہ ڈالنے والا بھی اتنا شدید وسوسہ ڈالنے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اس کا اسم استعمال کیا ہے۔ وسوسہ اسی سے نکلا ہے۔ وہ سراپا وسوسہ ہے۔ اس کے اندر بار بار وسوسہ ڈالنے کا مفہوم بھی ہے، جیسے زلزلہ وغیرہ۔ عربی زبان اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں، جیسے وسوسہ، زلزلہ وغیرہ اس میں کسی چیز کو بار بار کرنے کے معنی بھی آتے ہیں، جیسے زلزلہ یعنی بار بار ہلانا، وسوسہ یعنی بار بار وسوسہ ڈالنا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اگر ذمہ دار ٹھہرایا ہے تو وہ اس کے ارادے کی وجہ سے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ جہاں وہ مجبور ہو جائے، اس پر اس کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اگر مجبوری کے عالم میں اس کو کفر کا کلمہ بھی کہنا پڑے اور دل مطمئن ہو تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ کوئی ظالم و جابر بادشاہ سر پر بیٹھ کے کوئی گناہ کرا لے، اس پر بھی مواخذہ نہیں ہے۔ کوئی کام بھی جو خارج سے کوئی قوت مجبور کر دے یا کوئی نظام مجبور کر دے اور کوئی راستا اس سے بچنے کا نہ ہو، اس پر اللہ کے ہاں کوئی مواخذہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں مواخذہ اس چیز پر ہے جو انسان اپنے ارادے سے کرتا ہے۔ اس لیے کہ جو مرکز ہے وہ تو ارادہ ہی ہے اور اس کے اندر وسوسہ ڈال کر آدمی کو نیکی کے راستے سے ہٹا کر برائی کے راستے پر ڈالا جاتا ہے۔ باہر سے کوئی اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا کہ اس سے برائی کروا سکے۔

شیطان جو کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس کا مشن یہ ہے کہ وہ انسان کو سیدھے راستے سے ہٹائے۔ وہ اس پر ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حملے کرتا ہے۔ لیکن اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اسے مجبور کر دے یا باہر سے کوئی قوت اس کے ساتھ ایسی ہو، جس سے وہ انسان کو برائی کے راستے پر زبردستی ڈال دے، ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ برائی کے راستے پر

ڈالنے کی قوت استعمال کرے تو یہ انصاف نہیں ہوگا، تب تو انسان مجبور محض ہوگا۔ اس میں اس کا اپنا کوئی ذاتی کردار نہ ہوگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اس کا مواخذہ نہیں کرے گا۔

شیطان کا جتنا بھی زور ہے وہ وسوسے کی حد تک ہی ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے اس موقعے پر بھی کہی تھی، جب اس کی تخلیق ہوئی تھی۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (الاعراف:۲۰)

''پھر شیطان نے ان کو بہکایا۔''

جب اللہ نے آدمؑ کو آزمائش کے لیے اس کی فطرت کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے کے لیے دنیا کی زندگی میں اطاعت کے، جس راستے سے اسے گزرنا ہے، اس میں جو خطرات پیش آئیں گے ان سے کس طرح نپٹے گا، جو جنت کا راستا ہے، اس پوری راہ کو ایک دفعہ دکھانے کے لیے اس کو حکم دیا تو شیطان نے اس کو بہکایا اور پھسلایا۔ قرآن نے اس کے لیے وسوسے کا لفظ استعمال کیا ہے: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (الاعراف:۲۰) شیطان نے ان کو وسوسے میں ڈالا، دل میں خیال ڈالا، اوران کو بتایا کہ تم یہ کرلو تو یہ تمھارے لیے اچھا ہے۔ اس نے برائی کو بھلے انداز میں پیش کیا کہ اگر تم اللہ کی نافرمانی کروگے تو ہمیشہ زندہ رہوگے۔ تمھیں ایسی بادشاہت نصیب ہوگی، جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ خود آدم علیہ السلام اس کے وسوسے میں آگئے اور اس لیے آگئے کہ وہ بھول گئے۔ یہ اس کا اختیار ہے کہ وہ وسوسہ ڈالے، خیالات پیدا کرے، دوسرے انسانوں کے ذریعے پیدا کرے، اپنے ذریعے پیدا کرے یا آدمی کا اپنا نفس وسوسہ ڈالے۔

انسان کے ایمان، صراطِ مستقیم اور دین کی، جو آزمائش ہے یا جس بات کا خطرہ یا اندیشہ ہے، وہ شیطان کا وسوسہ ڈالنے کا یہی اختیار ہے۔ جب شیطان نے یہ کہا:

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ (الاعراف:۱۶،۱۷)

''بولا: ''اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گم راہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں کہا:

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۚ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۶۳-۶۵)

''اچھا تو جا! ان میں جو بھی تیری پیروی کریں، تجھ سمیت ان سب کے لیے جہنم ہی بھرپور جزا ہے۔ تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے، سوار اور پیادے چڑھا، مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا، اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا، اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے۔''

یہاں بصوتک کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ آواز تو بڑی استعمال ہوتی ہے لیکن یہاں وہ آواز مراد ہے، جو دل میں پیدا ہو جائے اور آدمی سن لے کہ یہ کرنا ہے، جیسے یہ خیال کہ یہ مال مار لو، یہ برائی کرلو، اس کا حق مار لو، جھوٹ بولو وغیرہ۔ یہ ساری خاموش آوازیں دل کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں صوت کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ شیطان کے تمام ترحربوں کے باوجود جو مجھ پر بھروسا کریں گے، ان پر شیطان کا بس نہیں چلے گا۔ ان کو بھروسے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کو بہت ساری جگہوں پر واضح کیا ہے کہ انسان صرف اپنے ارادے کے لیے جواب دہ ہے اور اس کے لیے وہ کسی پر الزام نہیں رکھ سکتا۔ چناں چہ قرآن پاک نے جہنمی لوگوں کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔ ان لوگوں کا جو سیاست، معیشت، کاروبار، گھربار وغیرہ میں دوسروں کے تابع ہیں، وہ کہیں گے کہ ہم تو ان کی وجہ سے مجبور تھے، ان لوگوں کو سزا دیں۔ اللہ فرمائے گا: نہیں، تم بھی اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو۔ تم کو بھی سزا ملے گی اور ان کو بھی ملے گی الا یہ کہ آدمی مجبوری ثابت کردے۔ بادشاہوں سے، سرداروں سے آگے چلنے والے لیڈروں سے، سب سے یہ مکالمے قرآن پاک نے چار پانچ جگہوں پر نقل کیے ہیں کہ آدمی اپنے افعال کا خود ذمے دار ہے۔

اسی طرح شیطان کے بارے میں بھی کہا ہے:

وَ قَالَ الشَّیۡطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الۡاَمۡرُ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمۡ وَعۡدَ الۡحَقِّ وَ وَعَدۡتُّکُمۡ فَاَخۡلَفۡتُکُمۡ ؕ وَ مَا کَانَ لِیَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُکُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ ۚ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ وَ لُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِکُمۡ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُصۡرِخِیَّ ؕ اِنِّیۡ کَفَرۡتُ بِمَاۤ اَشۡرَکۡتُمُوۡنِ مِنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ○ (ابراہیم:۲۲)

''اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے، جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو ہی ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمھاری فریادرسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا، میں اس سے بری الذمہ ہوں، ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے۔''

قرآن مجید نے جگہ جگہ کھول کھول کر اس بات کو واضح کیا ہے کہ آدمی یہ کہہ کر خدا کے ہاں نہیں چھوٹ سکتا کہ لوگ ایسے تھے، نظام ایسا تھا، ماحول ایسا تھا، مجبوری ایسی تھی، کام نہیں چلتا تھا، یہ سارے بہانے ہیں۔ ہر آدمی اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے۔ اگر واقعی مجبور ہے تو اپنی مجبوری اللہ کے سامنے ثابت کرے کہ یہ میری مجبوری تھی اور واقعی مجبوری ہوگی تو وہ عذر قبول فرمائے گا لیکن دوسروں کے بہکانے کا عذر قبول نہیں فرمائے گا۔

وسواس سے مراد دراصل دل کے اندر بہت زیادہ وسوسے ڈالنے والا ہے۔ وسوسے طرح طرح کے ہوتے ہیں، جو شیطان ڈالتا ہے، اور وسوسے کا پہچاننا مرض کا پہچاننا ہے اور اس سے نپٹنے میں اسی وقت آسانی ہوتی ہے جب پہچان لیا جائے کہ اصل سرچشمہ کہاں ہے۔ برائی کا کوئی سرچشمہ باہر سے نہیں ہوتا۔ ہم ڈش کو الزام دیتے ہیں، ٹی وی کو الزام دیتے ہیں، اخبارات کو الزام دیتے ہیں کہ یہ برائی کے سرچشمے ہیں۔ نہیں، برائی کا سرچشمہ ہمارے اندر ہے۔ اگر آدمی اس پر کنٹرول کرلے اور قابو پالے تو پھر آدمی نیکی کے راستے پر چل سکتا ہے اور اگر نہ کرے تو برائی

کا شکار ہو سکتا ہے۔

انسان پر سب فتنے ہی حملہ آور ہوتے ہیں لیکن چند وسوسے نمایاں ہیں۔ عقائد کے حوالے سے وسوسے آتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ آخر اللہ کو ہماری عبادت کی کیا ضرورت ہے؟ اگر نماز پڑھیں گے تو اللہ کو کیا ملے گا؟ یا اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ہم تم مجبور ہیں۔ اللہ نے سب کچھ لکھ دیا ہے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں۔ چوں کہ اس نے لکھ دیا ہے اس لیے ہم یہ کام کر رہے ہیں۔

یہ وسوسے عقائد کے باب میں آتے ہیں۔ اس کے بعد پھر دنیا کے برتنے کے باب میں آتے ہیں۔ ان کی طرف سے بھی آتے ہیں، جو طاقت ور ہوتے ہیں، جن کے پاس اختیار ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جو کرنا ہے کرلو، جیسے بااختیار ماں باپ کہتے ہیں کہ جنت دوزخ ہم دیکھ لیں گے، عذاب سے ہم نمٹ لیں گے۔ بس جو ہم کہہ رہے ہیں وہ کرلو۔ یہ بھی ایک فلسفہ ہے۔ اسی طریقے سے، جو احسان جتاتے ہیں کہ کیا ہم نے تم پر یہ احسان نہیں کیا ہے؟ اب اس کا بدلہ تم دو۔ یہ بھی وسوسے کی ایک صورت ہے۔ اسی طریقے سے غصہ ہے۔ شیطان کہتا ہے کہ اگر تم نے اس وقت بدلہ نہ لیا تو عزت نہیں رہے گی۔ پھر آدمی غصے میں آکر بدلہ لیتا ہے۔ بدلہ لینے کے بعد ایک کے بعد پھر دوسرا قتل ہوتا ہے، ایک جھگڑا ہوتا ہے پھر دوسرا جھگڑا ہوتا ہے۔ یوں عداوت اور دشمنی کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان شیطان خیال ڈال دیتا ہے کہ خاوند میری تذلیل کرنا چاہتا ہے، باہر گیا ہے ضرور کسی عورت کے پاس گیا ہوگا۔ پھر جھگڑا بڑھتا ہے، خرابی پیدا ہوتی ہے، مرد کے اندر آگ بھر جاتی ہے کہ میں کیوں جھکوں وہ کیوں نہ جھکے اور جھگڑا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان سب وسوسوں کے پیچھے اصل بات یہی ہے کہ دل کے اندر ایک بات یا ایک ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اس کو دل سے نکال دیا جائے وہیں اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

قابو پانے کی ظاہری تدبیریں بھی ہیں اور روحانی بھی۔ احادیث میں آتا ہے کہ غصہ آئے تو آدمی وضو کرلے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ یہ ظاہری تدابیر ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں حضوؐر نے بتائی ہیں، جن سے آدمی فوری طور پر خرابی پر قابو پا سکتا ہے۔ کسی غلط کام یا جنسی بے راہ روی کا خیال آئے تو فرمایا کہ اپنی بیوی کا خیال کرے۔ یہ حدیث کا مفہوم ہے۔ گویا جب بھی کوئی غلط بات دل میں آئے تو فوراً توجہ اس سے ہٹا کر کسی

اچھی چیز کی طرف کرلے۔ لیکن اصل نسخہ اس سورۃ کے اندر بیان کیا گیا ہے اور ہمارے حوالے کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ وہ خناس ہے۔ خَنَسَ کے معنی ہیں کہ کوئی چیز آگے بڑھے اور پیچھے جاکر چھپ جائے، بدک جائے اور بھاگ کھڑی ہو۔ اس سے بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بڑا قوی دشمن ہے۔ ہر طرف سے چھایا ہوا ہے اور اس سے بچنا بڑا مشکل ہے لیکن قرآن نے کہا ہے کہ شیطان بڑا ضعیف اور بڑا کمزور ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسی قوت نہیں ہے، جس کا انسان مقابلہ نہ کرسکے۔ اس لیے کہ اگر انسان مقابلے پر آجائے تو مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتا وہ فوراً بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

خنّاس میں ایک پہلو تو یہ آیا ہے کہ یہ کش مکش ایک مسلسل کش مکش ہے۔ یہ آخری سانس تک جاری رہے گی۔ کوئی آدمی یہ سمجھے کہ زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ آئے گا کہ ہم شیطان کو فتح کرلیں گے اور کمر کھول کر آرام کریں گے کہ اب تو ہم نیک رہیں گے تو ایسا کوئی لمحہ زندگی میں نہیں آئے گا۔ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اور پھر چھپ جاتا ہے۔ پھر موقع پاتا ہے اور پھر وسوسہ ڈالتا ہے۔ پھر کہیں موقع ملتا ہے تو پھر خیال دل میں ڈالتا ہے اور اس کام میں عمر بھر لگا رہتا ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ جب آدمی اس سے فارغ ہوجائے۔ یہ لڑائی جو شیطان کے ساتھ ہے کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے یہاں تک کہ انسان کو موت آجائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیطان مخفی دشمن ہے۔ دشمن اگر سامنے ہو تو اس سے لڑنا آسان ہوتا ہے، لیکن جو دشمن چھپا ہوا ہو، گھات میں بیٹھا ہو اور کر رہا ہو وہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس سے مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ درحقیقت یہ آدمی کا احساس ہوتا ہے کہ بڑا نازک خطرہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ کمزور ہے۔ شیطان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ جب بھی اللہ کا خیال آتا ہے وہ فوراً میدان سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اس لیے اس سورۃ میں اللہ کی یاد میں پناہ لینے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر ہے کہ انسان کے پورے دل پر شیطان چھایا ہوا ہے لیکن جیسے ہی انسان اللہ کو یاد کرتا ہے تو اس سے بچ جاتا ہے۔

شیطان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ شیطان، جس نے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ معرکہ کیا اور دوسرے اس کی ذریت یا چیلے چپاٹے ہیں۔ ہمارے جمہور کا یہی عقیدہ ہے کہ وہ

شیطان اب تک موجود ہے لیکن بعض علما کی یہ بھی رائے ہے کہ یہ وہ شیطان نہیں ہے بلکہ اس کی اولاد ہے، تاہم یہ بے کار کی بحث ہے۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ وہی شیطان ہے یا اس کی اولاد ہے لیکن خطرہ تو بہر حال موجود ہے۔ اصل چیز تو خطرہ ہے اور اس سے نپٹنا ہے۔ شیطان اور اس کی اولاد اور انسان کا اپنا نفس، اس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ شیطان انسان کے ساتھ اس طرح چلتا ہے، جس طرح رگوں کے اندر خون دوڑتا ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ "حضورؐ ایک دفعہ اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت صفیہ بنت حیؓ آپؐ سے بات کرنے آئیں۔ باتیں کرتے ہوئے انھیں کچھ دیر ہو گئی۔ چناں چہ آپؐ ان کو دروازے تک چھوڑنے کے لیے باہر نکلے۔ جب آپؐ دروازے تک پہنچے تو دو انصاری صحابی گزرے اور آپ ﷺ کو دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھنے لگے۔ آپ ﷺ نے ان کو روکا کہ ٹھہرو "یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہیں۔" انھوں نے کہا: سبحان اللہ! ہم آپ ﷺ پر شک کرتے کہ آپؐ کے پاس کوئی عورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لیکن شیطان تو انسان کے ساتھ اس طرح دوڑ رہا ہے، جیسے اس کی رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

آپؐ نے وضاحت اس لیے فرمائی کہ کہیں شیطان دل میں کوئی برا خیال نہ ڈال دے۔ کتنی ہی ایسی چیزوں پر آدمی کا گمان ہوتا ہے کہ پتا نہیں یہ بات کیوں کہی گئی، کسی نے یہ کیوں کہا، یا اس نے میری طرف اس طرح کیوں دیکھا وغیرہ۔ اس طرح کے خیالات آدمی بے کار میں پالتا ہے۔ اس پر اپنا بھی خون جلاتا ہے اور دشمنی اور جھگڑے بھی مول لیتا ہے۔ اس طریقے سے شیطان نفس کے ساتھ لگا ہوا ہے لیکن وہ کمزور بھی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا کہ جہاں اللہ کی یاد آتی ہے وہ دبک جاتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ پھر دبکنے کے ایک معنی اور بھی ہیں کہ وہ برائی کا خیال ڈالتے وقت بڑا آگے آگے رہتا ہے اور جب آدمی برائی میں پڑ جاتا ہے اور اس کا خمیازہ دنیا میں بھگتتا ہے تو پھر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ مدد نہیں کرتا بلکہ انتقام کی آگ کو بھڑکاتا ہے کہ دیکھو اگر تم نے انتقام نہ لیا تو سب لوگ کیا کہیں گے کہ اس کا خاندان اور یہ بزدل نکلا۔ جب جوش میں آکر آدمی قتل کر دیتا ہے اور پولیس کا سامنا کرتا ہے، جیل جاتا ہے، پھانسی چڑھ جاتا ہے اور نسل در نسل دشمنی کا سلسلہ چل نکلتا ہے تو وہاں شیطان مدد کرنے نہیں آتا کہ اسے چھڑا دے اور مدد کرے۔ یہی اللہ تعالیٰ نے بار بار بیان فرمایا ہے کہ شیطان انسان سے کہتا ہے کہ "

کر'' پھر انسان کفر کرتا ہے تو کہتا ہے:

وَاَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ۝ (ہود:۳۵)

''اور جو جرم تم کر رہے ہو اس کی ذمے داری سے میں بری ہوں۔''

جس طرح پہلے بیان کیا گیا ہے کہ وہ آخرت میں بھی اسی طرح کرے گا، اور کہے گا کہ مجھے الزام مت دو، مجھے ملامت نہ کرو۔ یہ سب تمھارے اپنے اعمال ہیں۔ انھی کو دوش دو۔

خنّاس سے جہاں شیطان کی قوت ظاہر ہوتی ہے، اس کے ساتھ جنگ کا مسلسل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں اس کی کمزوری بھی ظاہر ہوتی ہے۔ انسان کے پاس ایک ہتھیار ایسا ہے کہ اگر وہ اس کو سنبھال لے تو شیطان بھاگ کھڑا ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰۤئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ۝ (الاعراف:۲۰۱)

''جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی قرآن مجید میں اتنی شدید تاکید کی گئی ہے کہ کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو۔ اگر وہ کثرت سے وسوسے ڈالتا ہے، صبح و شام پیچھے لگا ہوا ہے تو تم بھی اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، صبح و شام کرو۔ غرض کہ ہر حال میں کرو۔ اہل ایمان کے بارے میں فرمایا ہے:

اَلَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ وَ يَتَفَكَّرُوۡنَ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ۚ (آل عمران:۱۹۱)

''جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت پر غور کرتے ہیں۔''

بنیادی طور پر یہی وہ ہتھیار ہے، جس سے آدمی شیطان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

کچھ تدبیریں تو ایسی ہیں، جو آدمی باہر سے اختیار کرتا ہے۔ لیکن اصل تدبیر یہی ہے

کہ دل میں، جو خیال ہوتا ہے اس کو جو چیز مضبوط کرتی ہے، یا قوی کرتی ہے وہ دراصل انسان کی توجہ ہے، جس چیز کی طرف توجہ رہے وہ چیز سامنے رہتی ہے۔ خیال توجہ سے ہی موجود رہتا ہے۔ اگر توجہ ہٹ جائے یا توجہ کسی اور چیز کی طرف چلی جائے تو فوراً خیال بھی ہٹ جائے گا۔ اگر کوئی شخص برا کام کر رہا ہو اور معاً اسے نیکی کا خیال آ جائے تو برائی سے توجہ ہٹ جائے گی۔ ہر چیز کی ایک غذا ہوتی ہے اور وسوسے کی غذا توجہ ہے۔ جتنی اس پر توجہ دی جائے، جتنا اس کے بارے میں سوچا جائے، جتنا اس کا خیال کیا جائے، اتنا ہی یہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے وسوسے کو دور کرنے کی یہ تدبیر کہ آدمی بار بار سوچے کہ برا خیال کیوں آ رہا ہے، اس کو ہٹاؤ، درست نہیں ہے۔ اس طرح وسوسہ دور نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جتنا اس کے بارے میں سوچا جائے گا اتنا ہی وہ قوی ہوگا، جہاں سوچنا چھوڑ دیں وہیں غائب ہو جائے گا۔ اسی لیے قرآن مجید نے بھی یہی نسخہ بتایا ہے اور ہمارے اکابر اور بزرگ بھی یہی نسخہ بتاتے ہیں کہ اگر کبھی کسی وسوسے یا برے خیال کا شکار ہو تو فوراً کسی دوسری چیز کی طرف توجہ لگا دو، وسوسہ دور ہو جائے گا۔ جس طرح کہ غصے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وضو کر لو، اس کے بعد بیٹھ جاؤ یا لیٹ جاؤ۔ اس طرح اس چیز سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔

اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔ اللہ کی یاد آئے گی تو شیطان بھاگ کھڑا ہوگا، وسوسہ ختم ہو جائے گا اور توجہ ہٹ جائے گی۔ چوں کہ وسوسے بار بار آتے ہیں اور شیطان جسم میں خون کی طرح گردش کر رہا ہے، کسی موقعے کو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اس لیے بار بار اللہ کے ذکر کی ضرورت پڑے گی۔ اس لیے بار بار ذکر کرنا چاہیے۔ صبح و شام ضرورت پڑے تو صبح شام ذکر کرنا چاہیے۔ اگر وہ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے وار کرے گا تو اٹھتے، لیٹتے اللہ کو یاد کرنا ہوگا۔ اسی۔ لیے فرمایا کہ رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران:۱۹۱)

”وہ اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔“

اَلَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ (الناس:۵،۶)

”جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔“

انسان کے دل میں جو وسوسے ڈالتے ہیں وہ جن بھی ہیں اور انسان بھی، باہر کے دشمن

بھی ہیں اور شیطان بھی یہ کام کرتا ہے۔ یہی ایک فتنہ ہے، جو ایمان کے لیے سب سے بڑھ کر ہے۔ باقی سب آزمائشیں آدمی جھیل سکتا ہے، مخالفتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے، دولت کا مقابلہ کرسکتا ہے، دنیا کا مقابلہ کرسکتا ہے، غرض دنیا کا کوئی فتنہ نہیں، جس کا انسان مقابلہ نہ کرسکتا ہو۔ یہ دنیا بھی فتنہ نہیں ہے۔ دراصل جب آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ یہ دنیا اچھی ہے، مجھے محبوب ہے، یہی خیال دنیا کو فتنہ بنا دیتا ہے، ورنہ یہ دنیا فتنہ نہیں ہے۔ دنیا تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے۔ شیطان نے بھی یہی کہا تھا:

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (الحجر: ۳۹، ۴۰)

''وہ بولا'' میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اس طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے، جنھیں تو نے ان میں سے خالص کرلیا ہو۔''

گویا دنیا فتنہ نہیں ہے۔ کوئی چیز بھی ایمان کے لیے آزمائش نہیں ہے سوائے اپنے اندر کے وسوسے کے۔ اس لیے اس آخری سورۃ میں، جو قرآن مجید کے اختتام پر آئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی ایک خطرے سے بچنے کے لیے اس دعا کی تعلیم دی ہے اور چھے آیات کا یہ نسخہ ہمارے حوالے کیا ہے۔

اگر ہم اس سورۃ کے ابتدائی حصے کی طرف جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی تین صفات بیان کی ہیں: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ ''میں پناہ میں آیا ہوں اس کی، جو انسانوں کا رب ہے، اس کی، جو انسانوں کا بادشاہ ہے، اس کی، جو انسانوں کا معبود ہے۔'' ان صفات کو بیان کرنے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ جامع صفات ہیں۔ ان میں سب صفات جمع ہوگئی ہیں۔ رب کے معنی ہیں، جو پالتا ہے، پرورش کرتا ہے، رحمت کا برتاؤ کرتا ہے، ہر چیز فراہم کرتا ہے اور تربیت کرتا ہے۔ ایک خلیے سے انسان کی ابتدا کر کے اس کو بڑھا کر جسم بنا دیتا ہے۔ جسم کے اندر جان ڈالتا ہے پھر بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک مختلف مراحل سے گزارتا ہے۔ وہ اس کو دیکھنے اور سننے کی قوت عطا کرتا ہے۔ وہ رب ہے، جو ساری قوتوں کا مالک ہے اور وہ جو ہر طریقے سے ہر چیز فراہم کرتا ہے۔ ہر فتنے سے حفاظت کرتا ہے، ہر مرض

سے حفاظت کرتا ہے۔ وہ خلیہ، جو ماں کے پیٹ میں جا کر بچہ بنتا ہے وہ تباہ نہیں ہو جاتا بلکہ بہت سے خلیوں میں سے صرف ایک کو منتخب کرتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نے اسے پہلے ہی حفاظت میں لے لیا ہے۔ اس کے بعد وہ پورے نو مہینے اس کی پرورش کرتا ہے، اور پھر پیدائش کے بعد انسانی زندگی کے مختلف مراحل سے گزار کر پرورش کرتا ہے۔ اگر آدمی اسی کی پناہ میں آجائے تو پھر روح، اخلاق، دین اور ایمان کے لیے جو فتنے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کون ہے جو حفاظت کر سکتا ہے۔

رب، یعنی پرورش کرنے والے تو بہت ہو سکتے ہیں۔ آیا ان کا حکم بھی چلتا ہے یا نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ مَلِكِ النَّاسِ وہ انسانوں کا بادشاہ بھی ہے اور ایسا بادشاہ کہ کائنات کے اندر، جو وہ چاہتا ہے ہوتا ہے، اور اس کو اپنی مرضی پوری کرنے کے لیے کسی کی محتاجی نہیں۔ ہر انسان کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے کسی نہ کسی کی محتاجی ہوتی ہے لیکن اللہ کو کسی کی محتاجی نہیں ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (یٰسٓ: ۴۰)

”وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔“

اس کا تو پورا امر اور حکم اس نظام پر قائم ہے کہ وہ ارادہ کرتا ہے تو چیز ہو جاتی ہے اور اسے کچھ نہیں کرنا ہوتا۔ حضورؐ نے دعا کی تعلیم فرمائی کہ ”جو وہ چاہے گا ہو جائے گا اور جو وہ نہیں چاہے گا نہیں ہوگا۔“ اسی لیے فرمایا:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ

(الکہف: ۲۳)

”یہ مت کہو کہ کل میں یہ کام کروں گا مگر یہ کہ اگر اللہ چاہے۔“

انسان کچھ نہیں کر سکتا لیکن وہ ایسا بادشاہ ہے، جو وہ چاہتا ہے ہو جاتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ اس بادشاہ سے بڑھ کر اور کون ہر لمحے، ہر وقت، ہر جگہ شیطان کے وسوسے سے بچا سکتا ہے۔

اس کے بعد تیسری صفت اِلٰهِ النَّاسِ ہے۔ الٰہ کہتے ہیں معبود کو، جس کی آدمی غلامی اختیار کرے، پرستش کرے اور پوجا کرے۔ پوجا اور پرستش کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں اپنی

شگفتگی، محبت اور شوق کا اظہار الٰہ الناس کے سامنے کرنا ہے۔ الٰہ کے معنی حاکم کے بھی ہیں لیکن اصل معنی معبود کے ہیں، جیسے ہم اردو میں بولتے ہیں والہانہ تعلق رکھنا۔ یہ والہانہ تعلق اسی الٰہ سے نکلا ہے۔ اس کے معنی ہیں دل کی گہرائیوں سے اور شوق و محبت سے اس کے ساتھ تعلق رکھنا۔ پھر اس کے اندر یہ ساری صفات بھی اپنی جگہ جمع ہیں کہ وہ رب بھی ہے، بادشاہ بھی ہے اور معبود بھی ہے۔ آدمی جس شوق سے اس کے پاس جائے گا، پیشانی ٹیکے گا، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگا، آنسو بہائے گا، اس سے ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرے گا تو اس سے بڑھ کر کون ہے، جو سہارا دے۔ اہلِ ایمان کی نمایاں صفات میں سے ایک صفت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ (البقرۃ:۱۶۵)

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تین صفات بیان کی ہیں۔ اس لیے کہ وہی اس کا اہل اور مستحق ہے، وہی اتنی قدرت رکھتا ہے کہ اس شیطان کا مقابلہ کر سکے، جو کہ چھپ کر حملے کرتا ہے، نظر نہیں آتا، وہ خیال یا وسوسہ جسے دیکھا نہیں جاسکتا اور جسے مٹھی میں پکڑا نہیں جاسکتا، جو دل میں آجاتا ہے کہ یہ کر اس خیال سے وہی بچا سکتا ہے، جس نے خلیے اور سیل سے لے کر انسان بننے تک پرورش کی، ہر چیز عطا کی اور اس کا حکم ہر چیز پر چلتا ہے۔ انسانی ذہن میں پیدا ہونے والا خیال بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ وہ خیال، جس پر دنیا کا کوئی بادشاہ، کوئی فلسفی، کوئی حکمراں، کوئی جابر، جیل کی زنجیریں، پھانسی کا تختہ، کوئی چیز بھی قابو نہیں پاسکتی، جسے دل سے نہیں نکالا جاسکتا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے کہ وہ اس کو محو کردے۔ اس لیے کہ وہ بادشاہ ہے، ملک ہے، کوئی چیز اس کی خدائی سے باہر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایک پتا بھی اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ وہ معبود حقیقی ہے۔ انسان اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی ربوبیت، اس کا حکم، اس کی محبت اس بات کی ضمانت ہے کہ انسان جب اس کی پناہ میں آجائے گا تو شیطان سے محفوظ ہو جائے گا۔ یہ کوئی تعلیم نہیں ہے بلکہ یہ ایک نسخہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنا آدمی اللہ کی ان صفات کو یاد رکھے گا، اتنا ہی وہ شیطان کے حملے سے محفوظ رہے گا۔ شیطانی حملوں کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ اگر پیسہ خرچ کر دیا تو میرے پاس مال کم ہو جائے گا:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ (البقرۃ:۲۶۸)

”شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ دینے والا تو رب ہے، اس کے خزانے میں کمی نہیں آسکتی۔ اسی طرح خوف دلاتا ہے کہ تم نے یہ کام کیا تو یہ ہو جائے گا، یا یہ نقصان پہنچ جائے گا۔ حالاں کہ مَلِکِ النَّاسِ اور لوگوں کا بادشاہ تو اللہ ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے۔ کسی کے نقصان پہنچانے سے کیا نقصان پہنچے گا، اس طریقے سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور محبت کی خاطر آدمی بہت کچھ کر گزرتا ہے۔ درحقیقت ہماری محبت کا مستحق وہ خدا ہے، جو ان صفات کا حامل ہے۔ جتنا آدمی ان تین صفات کو یاد کرے گا، ان کا استحضار کرے گا، اٹھتے، لیٹتے، ان کا ذکر کرے گا، اتنی ہی اس کے اندر وہ قوتِ ایمانی آجاتی ہے، وہ ہتھیار اُسے حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ شیطان کے حربوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو پڑھ کر آدمی ایک طرف رکھ دے۔ یہ کوئی نسخہ یا تعویذ نہیں ہے کہ اس طرح شیطان کے وسوسوں سے بچ جائے گا۔ اگر کوئی ڈاکٹر نسخہ لکھ کر دے اور مریض اس کو پڑھتا رہے تو افاقہ نہیں ہوگا جب تک کہ دوا استعمال نہیں کرے گا۔ شیطانی وسوسوں اور حربوں کا مقابلہ کرنے کی دوا اس نسخے کے اندر موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کو اپنا رب مانو، اللہ کو اپنا بادشاہ مانو، اللہ کو اپنا الٰہ مانو، اور جو کوئی وسوسہ پیدا ہو ان صفات کی طرف رجوع کرو۔ ہر وسوسے کا علاج اللہ کی کسی یاد میں ہے اور اسی کا تعلق پورے دین کے ساتھ ہے۔ اس لیے قرآن مجید کا آغاز بھی اس سے ہوا کہ سارا شکر رب العالمین کے لیے ہے۔ لیکن شیطان نے کہا تھا کہ تو اکثر لوگوں کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا۔ اگرچہ تو ان کی ربوبیت کرے گا، پرورش کرے گا، ان پر رحمتیں کرے گا، انسان کا ہاتھ تھامے گا، اسے ہدایت دے گا مگر اکثر لوگ ناشکرے ہوں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جو بندے خالص میرے لیے ہو جائیں گے، ان پر تیرا بس نہیں چلے گا۔ وہ تیرے فریب، فکر اور ہتھکنڈوں سے بچ جائیں گے اور سرخ رو ہو جائیں گے۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جو اللہ کی صفات کو یاد رکھیں گے، اس کی فرماں برداری کریں گے، اس کا حکم مانیں گے، اس کا شکر ادا کریں گے، اور اس کے ساتھ محبت کا تعلق رکھیں گے۔ اس بات کو آدمی اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، جتنا یاد رکھے گا، ہر حال میں اتنا ہی وہ شیطان کے شر سے بچے گا۔

قرآن مجید جب ترتیب دیا گیا تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سورتیں اس جگہ ہوں گی۔ صحیح احادیث میں ہے کہ جب کوئی وحی آتی تھی تو حضورؐ لکھنے والوں کو بتا دیتے تھے کہ اس کو یہاں پر لکھو۔ چناں چہ سورتوں کی ترتیب اور آیات کی ترتیب بھی آپؐ نے خود فرمائی۔ کوئی سورۃ بہت بعد میں اتری لیکن آپؐ نے پہلے لگوا دی اور کوئی پہلے اتری تو اسے بعد میں لگوا دیا۔ کوئی آیت شروع میں اتری تو اس کو آپ ﷺ آخر میں لگوا دیا۔ تمام مفسرین کی یہی رائے ہے اور مجھے یقین ہے کہ قرآن کریم شروع سے آخر تک مسلسل مربوط کتاب ہے۔ اس کا ہر حصہ دوسرے سے متعلق ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بات ادھر سے ادھر کر دی گئی ہو بلکہ سارا مضمون مسلسل چلتا ہے۔ ابتدا سورۂ فاتحہ سے ہوئی اور اس میں بھی ایک خاص تعلیم اور مصلحت ہے اور اختتام بھی اگر ان دو سورتوں پر ہوا ہے کہ یہ وہ آخری چیزیں ہیں، جن کی آدمی کو ضرورت ہے، جب کہ اسے صراطِ مستقیم معلوم ہو چکا ہو اور وہ اس راہ پر چل رہا ہو۔ اس طرح اللہ نے اپنی نعمتِ ہدایت دے کر اتمام نعمت کر دیا اور اسلام بطور دین عطا کر دیا اور ایمان کی نعمت سے نواز دیا ہے۔ چوں کہ یہ سب سے قیمتی راستہ ہے اور شیطان گھات میں بیٹھا ہے کہ وہ آگے سے آئے گا، پیچھے سے آئے گا، دائیں سے آئے گا، بائیں سے آئے گا، دل میں وسوسہ ڈالے گا، لہٰذا اس کی حفاظت بھی ضروری ہے اور معوذتین کے ذریعے اس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ:۳)

”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔“

حفاظت بھی وہی کرے گا یہ اس کا وعدہ ہے، اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر وعدہ پورا کرنے والا ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے ہم اس کی پناہ میں آجائیں، اس کی صفات کو یاد رکھیں، کوئی وسوسہ آئے جھٹک دیں اور اللہ کو یاد کریں اور اس کی راہ میں استقامت دکھائیں اور ڈٹے رہیں۔ بلاشبہ اس نے معوذتین کی صورت میں حفاظت کا بہترین نسخہ عطا فرمایا ہے۔ اس طرح قرآن کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے جہاں سورۂ فاتحہ کے ذریعے ہدایت اور صراطِ مستقیم دکھائی وہیں اختتام قرآن پر سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے ذریعے اس راہ پر چلانے کے بعد حفاظت فرمانے کا

وعدہ بھی پورا کر دیا۔

شیطان دماغ میں خیال ڈالے گا، انسانوں کی صورت میں آئے گا، شیطانوں کی صورت میں آئے گا، اپنے خیالات کی صورت میں آئے گا اور لوگوں کو گم راہ کرے گا۔ یہی اس کا اختیار ہے۔ یہ اللہ نے واضح کر دیا ہے کہ وسوسہ اور دل میں خیال ڈالنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا اس راہ پر چلنے والے کی حفاظت کا سامان بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ استقامت کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چل سکے۔ سورۂ فلق اور سورۂ ناس کی صورت میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اللہ کی بندگی، فریضہ اقامت دین اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے ہم کتنے بہانے ڈھونڈتے ہیں، ماحول کی ناسازگاری کے بہانے، جبر اور ظلم کے بہانے کے لیے ان میں سے کوئی بہانہ بھی صحیح بہانہ نہیں ہے۔ اصل چیز تو وسوسہ ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں یہ بات آئی تھی کہ اگر واقعی آدمی مجبور ہو جائے، سلاخوں میں باندھ کر اس سے کوئی کام کروایا جائے، یا سر پر تلوار رکھ کر کوئی کام کروایا جائے، اس پر اللہ تعالیٰ کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔ آدمی، جو کام اپنی آزاد مرضی اور ارادے سے کرے گا اسی پر وہ پکڑ کرے گا۔ اچھے کام کرے گا، تو جنت میں بھیجے گا اور اگر برے کام کرے گا تو جہنم میں ڈال دے گا۔ درحقیقت کام نہ کرنے کے یہ مختلف عذر اور بہانے ہیں بلکہ اس پر کنٹرول کی ضرورت ہے اور وہ اللہ کی یاد سے اور اس کی صفات کی یاد سے ہی ممکن ہے۔

دراصل انسان کو دو ہی خوف لاحق ہوتے ہیں: ایک جان کا خوف اور دوسرا مال کا خوف۔ زندگی کا کوئی بھی مسئلہ ہو یا راہِ حق پر استقامت کی بات ہو، انسان انھی دو حوالوں سے آزمایا جاتا ہے، جو یہ دو خوف اپنے ذہن سے جھٹک دیتا ہے وہی کوئی کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ خواہ یہ روزمرہ زندگی کا کوئی مسئلہ ہو یا صراطِ مستقیم پر شیطانی وسوسوں کا مسئلہ ہو، یا پھر فریضہ اقامت دین اور شہادتِ حق کی ادائی کی راہ میں استقامت کا مسئلہ، جس نے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِکِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ کہا، دراصل اس نے اپنی پوری زندگی اللہ کے حوالے کر دی۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا، کوئی لالچ گمراہ نہیں کر سکتا، کوئی خوف اس کی

راہ میں آڑے نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ مَلِكِ النَّاسِ تو وہ ہے، تو پھر خوف کس بات کا۔ نفع اور نقصان تو اس کے ہاتھ میں ہے تو اب مال کے چھن جانے کا ڈر کیسا، یا لالچ اور ترغیب کس لیے۔ جب رب العالمین وہ ہے، اِلٰهِ النَّاسِ وہ ہے، مالک، معبود اور محبت کے لائق وہ ہے تو پھر کسی وسوسے اور شیطانی حربے کی کیا حقیقت ہے کہ سیدھی راہ سے ہٹا سکے، رب کی نافرمانی کروا سکے، جنت کی راہ سے ہٹا کر منزل کھوٹی کر سکے۔ راہ بھی اسی نے دکھائی ہے، راستے پر بھی وہی چلائے گا۔

🙞🙜